دیدم
عاصمہ رحمان
دیدم
عاصمہ رحمان

ناول

عاصمہ رحمان

Writer's email address: aasmarehman20@gmail.com

دیدَم

بہر سو جلوہ دلدار دیدم
(میں نے ہر طرف محبوب کا جلوہ دیکھا)
بہر چیزے جمالِ یار دیدم
(میں نے ہر چیز میں محبوب کی جلوہ نمائی دیکھی)
نماز زاہدان محراب و منبر
(زاہدوں کی نماز محراب و منبر پر ہوتی ہے)
نماز عاشقان بہ دار دیدم
(عاشقوں کی نماز تختہ دار پر دیکھی)

(حافظ شیرازی)

جی جوسی انٹرنیشنل ائیرپورٹ کے ٹرمنل پر وہ اپنا ٹرالی بیگ گھسیٹتے ہوئے بھاگی جا رہی تھی۔

دوسرے ہاتھ میں ٹکٹس اور پاسپورٹ تھے، بازو پر سوئیٹر جھول رہا تھا اور وسط سائز کا بیگ پیک اُس کی کمر پر بھاگنے کے سبب دھپ دھپ لگ رہا تھا۔ یانگ منی بھی اُس کے ساتھ ہی بھاگ رہی تھی البتہ اُس کے ہاتھ خالی تھے۔

''تم نے فلائٹ میں کچھ کھانا نہیں ہے یانگ شی، سن رہی ہو۔ میں نے تمہاری دوا رکھی ہے۔ وہ لے لینا۔ اس سے تمہیں air sickness نہیں ہوگی پھر۔''

ائیر پورٹ اس وقت بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کے چلتے قدم، مشینی آوازیں، دبی سرگوشیاں، بیگوں کے گھسیٹے جانے کی چرک چرک.....

''میں نے جو چیزیں تمہیں دی ہیں، کم چی خصوصاً، اُس کا خیال رکھنا، وہ باسی ہو جاتی ہے۔ پہنچتے ہی تم نے اُسے فرج میں رکھنا ہے۔ اور وہ جو تم نے ہاٹ پاٹ کے مسالے اور ساسز رکھیں ہیں..... یانگ شی آہستہ بھاگو..... میں کیا کہہ رہی ہوں..... تمہیں ذرا اپنی فکر ہے؟''

یانگ شی دھیان نہیں دے رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''اپنی دوا وقت سے لینا تم..... میں نے سب پہ نام لکھ دیا ہے۔ جو جو جس کو دینا ہے دھیان سے دینا..... پاکستانی کھانا زیادہ مت کھانا اور اگر کبھی..... یانگ شی تم سُن رہی ہو؟''

کہتے کہتے یانگ منی قدرے غصے سے چلائی۔

یکدم لمبی دبلی سی یانگ شی رُکی اور تلملا کر مڑی۔ چند قدم پر یانگ منی گھٹنے پکڑے ہانپتے ہوئے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''میری فلائٹ کا اعلان ہو چکا ہے ای مو (پھوپھو) آپ کیا چاہتی ہیں آپ کی اچار چٹنیاں یہاں رہ جائیں؟''

''یانگ شی..... میں ایسا کب چاہوں گی؟'' یانگ منی نے سیدھا ہوتے ہوئے ناراضی

سے اسے دیکھا۔

''تو پھر مجھے جانے دیں۔ فلائٹ نکل جائے گی، اگلی فلائٹ تک میں انتظار نہیں کر سکتی۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔'' وہ پھولے ہوئے تنفس کے ساتھ اونچا اونچا بول رہی تھی۔ ٹرمنل میں موجود لوگ دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''مجھے معاف کر دو میری جان، مجھے بس تمہاری فکر ہو رہی ہے۔'' وہ ملامت سے کہتی اُس کے پاس آئی اور اُس کے گال تھام کر اُس کا چہرہ دیکھنے لگی جو زردی میں بھی مسلسل بھاگنے کی وجہ سے گلابی پڑ رہا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا۔ اچھے سے کھانا، دوا لیتی رہنا۔ قضا نہیں کرنی اپنی دوا۔ سمجھیں؟''

''سمجھ گئی۔ کیا اب میں جاؤں؟'' اس نے یانگ منی کے ہاتھ گالوں سے ہٹائے۔

''تم خوش ہو لیکن خوشی میں.....''

اسی اثنا دوبارہ فلائٹ کا نمبر دہرایا گیا۔

''ای مو.....تم بھی ناں.....'' یانگ شی پچکار کے کہتی بجلی کی تیزی سے پلٹی اور کچھ قدم دور انٹرنس کے گیٹ کے پاس چوکیدار کو بورڈنگ پاس دکھاتے ہوئے اندر چلی گئی۔ یانگ منی اُس کے پیچھے آئی۔

''یانگ شی.....پہنچتے ساتھ ہی مجھے فون کرنا، میں تمہارا انتظار کروں گی.....'' چوکیدار کے پاس رُکتے ہوئے وہ چلائی۔ یانگ شی اُس کی نظروں کے سامنے کسٹم کاؤنٹر پر سامان رکھ رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''میں ضرور کروں گی۔'' وہ وعدہ کرتے ہوئے بولی۔

چوں کہ فلائٹ میں لوگ چڑھ چکے تھے۔ اس لیے جلدی جلدی اُس کی بکنگ کا جائزہ لینے

کے بعد اُسے اندر جانے دیا گیا مگر جانے سے قبل وہ ایک لمحے کو رُکی اور پھر سے یانگ منی کو دیکھا۔ وہ گیٹ کے پاس کھڑی، منہ پر ہاتھ رکھے، آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اِس نے ہلکا سا جھک کر کورین انداز میں bow کیا اور اندر غائب ہوگئی۔ ☆

☆.....☆.....☆

جہاز آسمان پر، بادلوں کے اوپر، ستاروں اور چاند کی سمت میں محوِ پرواز تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عُمر بزرگ تھے، پاکستانی لگتے تھے۔ وہ منہ پر اپنی بیریٹ کیپ رکھے، ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی بیگم تھیں غالباً جو گود میں اونی گولے رکھے، لمبی سوئی سے سوئیٹر بُن رہی تھی۔ فلائٹ میں خاموشی تھی۔ ایئر ہوسٹس مسافروں کی حاجت پوری کرنے میں مگن تھیں۔

وہ بہت خوش تھی۔ پاکستان جانے کی ایکسائٹمنٹ، شاہ جہاں سے ملنے کی بے چینی اور اُن اپنوں کو دوبارہ ملنے کی پرجوش خواہش نے اِس کو بے چین کر دیا تھا جن کو وہ پندرہ سال پہلے چھوڑ آئی تھی۔ وہ حویلی، وہ علاقہ، وہ شہر، وہ راہداریاں، وہ کزنز، ماموں ممانیاں اور سب سے بڑھ کر شاہ جہاں..... کیسا ہوگا وہ..... پورے دس سال بعد اُس سے ملنے جا رہی تھی۔

جب وہ پاکستان سے کوریا آئی تھی، تب شاہ جہاں اسے مہینے کے وقفے سے فون کرتا تھا۔ خط لکھتا تھا جو یانگ منی گوگل سے ترجمہ کر کر کے پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُسے بالکل اُردو نہیں آتی تھی جب کہ یانگ شی جو دو سال پاکستان رہی تھی، اُسے اچھے سے لکھنی اور پڑھنی آتی تھی۔ وہ شاہ جہاں کا خط کبھی یانگ منی کو پڑھنے نہیں دیتی تھی مگر یانگ منی، تجسس کے مارے، خط چرا کر ترجمہ کر کے پڑھتی تھی لیکن وہ اصل مفہوم تک کبھی نہیں پہنچ پاتی تھی۔ جواباً یانگ شی ہنس ہنس کر پاگل ہو جاتی جب وہ کسی لفظ کا الٹا ترجمہ کرتی اور عرصے تک سوچتی کہ یانگ شی

کے کزن نے یہ کیا لکھا تھا اور کیوں لکھا تھا۔

پانچ سال تک یہ سلسلہ چلا اُس کے بعد شاہ جہاں نے کوئی جوابی خط نہیں لکھا۔ یانگ شی نے متواتر خط لکھے، اِسے سوشل میڈیا پر بھی ڈھونڈا، کال بھی کی مگر شاہ جہاں نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ پھر ایک عرصے بعد اِس نے اپنی کسی کزن کی فیس بک پروفائل پر شاہ جہاں کی تصویر دیکھی، وہ پاکستان میں نہیں تھا، وہ یو ایس میں تھا۔ اس نے اُس کزن کو میسیج کیا، اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کزن نے بلاک کر دیا جس کے بعد یانگ شی کا ہر رابطہ، ہر سلسلہ ختم ہو گیا۔

اب دس سال بعد وہ جا رہی تھی۔ دس سال میں کیا کیا بدلا ہوگا۔ کیا شاہ جہاں کو وہ یاد ہوگی؟ دل میں عجیب عجیب خیال آ رہے تھے۔ وہ صرف دو سال اُس حویلی میں رہی تھی، بالکل ایک مہمان کی طرح البتہ اس کو پاکستانی شہریت مل چکی تھی۔ شاہجہاں نے ہی تو دلوائی تھی۔ وہ وہاں رہ سکتی تھی لیکن وہ کوریہ آ گئی۔

اس کے کتنے کزن تھے۔ چار اِس کے ماموں تھے۔ آگے سے اُن کے اتنے بچے وہ بھی عمروں میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے۔ کیا اِن سب میں ماں کے ساتھ کوریا سے آئی، ایک پانچ سال کی لڑکی کو شاہ جہاں یاد رکھ سکا ہوگا؟

اس کا ایک دل کہہ رہا تھا کہ ہاں، اگر وہ کوریا آنے کے پانچ سال تک اُسے یاد رکھ سکا تھا تو اُسے یاد ہی ہوگا جب کہ دوسرا دل کہہ رہا تھا کہ بیچ میں دس سال بھی گزرے ہیں جہاں نہ کوئی رابطہ رہا تھا اور نہ کوئی واسطہ۔ کیا معلوم وہ بھول گیا ہو؟ لیکن وہ اُس کی اکلوتی پھوپھو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ کیسے اُسے بھول سکتے ہیں؟

وہ کھڑکی سے سر جوڑے، جہاز کے پروں کے نیچے آتے بادلوں کو دیکھ رہی تھی جس میں

سے چاند کی روشنی چھن کے گزر رہی تھی۔ دور کہیں نیچے، شاید کوئی آباد شہر تھا۔ عمارتوں کی لائٹیں، سنہری افشاں کی طرح بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

شاہ جہاں..... جس کا پورا نام وہ کبھی ادا نہیں کر پائی تھی۔ وہ اِسے ہمیشہ ''شاہ'' کہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ ایسا ہی کوئی لفظ sha کورین زبان میں تھا جس کی ادائیگی اُس کے لیے آسان تھی۔ پانچ سالہ یانگ شی کے لیے سارے کزنز کے پاکستانی نام یاد رکھنا کتنا مشکل تھا۔ اوپر سے وہ سارے کزنز، وہ سب اِس سے بڑے تھے اور جو چھوٹے تھے، وہ ماؤں کی گود میں تھے۔ وہ سب اِسے کتنا تنگ کرتے تھے۔ کتنا ٹارچر کرتے تھے۔ سب اِس کی آنکھوں کا مذاق اڑاتے، اس کے بالوں کو برا کہتے اور پھر وہ جو اگر اُردو کا لفظ بولنے کی کوشش کرتی تو سب ہنسنے لگتے۔ اُس کی ادائیگی کو بار بار دہراتے اور اُسے شرمندہ کرتے۔ کوئی کزن اُس کے ساتھ کھیلتا نہیں تھا۔ کوئی کھلونا نہیں دیتا تھا۔ لان میں لگے جھولوں پر جب وہ جھولنے کی کوشش کرتی، کوئی نہ کوئی کزن اُسے اٹھا دیتا یا پھر اپنی امیوں کو بلا لاتا جو نہ صرف اِس کو جھڑکتیں بلکہ اُردو میں پتا نہیں کیا کیا کہتی چلی جاتیں جس کی سمجھ اُسے کبھی نہیں آئی تھی۔

وہ بے حس شرارتیں، وہ اذیتیں، وہ صعوبتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ وہ پانچ سال کی تھی جب پاکستان گئی تھی۔ سات سال کی عمر تک وہ وہاں رہی تھی اُس کے بعد یانگ منی اُسے کوریا لے آئی۔ کیوں لائی؟ اس کا جواب اِسے کبھی معلوم نہ ہو سکا کیوں کہ وہ اُس دن اسکول سے آئی تھی جب لاؤنج میں یانگ منی کو روتے ہوئے دیکھا۔ یانگ منی نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے تھے۔ پہلے تو اسے دیکھ کر وہ بہت خوش اور پرجوش ہوئی، خوب چہکی، کودی مگر پھر یانگ منی کی گیلی آنکھوں کو دیکھ کر جیسے ڈب جھلکے میں آ گئی۔ اُس نے پوچھا کہ کیوں رو رہی ہو؟ جواب میں یانگ منی نے کچھ نہیں کہا بس اتنا کہا وہ رات کو کوریا جائیں گے، وہ اپنا سامان پیک

کر لے۔ وہ بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔ وہ یہیں رہنا چاہتی تھی۔ شاہ جہاں کے پاس۔ اس کے گھر۔ وہ کوریا نہیں جانا چاہتی تھی۔

اتفاقاً یا قصداً اس دن شاہ جہاں گھر نہیں تھا۔ وہ اپنے پراجیکٹ کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا۔ کم از کم اسے یہ کہا گیا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ شاہ جہاں سے بات ہو سکے۔ وہ روک سکتا تھا اسے لیکن رابطہ نہیں ہوا، یا کرایا ہی نہیں گیا۔ وہ روتی بلکتی زبردستی یانگ منی کے ساتھ کوریا آ گئی۔

یہاں اسے وہی پرانے دوست ملے۔ وہی کلاس فیلوز تھے۔ وہی محلے دار تھے۔ وہی ٹیچرز تھے لیکن اس کا دل بس ایک نام میں رچ بس گیا تھا۔ ''شاہ'' اس نام میں کچھ ایسا تھا کہ وہ کوریا آنے کے کئی دنوں تک روتی سسکتی رہی۔ اسے یاد کرتی، اس سے بات کرنی کی کوشش کرتی لیکن یانگ منی نے ایسا نہیں کرنے دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں۔ وہ شاہ جہاں کو اتنا یاد کرتی تھی کہ اپنے تمام کھلونوں کو شاہ کہہ کر بلاتی یہاں تک کہ اُس نے اپنی پالتو طوطے جس کا نام پہلے ''ایمرسن'' تھا۔ اس نے شاہ رکھ دیا۔ وہ اُس آسٹریلیوی طوطے سے اُردو میں بات کرتی۔

دو سال پاکستان میں رہنے، پاکستانیوں کے بیچ رہنے اور باقاعدہ اُردو سیکھنے سے اُسے اچھی اُردو آ گئی تھی پھر آتے وقت وہ اردو کی کتابیں بھی لے آئی تھی۔ وہ ساری کہانیاں جو شاہ جہاں نے اس کی اردو درست کرنے کے لیے خریدی تھیں۔ وہ ہر رات ان کہانیوں کو پڑھتی۔ یانگ منی کے ساتھ لائبریری جا کر وہ اکثر اُردو کی کوئی کہانی پرنٹ کر لاتی تھی جو بمشکل اسے انٹرنیٹ سے ملی ہوتی۔ وہ اردو کو نہیں بھولنا چاہتی تھی، اسے واپس پاکستان جانا تھا اور چوں کہ کوریہ میں انگریزی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا، اس لیے وہ alternate کے طور پر انگریزی نہیں سیکھ سکتی تھی اور کورین کی سمجھ کسی پاکستانی کو آ نہیں سکتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن شاہ جہاں کا خط آیا جس میں اُس نے معذرت کی تھی کہ اسے علم ہوتا کہ وہ جا رہی ہے تو وہ ضرور رُک جاتا اور اسے اچھے سے الوداع کرتا۔ اسے پڑھ کر دکھ ہوا۔ کم از کم اسے شاہ جہاں کے خود کو ''رخصت'' کرنے کی اُمید نہیں تھی۔ وہ تو سوچتی تھی کہ وہ اُسے روک دیتا لیکن شاید سب کی طرح وہ بھی شروع سے یہی سمجھ رہا تھا کہ یانگ شی وہاں چند دنوں کے لیے آئی ہے۔ شاید وہ اُسے مہمان ہی سمجھ رہا تھا۔ اس کا دل دکھا، اس نے جوابی خط میں یہ شکوہ لکھا تھا جس پر اگلے خط میں شاہ جہاں نے سمجھداری سے لکھا کہ وہ کوریا کی شہری ہے۔ اس کے والد کوریا سے ہیں۔ وہ وہیں رہ سکتی ہے۔ جیسے پاکستان میں سب والد کے پاس رہتے ہیں، ددھیال میں رہتے ہیں، بالکل ویسے ہی..... وہ کچھ سمجھی تو نہیں لیکن مطمئن ہوگئی کہ پاکستان میں اُس کا قیام عارضی تھا۔ پھر اپنے ہر خط میں وہ شاہ جہاں سے کہتی:

''جب میں بیس سال کی ہو جاؤں گی، تب میں پاکستان آ کر آپ سے شادی کروں گی.....''

اس کا جواب شاہ جہاں نے کبھی نہیں دیا۔ وہ دے ہی نہیں پاتا تھا۔ خود سے پندرہ سال چھوٹی لڑکی کو وہ کیا ہی جواب دیتا؟ وہ جب پاکستان میں تھی، تب بھی بار بار یہی کہتی کہ وہ اس سے شادی کرے گی۔ جواباً وہ اس کی معصومیت پر مسکرا دیتا۔ چھ سال کی غزارا یانگ عرف یانگ شی نہیں جانتی تھی شادی کیا ہوتی ہے۔ بس اتنا پتا تھا کہ جب شادی ہو جاتی ہے تو دو لوگ ساتھ رہتے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ وہ بس شاہ جہاں کے ساتھ ہمیشگی کے لیے رہنا چاہتی تھی۔

اتنی دلی وابستگی، اتنا مربوط رابطہ اُس کا شاہ جہاں سے کیسے بنا؟ شاید اس لیے کہ جب پاکستان میں وہ تمام کزنز، کلاس فیلوز اور رشتہ داروں کی وحشت اور دہشت کا شکار تھی تب شاہ جہاں اسے pemper کرتا تھا۔ اس کو comfort کرتا تھا۔ اس کو ایک ''انسان'' سمجھتا

تھا جس کا کسی بھی چیز میں کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کی محبت، اُس کی اپنائیت اور اس کی دوستی کی وجہ سے وہ شاہ جہاں پر دل من، تن دھن وار گئی تھی۔

شاہ جہاں میں اسے عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ اچھا لگتا تھا، بے حد اچھا۔ سب کزنز میں وہ اِس کا دوست اور اس کا ساتھی تھا۔ حالانکہ وہ اِس سے پندرہ سال بڑا تھا۔ وہ بیس سال کا تھا۔ یونی ورسٹی جاتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ جب جب اِس کے سامنے آتا، وہ لپک کر اس کی طرف بڑھتی۔ دور سے دکھائی دیتا تو سٹ پٹ اس کی طرف بھاگنے لگتی۔ بریک فیل گاڑی کی طرح اس کی رفتار بھی بے لگام ہوتی جب تک کہ وہ شاہ جہاں کے سینے سے لگ نہ جاتی، اس کی گردن سے بانہیں جھول نہ لیتی، اس کی بے چینی ختم نہیں ہوتی تھی۔

شاہ جہاں کے گردن میں بازو ڈال کر، اس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ پرسکون ہو جاتی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ شاہ جہاں کا پرفیوم، اس کی پسندیدہ خوشبو تھی۔

ایسے ہی ایک دن وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا پرفیوم اپنے کپڑوں پر چھڑک رہی تھی۔ وہ اسکول یونیفارم میں تھی اور شاہ جہاں ڈریسنگ روم میں گھسا، کپڑے تبدیل کر رہا تھا۔ ہمیشہ وہ جب بھی تیار ہوتی، پھر رسے شاہ جہاں کے کمرے میں پہنچ جاتی۔ وہیں بیٹھی رہتی، شاہ جہاں تیار ہوتا، چیزیں سمیٹتا، نیچے سب ناشتہ کر رہے ہوتے مگر وہ وہیں ہوتی، اسی کے ساتھ نیچے آتی اور اس کی موجودگی میں ناشتہ کرتی۔

اس دن شاہ جہاں کی پرزنٹیشن تھی، اس لیے وہ کوٹ سوٹ پہن رہا تھا۔ سفید شرٹ پہننے کے بعد وہ ٹائی کی ناٹ لگانے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آیا تو چھوٹی غزارا کو اپنی پرفیوم سے نہاتے ہوئے دیکھا۔

وہ فوراً ہی اس پہ جھپٹا۔ ”کیا کر رہی ہو یانگ شی۔ یہ میل فریگ نینس ہے۔“ وہ اس کے

ہاتھ سے پرفیوم لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے برہمی سے بولا۔ وہ اسے یانگ شی کہتا تھا۔ غزارا کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔ وہ ناراضی سے اس کو دیکھنے لگی۔ اس نے سفید یونیفارم پر چھڑک چھڑک کر پرفیوم کے ذرات کے پیلے داغ لگا لیے تھے۔

''کیا کر دیا تم نے لڑکی؟ سارا یونیفارم خراب کر دیا۔ اب کیا کروں گا میں؟ آل ریڈی لیٹ ہوں۔'' وہ افسوس سے اس کے بازو اور سینے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے سارا یونیفارم خراب ہو گیا تھا۔

''تم سکول نہیں جا رہیں آج۔ اِدھر ہی رہو گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں، کپڑے بدلو۔ سارا کمرہ خوشبو سے بھر دیا ہے۔'' وہ ناک کے آگے ہاتھ جھلاتے ہوئے سخت ناراضی سے کہہ رہا تھا۔ اگر اسے جلدی نہ ہوتی تو غزارا کے دوسرا یونیفارم پہننے تک انتظار کرتا۔ مگر اس وقت اسے نکلنا تھا۔ وہ اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ غزارا اُدھر ہی کھڑی ہے۔ کمرے سے باہر نہیں گئی اپنا بیگ لیتا ہوا باہر نکل گیا۔

جب وہ واپس آیا تو دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ تھکا تھکا سا اندر آیا تھا۔ بیگ ایک طرف رکھ کے وہ صوفے پر بیٹھ کے جوتے اُتارنے لگا جب اسے کوئی مانوس خوشبو سونگھائی دی۔ وہ سمجھا صبح غزارا پرفیوم خالی کر کے گئی تھی۔ وہی خوشبو ہو گی مگر جب وہ دوسرا جوتا اتار کر موزہ ہٹا رہا تھا۔ ناک میں کئی مانوس خوشبوئیں گھوم گئیں۔ وہ یکدم جیسے رُک گیا پھر اگلے ہی لمحے وہ اٹھا اور تیزی سے ڈریسنگ روم کی طرف بھاگا۔ دروازہ کھول کر وہ آگے بڑھا مگر قدم دہلیز پر دم توڑ گئے۔

غزارا نے اس کے تمام پرفیومز کھول رکھے تھے۔ ساری گھڑیاں، سارے جوتے، ساری شرٹس، ساری پینٹس، ساری ٹائیاں سب کچھ فرش پر تھا اور وہ مزے سے پرفیومز لے لے کر

سب پر چھڑک رہی تھی۔

وہ ابھی تک یونیفارم میں تھی۔ یعنی وہ اس کے جانے کے بعد کمرے سے گئی ہی نہیں تھی اور نیچے سب سمجھے ہوں گے وہ اسے اسکول چھوڑ گیا ہوگا۔ صفائی والی ملازمہ نے بھی اِدھر دھیان نہیں..... یا اللہ.....

وہ نڈھال سے اندر چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی غزارا رُک گئی اور بڑی بڑی مسکراہٹ سجائے اسے دیکھنے لگی جیسے کوئی شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ شاہ جہاں اس کے پاس پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور اس سے قبل کہ وہ اُس سے پرفیوم چھینتا، غزارا نے انگلی دبا کر اس کی گردن پر اسپرے کردی پھر خود ہی اس کی گردن پر جھک گئی اور گہرا سانس لیا۔ وہ جیسے ہی اُس کی گردن سے ہٹی، کچھ بڑبڑائی۔ یقیناً کورئین میں کچھ کہا تھا۔ شاہ جہاں کو سمجھ نہیں آئی۔

وہ اسے محویت سے دیکھنے لگا کیوں کہ وہ ہنس رہی تھی۔ غزارا جو کبھی ہنسی ہی نہیں تھی۔ اُس کے ننھے ننھے دانت اُس کے گلابی ہونٹوں کے پیچھے چمک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر اسے یونہی دیکھے گیا پھر یکدم خود ہی اپنے خیال سے چونکا۔ وہ کیوں اِسے یوں دیکھ رہا تھا۔ وہ کمرے کی حالت کو کیوں نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس احمق لڑکی نے اس کی تمام کلیکشنز کا ستیاناس کردیا تھا، ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی اور وہ پرسکون بیٹھا ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ خواب سے جاگا اور غزارا کو کان سے پکڑا۔

''کیا کیا یہ سب؟ ایسا کرتے ہیں؟''

وہ کان کی لو دبا نہیں رہا تھا محض پکڑ رکھی تھی۔ غزارا ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولتا رہا، اسے ڈانٹتا رہا۔ اپنی چیزوں کی قیمت، اس کے کپڑوں کی حالت، کمرے کے حشر نشر پر تقریر کرتا رہا جب چپ ہوچکا تو غزارا گم صم اسے دیکھ رہی تھی۔ کان کی لو ابھی تک شاہ جہاں کی

انگلیوں میں تھی۔ وہ ہولے ہولے ہانپتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ غزارا مسکرائی۔ بے نیازی بھری مسکراہٹ..... تپانے والی مسکراہٹ۔

شاہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

آتے ہوئے وہ شاہ جہاں کا وہی پرفیوم اٹھا لائی تھی جس کا شاہ جہاں نے خط میں پوچھا تھا اور جس کا جواب اُس نے آج تک نہیں دیا تھا۔

جہاز کی ساری لائٹیں قریباً بند تھیں۔ مسافر سو چکے تھے۔ ادھیڑ عمر بزرگ خاتون بھی اونی سوئیٹر بنتے بنتے سو گئی تھی۔ اس نے اخلاقاً اگلی سیٹ کی بیک سے اوڑھنی نکال کر اُن پر پھیلا دی تھی تاکہ اُنھیں ٹھنڈ نہ لگے۔

پائلٹ کیبن کے آگے اسٹول پر بیٹھی ایئر ہوسٹس اونگھ رہی تھی۔ جہاز اب بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ آسمان اور دھرتی دونوں کے درمیان جیسے جھول رہا تھا۔ خود بھی اس نے سوئیٹر پہن لیا تھا اور اوڑھنی جو چھوٹے سائز کی شال تھی، ٹانگوں پر پھیلا دی تھی۔ یہی اوڑھنی اُس چھوٹے سے کمبل کی یاد دلا رہی تھی جو حمنہ اس کی طرف اچھال کر اپنے بستر میں گھس جاتی تھی۔

ہوا کی خنکی، اونچائی کی سردی اس کے جسم میں کپکپی لا رہی تھی۔ اُس رات مری میں برف پڑی تھی اور اسلام آباد میں پرزور بارش ہوئی تھی۔ مری کی ٹھنڈی ہواؤں نے، سارا پنڈی اسلام آباد یخ کر دیا تھا۔ جسم میں سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی، ٹھٹھرتی سردی۔

وہ چھوٹی ممانی کی بیٹی مرحا جو اس سے پانچ سال بڑی تھی اور صالحہ جو غزارا سے آٹھ سال بڑی تھی، کے کمرے میں سوتی تھی۔ اکثر ایسے ہوتا تھا کہ مرحا اسے کمرے سے نکال دیتی تھی۔ دو بار تو معصوم غزارا کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں جائے۔ رات بھر وہ دروازے کے آگے بیٹھی رہی، صبح ملازمہ بتا گئی کہ غزارا دروازے کے باہر فرش پر سو رہی ہے۔ دو بار محض ایسا ہوا، اس

کے بعد شاہ جہاں کی ہمدردی کی وجہ سے وہ اُس کے کمرے میں چلی آتی تھی۔

ہر ہفتے، دو بار غزارا یا نگ کو کمرہ سے ضرور نکالا جاتا تھا۔

اس رات بھی اسے مرحا کی ماما نے کمرے سے نکال دیا تھا۔ نہ صرف کمرے سے بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ لان میں لے آئی تھی اور اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے انھوں نے غزارا کو سردی کے حوالے کر دیا تھا۔ پچھلے لان کا دروازہ لاؤنج میں کھلتا تھا۔ لاؤنج کی گلاس ڈورز کو کھینچنے کے بعد ممانی نے پردے برابر کر دیے۔ وہ کچھ دیر ان بند شیشوں کو دیکھتی رہی جس کے پار ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی پھر وہ اُدھر ہی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ سامنے سوئمنگ پول تھا۔ اطراف میں سیمنٹ کے سطحیں اور پھر لان کی گھاس، پودے، جھاڑیاں اور درخت تھے اس کے بعد چار دیواری۔

وہ رونے لگی۔ رونا صرف ''سردی'' لگنے پر آ رہا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں نہیں تھی جہاں لفظوں کا درد انسان سمجھتا ہے۔ جہاں لہجوں کی چبھن چبھتی ہے۔ جہاں انداز اور اشارے ہی بتا دیتے ہیں کہ اس کو بے عزت کیا گیا ہے۔ وہ چھ سال کی تھی، صرف جسمانی تشدد پر رو سکتی تھی اور وہ رو رہی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی۔ رات، اندھیرے، سردی اور تنہائی سے۔

شاہ جہاں ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ وہ عمر کے اس پیٹے میں تھا جہاں ایسی بھیانک راتوں میں adventure کرنا لڑکوں کا شوق ہوتا ہے اور اسی شوق کی آبیاری کے لیے وہ راتوں کو نکل جاتے ہیں۔ وہ بھی نکل گیا تھا مگر یہ بات غزارا نہیں جانتی تھی۔

چھ سال کی غزارا مخمل کے سلیپنگ سوٹ میں ملبوس تھی۔ پیروں میں موزے تھے لیکن سر پہ کوئی کیپ نہیں تھی۔ اندر کمرے ہیٹرز کے سبب گرم ہوتے تھے۔ کھلے اعضاء جیسے چہرہ، گردن، ہاتھوں پر سردی نہیں لگتی لیکن اب باہر آنے کے بعد اسے ان جگہوں پر شدید ٹھنڈ لگ

رہی تھی۔

رات لمبی اور خنک تھی۔ درجہ حرارت دھیرے دھیرے گر رہا تھا۔ جسم کی حرارت کم پڑ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ آستین کے بازو کھینچے، پھونکیں مار مار کر ہاتھوں کو گرم کرتی رہی پھر اس پر کپکپی طاری ہونے لگی..... دھیرے دھیرے یہ کپکپی سنسناہٹ میں بدل گئی اور پورا جسم لرزنے لگا۔ بارش کے سبب اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ وہ پہلے بیٹھی تھی، اب گھٹڑی کی شکل میں سیڑھیوں پر گر گئی تھی۔ گھٹنوں کو سینے سے لگائے، ہاتھوں کو منھ کے قریب رکھے، وہ کانپتے ہوئے سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی سسکیاں، سسکیاں کم دھیمے دھیمے کراہنے کی آوازیں تھیں۔

آدھی رات کا وقت تھا جب اس نے لان میں ''دھپ'' کی آواز سنی۔ بند ہوتی آنکھوں، اور ڈوبتے اعصاب کے ساتھ اسے دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ شاہ جہاں تھا جو اپنے باپ کے غیض کی وجہ سے گیٹ سے آنے کی بجائے، پچھلی دیوار پھلانگ کر آیا تھا تاکہ پکڑا نہ جائے۔

وہ اسے دیکھ کر لمحے کے لیے رُکا تھا۔ وہ اب چہرے سے نقاب ہٹا رہا تھا جو اس نے سوئیٹر کی ہائی نک کو کھینچ کر منھ پر لیا تھا۔ وہ بھنویں کھینچے، اس کو چھو رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے شاہ جہاں کے منھ سے اپنے نام کی پکار سنائی دی۔ اس کے منھ سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھ، اس کے ٹھنڈے گال تھپتھپا رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو جھولتا محسوس کیا۔ شاہ جہاں نے اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد اس کا اگلا شعور کمرے کی گرماہٹ سے جاگا تھا۔

شاہ جہاں کی چھوٹی بہن جوغزارا سے تیرہ سال بڑی تھی۔ اس کے پاس بیٹھی تھی اور شاہ جہاں نیچے پنجوں کے بل بیٹھا اس کی پیشانی کو چھو رہا تھا جو اب گرم ہو رہی تھی۔ یعنی اسے بخار چڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ہلیں تو وہ سیدھے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے تھکی تھکی آنکھیں

کھول کر چاروں اور دیکھا پھر وہ یکدم کراہی۔ شاہ جہاں تڑپ کر آگے بڑھا۔

''پرنسز..... تم ٹھیک ہو؟''

اس نے ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ سر میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

''سر درد ہو رہا ہے اسے.....'' عائشہ نے اندازہ لگایا۔

''ہوں۔'' شاہ جہاں نے سر ہلایا۔

''آپ کو ڈاکٹر کو بلا لینا چاہیے۔ وہ چار گھنٹے سے باہر تھی۔'' عائشہ نے احتیاطاً کہا۔ غزارا اب ہلکی ہلکی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ شاہ جہاں نے ایک نظر اس کے بند ہوتی آواز کو دیکھا پھر وہ کھڑا ہوا۔

''نہیں..... اس کو ہسپتال لے کر چلتے ہیں۔ طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو سنبھال نہیں پائیں گے۔''

''بھائی..... اگر دادی ماں کو پتا چلا تو.....؟'' عائشہ پریشانی سے کہنے لگی۔ ''انھیں کیا کہیں گے کہ آدھی رات کو اس کو کیا ہوا تھا؟''

وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا مگر جلد ہی اس نے سر جھٹکا۔ ''چھوٹی چچی نے یہ سب کرنے سے پہلے اِس کا جواب سوچ لیا ہوگا تم چلو میرے ساتھ۔'' وہ غزارا کو اپنی بانہوں میں بھرتا ہوا بولا۔

رک رک کے سانس لیتی غزارا کو ڈاکٹر نے ایڈمٹ کر دیا تھا۔ آکسیجن ماسک کے ذریعے سٹیم انہیلیشن لگائی تھی۔ اور گرم کمبل اس پر ڈالا گیا تھا کہ اُس کی سردی کم ہو سکے۔

عائشہ صوفے پر بیٹھی، سینے پر ہاتھ باندھے اونگھ رہی تھی جب کہ شاہ جہاں اسٹول پر بیٹھا، اس کی کلائی پکڑے، اس کی نس پر انگوٹھا پھیر رہا تھا۔

کیا ہو جاتا اگر وہ وہاں نہ آتا۔ اس سرسراتی، جسم جکڑتی، جان لیتی سردی میں کیا کوریا کی

حساس اور unimmune غزارا جی لیتی؟ کیا وہ اس کی موت کی ذمہ داری پھر قبول کرتے؟ یہ سردیاں اس کے لیے نئی نہیں تھیں۔ کوریا میں اس سے زیادہ سردی پڑتی ہے لیکن برہنہ بدن اور زیرو لیئرز پہننے والوں کے لیے سردیاں نئی نہیں مگر اندوہناک ضرور ہوتی ہیں۔ چھوٹی چچی کو ذرا ترس نہیں آیا۔ ان کی اپنی بیٹیاں بھی تو اتنی ہی تھیں۔ اس کی ہم عمر۔ وہ غزارا کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آخر اُسے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے؟ وہ سو رہی تھی۔ اس کے ماسک سے بھاپ نکل رہی تھی جس کی نمی کے باعث ننھے ننھے قطرے اس کے گالوں سے چپک گئے تھے۔

صبح گیارہ بجے تک وہ وہیں بیٹھا رہا تھا اس نے عائشہ کو بھیج دیا تھا۔ غزارا کو ہوش آ گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے ڈرپ، ماسک سب اُتروا دیا تھا۔ اس کی طبیعت اب قدرے سنبھل گئی تھی لیکن گلے میں درد، سوزش اور فلو برقرار تھا۔

دادی نے اور پاپا نے فون کر کے پوچھا تھا کہ اُسے کیا ہوا ہے۔ شاہ جہاں نے یہ کہہ دیا کہ چھوٹی چچی سے پوچھا جائے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ چھوٹی چچی نے کیا جواب دیا ہوگا؟ البتہ اُس کے بعد کسی کا فون نہیں آیا تھا۔

غزارا اُس کے بعد ایک ہفتے تک مسلسل کھانسی، ہلکے بخار اور فلو کا شکار رہی تھی۔

جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ابھی تک چھوٹی ممانی، ویسی ہی ہوں گی؟ وہی چھوٹے بال، تنی اَبرو، بھینچے لب اور لہو دیکھتی آنکھیں؟ کیا وہ اس بار بھی اُسے تیوریوں پر بل ڈالے دیکھیں گی؟ کیا وہ ابھی بھی، یعنی اس عمر میں بھی جب کہ وہ سمجھدار ہو چکی ہے، اُسے سزا دے سکیں گی؟

ساتھ والی سیٹ پہ بوڑھے انکل کسمسائے تو اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا۔ بوڑھے انکل

یقیناً کوئی برا خواب دیکھ رہے تھے۔ان کے چہرے پر دہشت کے تاثرات تھے۔اس نے نرمی سے اُن کے ہاتھ کی پشت سہلائی جس پر کچھ دیر وہ اسی طرح ہیجان میں رہے پھر قدرے معتدل ہوگئے اور چہرے کی دہشت ووحشت جاتی رہی۔

کبھی وہ بھی خواب میں ایسے ہی ڈر جایا کرتی تھی۔خصوصاً اُس رات جب ما(کورین زبان میں ماں کو کہتے ہیں) کی موت ہوئی تھی.....وہ محض ساڑھے پانچ سال کی تھی.....

موت کیا ہوتی ہے؟موت کی کیا حقیقت ہے۔ننھی غزارا کچھ نہیں جانتی تھی۔سات سال میں وہ صرف اپنی ما کو بستر پر سفید پیرہن میں لپٹے ہوئے دیکھ رہی تھی جن کے نتھنوں میں روئی تھی،ٹھوڑی کے گرد پٹی کسی ہوئی تھی۔ان کے آس پاس کئی پھول تھے۔سفید قالین پر سوئی اس کے ما کے اِردگرد کئی عورتیں سفید وسیاہ اور کم رنگ والے کپڑوں میں قطار میں بیٹھی، کھجور کی گٹھلیوں پر تسبیح گن رہے تھیں اور کچھ کے ہاتھ میں سیپارے تھے جن کو وہ آگے پیچھے جھولتے ہوئے پڑھ رہی تھیں۔وہاں سب خاموش تھے۔کوئی رو نہیں رہا تھا۔

حالانکہ جب شی ڈانگ او کے بابا کی موت ہوئی تھی تب اُس کے گھر میں سب رو رہے تھے۔شی ڈانگ بھی، وہ گھر کی پچھلی دیوار کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھا تھا اور زاروقطار رو رہا تھا جب یانگ شی اُس کے پاس گئی تھی۔اس نے تب بتایا یانگ شی کو کہ موت کیا ہوتی ہے لیکن تب بھی یانگ شی سمجھ نہیں پائی تھی۔

دادی، ممانیاں، ماموں جو وقفے وقفے سے اندر آتے پھر باہر چلے جا رہے تھے۔اس کے کزن جو عجیب چہ مگوئیاں، سرگوشیاں کرتے ہوئے اِدھر اُدھر چھپ رہے تھے کہ کہیں خدا نخواستہ اجل اُنھیں بھی ساتھ نہ لے جائے۔

خاموش، پراسرار اور پرسحر ماحول تھا۔

وہ ما کے بالیں متمکن تھی۔ چپ خاموش۔ جب وہ کوریا میں تھی، تب اِس کی مادن رات کام کرتی تھیں۔ کبھی ایک شفٹ تو کبھی دوسری..... جب وہ گھر آتی تھیں تو ایسے ہی تھکی، ماندہ لاؤنج کے بوسیدہ اور ناکارہ صوفے پر آڑھی ترچھی لیٹ کر سو جاتی تھی۔ اُس نے ما کو کبھی نیند سے نہیں جگایا تھا۔ یانگ منی کہتی تھی کہ ما تھکی ہوتی ہیں، ان کو نیند سے مت جگاؤ۔

آج جب ما اتنی دیر سے سو رہی تھیں۔ وہ اِنھیں نہیں جگانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ بس چپ چاپ اُنھیں دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں یہ سوچتے ہوئے کہ ما کی ناک تو روئی سے بند ہے۔ وہ سانس کیسے لے رہی ہیں؟

پھر کچھ ہی دیر بعد اسے گھر میں ماموں، کچھ اور مرد اور شاہجہاں آتا دکھائی دیا۔ اُن سب نے ما کی ڈولی کو کندھوں پر اٹھایا۔ اسے بھی کسی نے گود میں اٹھالیا لیکن وہ دیکھ نہیں سکی۔ وہ تو اس شخص کے کندھے پر منھ رکھے، ما کی ڈولی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ کوریا میں ایسا نہیں ہوتا۔ مرنے والے کو ہسپتال سے ہی کہیں لے کر چلے جاتے ہیں۔ کہاں؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ صرف ایک دفعہ اس کی ما کے ساتھ وہ شی ڈانگ او کے بابا کی قبر پر گئی تھی۔ مگر وہ پتا نہیں کیا تھا۔ ایک پتھر کا کتبہ تھا، کسی ٹنکی کے ڈھکن جیسا جس پر شی ڈانگ او کے پاپا کی تصویر لگی تھی اور نیچے سطح پر کچھ تاریخیں کندہ تھیں۔

اب جب کہ ڈھیر سارے لوگ ما کو اٹھائے باہر جا رہے تھے، وہ مرکزی دروازے کے پاس رُک گئی۔ جیسے ہی مادور ہوگئی، اس نے کندھے سے تیزی سے سر ہٹایا۔

''ما.....'' وہ بے چینی سے چلائی۔ اٹھانے والے شخص نے تھپک کر اسے واپس کندھے پر ڈالنا چاہتا لیکن وہ پھر اٹھ گئی اور ما..... ما..... کہتے ہوئے زور زور سے چلانے لگی۔ تب ہی وہ شخص اُسے گاڑی میں بٹھا کر کہیں دور لے آیا تھا۔

وہ شاہ جہاں تھا۔ بیس سال کا شاہ جہاں جو اتنا متین تھا کہ اُسے معلوم تھا کہ بچوں کو کیسے ورغلایا جاتا ہے۔ وہ سارا دن غزارا کو جوئے لینڈ، فوڈ اسٹریٹس میں گھماتا رہا۔ وہ بہل گئی تھی۔ اس نے کئی کھلونے خریدے، کئی بکس لیں۔ اس نے کوریا کے مشہور کارٹون ebay کے اسٹیکرز بھی لیے تھے جو وہ یقیناً اپنی کاپی اور کتابوں پر چپکانے والی تھی۔

رات کو جب وہ لوٹے تب غزارا تھک گئی تھی۔ وہ شاہجہان کے کندھے پر سوئی ہوئی آئی تھی۔ اس رات شاہجہاں نے اُسے حمنہ کے پاس سُلایا تھا اور تب اس نے وہ بھیانک خواب دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ اس کی ماکو ایک کالے کنویں میں پھینک رہے ہیں۔ ماچلا رہی ہیں، اس کو اور بابا کو آوازیں دے رہی ہے لیکن وہ اتنے سارے لوگ ہیں کہ ماخود کو بچا نہیں پا رہی۔ مانے وہی سفید کپڑے پہنے ہیں، نتھنوں میں روئی ہے پھر ان سب لوگوں نے ان کو کالے کنویں میں پھینک دیا اور ڈھیر ساری مٹی ڈالنے لگی، یہ وہی مٹی تھی جس میں وہ جوئے لینڈ میں کھیل رہی تھی پھر وہ سب لوگ جوئے لینڈ میں جھولے لے رہے تھے پھر وہ اس کے اسٹیکرز چننے لگے اور پھر اس نے دیکھا کہ ebay کے سارے کردار اس کالے کنویں سے باہر آرہے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں سفید کپڑے ہیں، یہ سفید کپڑے کہیں کہیں سے سرخ ہیں، پھر اسے یکدم ماکے چلانے کی آواز آئی پھر اسے سرخ پانی دکھائی دیا جس میں کچھ تیر رہا تھا اور اس نے جھک کے وہ گندی چیز اٹھائی، وہ ماکا کٹا ہوا ہاتھ تھا۔

وہ چیخ مار کر اٹھی تھی، چیخ اتنی تند و تیز تھی کہ بیڈ پر سوئی حمنہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

غزارا گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بری طرح کانپ رہی تھی اور پھر اگلے ہی پل وہ ہزیانی انداز میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔ وہ اس قدر مشتعل ہو کر رو رہی تھی کہ حمنہ خوفزدہ ہو گئی۔

وہ بیڈ سے اُتری اور دروازے کی طرف بھاگی مگر جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، شاہجہاں بوکھلا کر اندر گرا۔ وہ شاید غزارا کی چیخ سن کر بھاگا بھاگا آیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے حواس باختہ انداز میں پوچھا مگر حمنہ کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ صوفے پر غزارا کو بری طرح روتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکا، اسے گود میں اٹھایا۔

وہ ما..... ما..... کہتے ہوئے بے قابو ہو رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے ماموں، ممانیاں، نانی سب اندر آ گئے۔ وہ سسک رہی تھی سب گومگو کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ننھی بچی تھی اور اس قدر بے چین تھی کہ بری طرح ہاتھ پیر مارتے ہوئے کورین میں جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ شاید وہ اپنا خواب حواس باختہ انداز میں بتا رہی تھی یا شاید وہ کچھ مانگ رہی تھی۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

تب شاہجہاں نے اسے بہلایا، اسے مطمئن کیا۔ اس کی کپکپاہٹ معدوم کی۔ باقی سب تو چیخنے کی وجہ جاننے کے بعد اونگھتے ہوئے بے زاری سے سر جھٹکتے چلے گئے تھے۔ دو گھنٹے تک شاہجہاں نیم خوابی کیفیت میں اپنی نیند جھپکتا اس سے کھیلتا رہا تھا۔

اس کے بعد اسے دوبارہ ایسا خواب نہیں آیا۔ البتہ اسے ما کی یاد آتی تھی۔ اس نے شاہجہاں سے پوچھا تھا کہ ما کہاں گئی ہیں؟ کیا وہ کالے کنویں میں ہیں؟ تب شاہجہاں نے بتایا کہ نہیں۔ وہ تو سفید کمرے میں ہیں۔

''وہ کیا ہے؟'' اس نے الجھن سے پوچھا تھا۔ وہ پارک میں سنگی بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جوتوں کے تسمے کھل گئے تھے جنھیں شاہجہاں اس کے سامنے گھٹنے کے بل بیٹھ کے باندھ رہا تھا۔ وہ اسے ہر شام پارک لے کر آتا تھا تاکہ وہ جذباتی طور پر مندمل ہو سکے۔

''سفید کمرہ وہ کمرہ جہاں رات نہیں ہوتی۔ ہم سب کو جب اللہ بلائے گا تو ہم اس سفید

کمرے میں جائیں گے۔ وہاں بہت روشنی ہوتی ہے۔"

"ماکو اللہ نے بلایا ہے؟"

"ہاں۔"

"وہ اللہ سے مل کر واپس آجائیں گی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں۔ جو اللہ کے پاس جاتے ہیں، وہ واپس نہیں آتے۔ ہمیں وہاں جانا ہوتا ہے۔"

"یعنی اب میں وہاں جاؤں گی۔ وہ نہیں آئیں گی؟" وہ جیسے مایوس ہوئی تھی۔

"ہوں۔"

"پھر میں کب جاؤں گی؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"جب اللہ بلائے گا۔" وہ نرمی سے مسکرایا تھا۔

"اللہ کب بلائے گا؟"

"وہ تو اللہ جانتا ہے۔ وہ کسی کو نہیں پتا۔" شاہجہاں نے اس کے گال کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا تھا پھر وہ کھڑا ہوا، اپنا گھٹنا جھاڑا جہاں پینٹ پر ہلکی ہلکی مٹی لگ گئی تھی۔ وہ اس کی انگلی تھامے اُچھل اُچھل کر چل رہی تھی۔

"میں اللہ سے دعا کروں گی کہ مجھے جلدی بلا لے۔ میں ماسے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ کورین میں بولی۔

شاہ جہاں کے رہتے اسے کبھی ما کی یاد نہیں آئی۔ وہ کمال مہارت سے اس کا دھیان بھٹکا دیتا تھا۔ وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا پھر اس نے اسکول میں ایڈمشن لے لیا۔ اسکول کے ساتھی، ہوم روک، پارک، مصروفیات۔ وہ چند ماہ میں مطمئن ہوگئی کہ ما اب نہیں آئے گی۔ ماسے اب اس کا محور بدل کر شاہجہاں ہوگیا تھا۔

گو کہ اسے ابھی تک صرف کورین آتی تھی، اردو کا ایک لفظ بھی نہیں سیکھا تھا لیکن وہ شاہجہاں سے کائناتی زبان میں ڈھیر ساری گفتگو کر لیتی تھی جس طرح شیر خوار بچے کی زبان ماں سمجھ جاتی ہے، بالکل اسی طرح شاہجہاں اس کی زبان سمجھتا تھا۔ جب بھی کسی کزن کو اس کی کوئی بات سمجھ نہیں آتی تھی، وہ اسے پکڑ کر شاہجہاں کے پاس لے جاتے تھے تاکہ وہ بتا سکے کہ غزارا کیا کہہ رہی ہے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ غزارا کے ساتھ مرحا اور اس کا بھائی عاطف لڑ پڑے۔ دونوں اس کو جھولے پر بیٹھنے نہیں دے رہے تھے تب غزارا نے کوئی عجیب سا لفظ کہا جسے کی شکایت لگانے وہ دونوں بھائی بہن شاہجہاں کے سر پہنچ گئے۔ وہ کمرے میں ریکلائنر پر بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

''اس نے ہمیں گی سی جی بولا ہے۔ ہمیں اس کا مطلب بتائیں۔'' عاطف تیورا کے کہہ رہا تھا۔ اس نے ننھی غزارا کا ہاتھ کلائی سے سختی سے پکڑ رکھا تھا۔

شاہجہاں نے سیدھا ہو کر غزارا کو دیکھا جو ہونٹ کے کنارے سے حسب عادت شہادت کی انگلی منہ میں ڈالے ڈھٹائی سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بولا ہے اس نے؟''

''گی سج .....'' وہ ادائیگی میں اٹک گیا تو اس نے غصے سے غزارا کو دیکھا۔ ''بتاؤ یا نگ شی ..... کیا کہا تھا تم نے؟''

''گی سی جی نہیں بولا۔ ''گے سے کگی (gae-sae-kggi)'' بولا ہے یہ جھوٹ بولتے ہیں۔'' وہ کورین میں تیزی سے بولی۔ تینوں نے اسے یک لخت دیکھا، وہ بری بری نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

''بتائیں شاہجہاں بھائی، اس نے کیا کہا ہے؟'' عاطف غصے سے بے چین ہوا۔
شاہجہاں نے فون نکالا اور یانگ شی سے کہا کہ وہ وہاں ٹرانسلیٹر کے مائیک میں بولے۔
جب غزارا نے وہ جملہ دوبارہ کہا تو شاہجہاں نے اس کا مفہوم دیکھا۔
وہ کورین میں دی جانے والی ایک گمبھیر گالی تھی۔ ''کتیا کی اولاد'' وہ بری طرح چونکا پھر اس نے تیزی سے تاثرات متعدل کیے کیوں کہ عاطف اور مرحا اسے باریکی سے دیکھ رہے تھے۔
''کیا مطلب ہے اس کا؟'' دس سالہ عاطف نے مشکوک انداز میں پوچھا۔
''اس کا مطلب ہے کہ مرحا تم دونوں سے دوستی کرنا چاہتی ہے۔ گے سی لگی کا مطلب، میرے عزیز دوست۔ کیوں یانگ شی؟ صحیح کہا ناں؟''
''جھوٹے۔ صاف صاف بتاؤ ان کو کہ میں نے ان کو گالی دی ہے۔'' وہ اشاروں ہی اشاروں میں بولی۔ اس کی اور شاہجہاں کی کائناتی زبان۔ شاہجہاں نے اس کی کلائی عاطف کے ہاتھ سے چھڑائی اور اسے نرمی سے قریب کر کے ران پہ بٹھالیا پھر زبردستی مسکراتے ہوئے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھا۔
''یہ تم دونوں سے دوستی کرنا چاہتی ہے۔ تم دونوں بتاؤ، اس سے دوستی کرو گے؟''
''نہیں۔''
''نہیں''
دونوں یکے کے بعد بولے۔
شاہجہاں کی مسکراہٹ پھیکی ہوگئی۔ اس کے بعد وہ رکے نہیں، عاطف مرحا کا ہاتھ پکڑے، غزارا کو دھمکی آمیز نظروں سے گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ان نے جاتے ہی شاہجہاں نے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

''تم نے کورین میں گالیاں سیکھی ہیں؟''

''ہاں۔ کچھ لوگوں کے لیے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''تمہیں پتا ہے یہ کتنی خراب گالی ہے؟''

''گالیاں اچھی ہوتی بھی نہیں ہیں۔'' اس نے لٹ جھٹکی۔

''کس نے سکھائی تمہیں یہ گالی؟''

''یانگ منی نے ایک دفعہ اپنے بوائے فرینڈ کو دی تھی جب اس کا بریک اپ ہوا تھا۔ اس نے بہت زیادہ ڈرنک کی تھی تب وہ یہ بار بار بول رہی تھی۔'' اس نے کمال سادگی سے کہا۔

شاہجہاں نے سانس لیا۔ کم از کم بچوں کے سامنے ایسی واہیات گالیاں نہیں دینی چاہیں۔

''تم یہ گالی دوبارہ نہیں دو گی!''

''ضرورت پر منحصر کرتا ہے۔'' وہ بے نیازی سے کہنے لگی۔

''یہ میرا حکم ہے۔ میری بات مانو یانگ شی!'' وہ تحکم سے بولا یکدم غزارا کو ما کی یاد آئی۔ وہ ہمیشہ یہ فقرہ استعمال کرتی تھی۔ میرا حکم ہے۔ میری مانو۔ مجھے سن لو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے کچھ دیر لے دے والے انداز میں شاہجہاں کو گھورا پھر اس نے سانس لے کر کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے۔

''ٹھیک ہے۔'' اور لپک کر اس کی ران سے اتر گئی۔

شاہجہاں کو اس پر بالکل اعتبار نہیں تھا۔ وہ چھ سال کی تھی مگر اچھی خاصی چالاک تھی۔ گو کہ اسے لسانی مسئلہ تھا۔ وہ جلدی بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے خائف بھی ہو جاتی تھی۔ رو بھی پڑتی تھی لیکن شاہجہاں کی گود میں آ کر وہ یکسر بدل جاتی تھی۔ اس کی خوفزدہ آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں، اعتماد آ جاتا تھا اور کورین میں ہی سہی ایسے بات کرتی جیسے کسی کو خاطر میں نہ لائے گی

لیکن جب ممانیاں یا نانی یا پھر ماموں کچھ کہتے، بھیگی بلی بن جاتی۔ وہ باقی سب سے جتنا ڈرتی تھی، سہم جاتی تھی اتنا ہی شاہجہاں پہ شیر بن کر حملہ کرتی تھی۔ وہ عجیب تھی۔ شاید کورین سب ہی عجیب ہوتے ہیں۔

جہاز کے اس کمبل میں، اور حمنہ کے کمبل میں بس ایک فرق تھا۔ حمنہ کے کمبل میں چھوٹی غزارا پوری آجاتی تھی جب کہ جہاز کے اس کمبل میں وہ نہیں آرہی تھی۔ کمبل کی اونی سطح پر انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ یکدم اس کے معدے میں گھونسہ پڑا، جو کھایا تھا یکا یک منہ میں آگیا۔

Air sickness

جو اسے پیدائشی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سیٹ کے کونے سے وامٹ بیگ نکالا اور دھیرے دھیرے اوکناتے ہوئے قے کرنی لگی۔ اس کی ''غوک.....غوک.....'' کی آواز سن کر ائیر ہوسٹس ہمدردی سے اُس کے پاس آئی۔

''میم آپ ٹھیک ہیں؟''

وہ وامٹ بیگ میں منہ ڈالے قے کرتی رہی، چار پانچ بار ملغوبہ باہر اُگلنے کے بعد وہ پیچھے ہوئی۔ ائیر ہوسٹس تا حال کھڑی تھی۔ منتظر اور متفکر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے سر سیٹ کی پشت سے جوڑ دیا اور گہرے گہرے سانس لیے۔ کچھ دیر خود کو متعدل کرنے کے بعد اس نے ائیر ہوسٹس کو ''میں ٹھیک ہوں'' کہا اور بزرگوں کی نیند خراب کیے بغیر وہ باہر نکل کر lavatory میں آگئی۔ وامٹ بیگ وہاں ڈسٹ بن میں ڈالنے کے بعد اس نے بیسن میں کلی کی، چہرے پر پانی ڈالا۔ سامنے چھوٹا سا آئینہ لگا تھا۔

مسلسل قے کرنے کے سبب اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں

کے ساتھ دل کے مقام پر ہاتھ رکھا اور اُس کمزور عضو کی ہیجان آمیز دھڑ دھڑاہٹ محسوس کی جو اپنی تمام تر کوششوں کے ساتھ اُس کی زندگی کو ''حرکت'' دے رہا تھا۔ ایک ایسی گاڑی کی طرح جس کا انجن بوڑھا ہو چکا ہو اور اس میں گھومنے کی صلاحیت نہ ہو مگر اسے اپنی گاڑی سے محبت ہو اور اس کے لیے وہ ہر ممکن صورتحال میں بس چل رہا ہو۔

لو یٹری کے دروازے سے پشت جوڑ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ دھڑکن کو اعتدال پر لانا بہت ضروری تھا اور یہ تب ہی ممکن تھا جب وہ کوئی خوبصورت خیال دماغ میں لاتی اور یہ خوبصورت خیال شاہ جہاں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

وہ بھی گرمیوں کی ایک سہ پہر تھی۔ تین یا چار بجے کا وقت تھا۔ وہ پچھلے لان میں آم کے درخت کے نیچے پینگیں لے رہی تھی۔ سب کزنز کو ان کی مائیں اس وقت سلا لیتی تھیں۔ محض وہی جاگتی تھی۔ اس لیے، کہ وہ یہ پینگیں صرف اس صورت لے سکتی تھی جب سارے کزنز سو رہے ہوں۔

وہ دونوں رسیاں پکڑے جھول رہی تھی جب اِس نے غیر ارادی طور پر سر اوپر اٹھایا۔ درخت پر پرندے بیٹھنے آتے رہتے تھے۔ ان کی چہچہانے کی آوازیں اسے آ رہی تھیں۔ اوپر کسی ٹہنی میں، اس نے کچھ کچے آم یعنی کیریاں دیکھیں، کسی کسی شاخ سے وہ لگی تھیں۔ اسے یاد آیا، ان کیریوں کا ماگودا بنا کر ہاٹ پاٹ (ایک کورین کھانا) میں ڈالتی تھیں یا پھر اس کو رامن میں مکس کر دیتی یا پھر اس کی کم چی (کورین اچار) ڈال لیتیں۔ وہ کٹھا، ترش، مرچیلا اور چٹخارے دار ذائقہ اس کی زبان کے سرے تک پانی کی صورت میں بہہ آیا تھا۔

وہ پینگ روک کر یک ٹک اس کیری کو دیکھنے لگی جو بہت کھٹی نظر آ رہی تھی پھر اس نے ٹہنی سے، شاہ ٹہنی، شاہ ٹہنی سے تنے، تنے سے نیچے گھاس تک نظر دوڑائی۔

وہ یقیناً اسے توڑ سکتی تھی۔ ابھی سب سو رہے تھے۔ وہ اسے توڑ کر، کچن میں جا کر اس کو کاٹ کر، اس پر ساسز ڈال کر اس سے لطف اندوز ہو سکتی تھی۔ اس کے شرارتی ذہن میں ایک دم سارا منصوبہ تیار ہو گیا اور اگلے ہی پل، وہ پینگ چھوڑ کر اٹھی۔ تنے کی طرف بڑھی۔ تنا موٹا تھا لیکن اس میں جگہ جگہ بھدے اُبھار تھے جیسے برادی خلیے غلط جگہ چکرا کر اکھٹے ہو گئے ہوں۔ وہ احتیاط سے ان اُبھاروں پر پیر رکھتی گئی۔

تنے سے شاہ ٹہنی تک پہنچ کر وہ اُس کے اوپر بیٹھ گئی پھر کمال مہارت اور احتیاط سے وہ ٹہنی درٹہنی پکڑ کر سرکنے لگی۔ منھ اور بازوؤں پر مسلسل پتے، نوکدار شاخیں لگ رہی تھیں۔ اپنی متعلقہ ٹہنی تک پہنچ کر اس نے دھیرے سے ہاتھ آگے بڑھایا اور کیری کو زور سے کھینچ کر الگ کر لیا۔ اسے نیچے پھینکنے کے بعد وہ اور کیریاں توڑ رہی تھی جب اسے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔

وہ جو ٹہنیوں سے الجھ رہی تھی، رُک گئی۔ دھیرے سے اُس نے نیچے دیکھا۔ شاہ جہاں اُسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں وہاں دیکھ رہا تھا۔ وہ بری طرح بوکھلا گئی اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کی ہاتھ سے کیری چھوٹ کر عین شاہ جہاں کے سر پہ جا لگی۔ وہ سر پہ ہاتھ رکھ کے تیزی سے اوپر دیکھا۔ وہ پتوں میں گھری ہوئی تھی۔

"یا اللہ....." وہ سٹپٹا کے تنے کے قریب آیا۔ "یانگ شی! اوپر کیا کر رہی ہو؟ تم ہوش میں ہو؟"

"آم.....توڑ رہی ہوں....." وہ اُردو میں بولی۔ اب تک وہ اچھی خاصی اُردو سیکھ چکی تھی۔

"آم تمہارے توڑنے کے لائق رہ گئے تھے؟ اگر گر گئی تو؟ نیچے اُترو فوراً بلکہ رکو.....رکو وہیں.....میں آتا ہوں..... ہلنا نہیں....." وہ اب اُنہی ابھاروں پر اپنے بوٹ رکھ کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوپر آیا۔ خود کو ایک محفوظ جگہ پر مضبوطی سے کھڑا کر کے اس

نے غزار کی طرف بازو بڑھائے۔

''دھیان سے میری طرف آؤ، پہلے مجھے ہاتھ دو اپنے.....'' وہ بولا۔ غزار نے اپنے بازو پھیلائے جس پر شاہ جہاں نے اسے تحویل میں لیا پھر اسے آہستہ سے قریب کیا یوں کہ وہ اوپری ٹہنی سے اُتر کر اس کی گود میں آ گئی۔ حسبِ عادت غزار نے اس کی گردن کے گرد بازو ڈال لیے۔

اب شاہ جہاں ایک بازو اس کے گرد لپیٹے، دوسرے سے اسے اُتارنے کا انتظام کر رہا تھا۔ وہ V شکل کے تنے کے درمیان کھڑا تھا۔ نیچے گھاس دور تھی چھ فٹ دور، شاہ جہاں کود سکتا تھا لیکن غزار نہیں۔ اس لیے وہ اب کسی ایسے سہارے کی تلاش میں تھا جسے پکڑ کر وہ کچھ فٹ غزار اسمیت نیچے آ سکے۔

غزار نے سر پیچھے کیا۔ اسی لمحے شاہجہاں نے نادانستہ ایک سانس چھوڑا۔

''شاہ.....''

''چپ.....اس وقت بکواس نہیں کرنی.....'' اس نے آنکھیں دکھائیں۔

''آپ نے سگریٹ پی ہے ناں؟'' وہ ناک چٹکی میں پکڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

شاہجہاں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اس چھوٹی لڑکی کو دیکھا۔

''آپ کے منہ سے بو آ رہی ہے۔''

شاہ جہاں نے فوراً سختی سے لب چپکا لیے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی پی کر آیا تھا۔ حق ہا.....اس نے برش نہیں کیا تھا۔ صرف چیونگ گم کھائی تھی۔ سانسوں کی بو، چیونگ گم سے تھوڑے ہی جاتی ہے۔

''میں ماموں کو بتاؤں گی۔'' اب وہ اسے بلیک میل کر رہی تھی۔

شاہ جہاں نے لعنت بھیجی اس لمحے پر جب وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اس طرف آیا تھا۔

وہ اسے بالکونی سے دیکھ رہا تھا۔ایک لمحے کے لیے اس کا دھیان فون میں لگا کہ وہ غائب ہوگئی حالانکہ پینگ بدستور جھول رہی تھی۔اس نے یہاں وہاں دیکھا پھر اسے تشویش ہوئی تو اسے دیکھنے چلا آیا۔اب وہ اس لمحے پر بری طرح پچھتا رہا تھا۔

''تم ایسا کچھ نہیں کروگی.....'' وہ اسے ڈرانے لگا۔

''کروں گی۔آپ نے کل ہوم روک پر مجھے کیوں ڈانٹا تھا جب کہ میری غلطی بھی نہیں تھی؟ وہ تو لائبہ نے گند مچایا تھا کاپی پہ۔'' اس نے اپنی کلاس فیلو کا نام لیا جس نے غصے سے کاپی پر پین سے کاٹے ڈالے تھے۔

''جو بھی ہے یانگ شی۔تم ایسا کچھ نہیں کروگی۔اگر ایسا کیا تو.....''

''تو؟'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے غزارا نے اُچک لی۔

''تو.....'' وہ جیسے سوچنے لگا کہ وہ اس ننھی بچی کے ساتھ کیا ہی کر لے گا؟ وہ اس کا کیا ہی بگاڑ سکتا تھا؟ وہ نوخیز نوجوانی میں تھا جہاں والدین لڑکے اولاد کے لیے اسی سطح پر فکرمند ہوتے ہیں کہ کہیں وہ نشے وغیرہ میں نہ پڑ جائیں اور خوش قسمتی سے سب کا چہیتا اس میں پڑ چکا تھا۔

''آپ پرامس کریں آپ سموکنگ نہیں کریں گے..... پھر میں نہیں بتاؤں گی.....'' بلا آخر اس نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا کیوں کہ وہ جو بھی تھا، شاہ جہاں کو فکرمند نہیں دیکھ سکتی تھی۔

'I am not a chain smoker,got it'۔تم بابا کو کچھ نہیں بتاؤ گی اگر تم چاہتی ہو کہ ہم دوست رہیں ورنہ تو میں ابھی دوستی توڑنے لگا ہوں۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے دھمکی دے رہا تھا۔غزارا کو جیسے یہ شرط بری لگی۔بہت بری لیکن وہ اس کا سودا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے شاہ۔آپ جتنے چاہیں سگریٹ پئیں۔میں ماموں کو نہیں

بتاؤں گی۔'' اس نے یقین دلایا۔ شاہجہاں نے سر ہلایا کہ یہی درست رہے گا۔

وہ اس وقت محض ساڑھے چھ سال کی تھی اور یہ چھوٹی سی شرارت کافی تھی، اسے اچھا محسوس کرانے کے لیے۔

باتھ روم کے دروازے سے پشت لگائے، وہ موہوم سی مسکرادی۔

دھڑکن ٹھیک ہوچکی تھی۔ اِس کو سکون آگیا تھا۔ وہ واپس اپنی سیٹ پر آگئی۔ معدہ خالی ہونے کے سبب، وہ قدرے اچھا محسوس کررہی تھی۔ رات بہت بیت چکی تھی۔ وہ کمبل کھینچ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

جب اُس کی آنکھ کھلی، مسافروں کو ناشتہ سرو کیا جارہا تھا۔ اس کے حصے کی ٹرے، اس کی سیٹ کے آگے بنے فولڈنگ ٹیبل پر دھری تھی۔ وہ آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھی۔ جہاز کی کھڑکی سے سورج کی روشنی چھن کر آرہی تھی۔ جہاز میں انڈے، بریڈ اور چاکلیٹ کی ملی جُلی مہک تھی۔ منھ چلنے کی آوازیں اور دھیمی دھیمی گفتگو کی بھنبھناہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

''صبح بخیر شہزادی.....'' بوڑھی خاتون نے اسے خوشگوار مسکراہٹ سے دیکھا۔ وہ اور اس کا شوہر دونوں ناشتہ کررہے تھے۔☆

''صبح بخیر.....'' وہ بھاری آواز میں بولی اور کمبل اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

''تمہارا ناشتہ سامنے پڑا ہے۔ کرلو.....'' بزرگ نے اِشارے سے کہا۔ اس نے سر ہلادیا۔

پہلے اُس نے پانی کی بوتل نکالی اور پانی پیا پھر ناشتے کی ٹرے سے پلاسٹک کی شیٹ اُتارنے لگی جو اس پر تحفظ کے لیے چڑھائی گئی تھی۔ ناشتے میں چائے، پراٹھا، کروسانٹ، کچھ

بیک کیک اور جوس تھے۔ ہا..... چاول نہیں تھے۔

کوریا تین چیزوں کے بغیر نامکمل ہے..... کم چی، رامین اور چاول..... خیر اس نے دل برا کر کے چند ایک چیزیں کھولنا شروع کیں۔ رات کی قے کی سبب معدے بالکل خالی ہو چکا تھا اور ویسے بھی وہ پاکستان پہنچ چکی تھی۔ اب بس اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اُترنا تھا۔ ساڑھے گیارہ گھنٹے کی فلائٹ میں نو گھنٹے ہو چکے تھے۔

''تم نے مجھے کمبل اوڑھایا تھا رات کو؟'' بوڑھی خاتون پوچھ رہی تھی۔

اس نے منہ میں کروسانٹ ڈالنے سے قبل اُنھیں دیکھا پھر سر ہلا دیا۔

''جی..... آپ کو ٹھنڈ نہ لگ جائے اس لیے.....''

خاتون کے چہرے پر نرم سا تاثر آیا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''کونسے والا؟ کورین یا پاکستانی؟''

''اردو تو اچھی بول رہی ہو۔ پاکستانی نام ہی بتا دو۔''

''غزارا.....''

''ماشاءاللہ.....'' انھوں نے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ ''بہت پیارا نام ہے۔ کس نے رکھا؟''

''شاہ نے.....'' وہ تیزی سے بولی پھر یکدم احساس ہوا کہ جیسے کچھ غلط بول گئی ہو۔ ''میرا مطلب شاہ جہاں نے۔''

''شاہ جہاں.....'' خاتون نے زیرلب دہرایا۔ ''کون ہے؟ بھائی ہے تمہارا؟''

''استغفراللہ.....'' وہ بے اختیار بولی۔

خاتون ہنس دی۔ بزرگ بھی مسکرانے لگے۔

وہ جھینپتے ہوئے سر جھکا کر چائے پینے لگی جو اسے ذرا اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن سوکھے

کروسانٹ کو کسی اور طرح کھایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ دونوں بزرگ ناشتہ کر چکے تھے۔ کچرا ائیر ہوسٹس لے گئی تھی۔ اب وہ پرسکون سے ٹیک لگائے ہوئے تھے جہاں سورج کی مدھر کرنیں اُن کی گودوں میں گر رہی تھیں۔

''ہم سمجھ گئے تھے.....'' کچھ دیر بعد بزرگ نے کہا۔ اس نے گردن گھما کر ان کو دیکھا جو دور کسی غیر مرئی نکتے کو تک رہے تھے۔ ''کبھی ہم بھی یہ کہا کرتے تھے۔ محبت کی پہلی شرط ہی یہی ہے کہ محبوب کو اس رشتے سے منسوب نہ کیا جائے گا جہاں آپ اُس کا بدن نہ چوم سکتے ہوں.....''

غزارا کے گلے میں کروسانٹ اٹک گیا۔ وہ بے ساختہ کھانسی پھر جلدی سے چائے کا بڑا گھونٹ لیا۔

خاتون اب مرد کا ہاتھ تھامے، اُس کی پشت پر انگلی پھیر رہی تھی۔ جھری زدہ ہاتھوں میں شریانیں سانپوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد خاتون نے کچھ نہیں کہا، وہ خاموش ہی رہے۔

اسے یاد آیا یہ نام کیسے رکھا گیا تھا۔

جب وہ کوریا سے آئی تھی تب اِس کا نام محض Young-shi-He تھا۔ ثمن اِس کو یانگ شی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ پاکستان میں بھی اس کا یہی نام پڑ گیا۔ بعد ازاں جب شاہجہاں اس کی رجسٹریشن بحیثیت پاکستانی شہری کرانے کے لیے نادرا لے گیا تھا، تو وہاں انھوں نے اس کا پاکستانی نام پوچھا تھا۔ جس پر شاہجہاں ننھی سی یانگ شی کو گود میں بٹھائے کشمکش میں آ گیا تھا کہ اُس کا کیا نام رکھا جائے۔ ثمن بھی ساتھ تھی، وہ بضد تھی کہ یانگ شی ہی ٹھیک ہے مگر پاکستانی شہری کی حیثیت سے اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اُس کا

تبدیلی نام لازمی تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس کچھ نہ سوجھا کیوں کہ جو معروف نام تھے وہ سب ہی اس کے کزنز کے ہو چکے تھے۔ وہ جو بھی نام سوچتا، سر جھٹک دیتا۔ ثمن بہت خفا سی بیٹھی تھی لیکن وہ بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ شاید یہ احساس بہت انوکھا ہے کہ آپ کسی کو باقاعدہ نام دیں۔ اس نے فون کھولا، یونہی سکرال کرتا رہا۔ انٹرنیٹ پر بھی نئے طرز کے نام نہیں تھے۔ یونہی چلتے چلتے اسے یکا یک اپنی دوست کا فون آیا جس کا نام ''زارا'' تھا۔ زارا سے بات چیت کے دوران، یونہی اس کے منہ سے غذ..... زارا نکل گیا۔ اس نے غور کیا تو فطرت سے چونک پڑا۔

''غزارا..... غزار.....''

کیسا رہے گا۔ اس نے فوراً اس کا مطلب تلاش کرایا۔

اس کا مطلب تھا۔ ''نوخیز، نوعمر۔''

اس نے یانگ شی کو دیکھا جو کونے میں کہیں کھیل رہی تھی، پھر مسکرا دیا۔ یہ نام قدرتاً اُس کے لیے اس پر الہام ہوا تھا۔ وہ اسے گود میں لیے آفیسر کے کمرے میں آیا۔

''تو کیا نام سوچا آپ نے؟'' آفیسر نے پوچھا۔

''غزارا.....'' اس نے بتایا۔ ثمن کو بھی یہ نام پسند آیا تھا۔ گو کہ وہ اسے یانگ شی ہی، عرف غزارا پکارنا زیادہ مناسب سمجھ رہی تھی لیکن پھر بھی پاکستانی نام غزارا بھی اچھا نام تھا۔

آفیسر نے نام لکھا پھر پوچھا۔

''سر نیم کیا ہوگا؟''

''جو اسکے فادر کا نام ہے۔ یانگ.....''

''شاہ.....'' غزارا نے دفعتاً گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے گھٹنوں کے درمیان

کھڑی تھی۔

''غزارا شاہ.....ٹھیک ہے۔'' آفیسر نے غزارا کو چھیڑا۔

''نہیں۔نہیں۔شاہ نہیں۔یانگ.....'' شاہجہاں نے تیزی سے کہا جس پر آفیسر مسکرا دیا۔ اس کا نام غزارا یانگ پڑا لیکن یانگ شی نے کبھی یانگ کا استعمال دو دفعہ نہیں کیا۔باپ کا نام کورین میں جوڑا اور شاہجہاں کا اُردو میں.....

وہ بھلے سے ہی غزارا یانگ تھی لیکن وہ غزارا شاہجہاں تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ حسبِ عادت اٹھ کے لیوٹری گئی۔ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کیے، ماؤتھ واش سے گلہ، زبان صاف کی پھر چہرہ دھو کر تین مختلف قسم کی سیرمز، موسرائزر اور ایک عدد لپ اسٹک لگائی یوں کہ قے کی وجہ سے جو منحوسیت اس کے چہرے پر آئی تھی، یکدم چمک میں بدل گئی۔

اس نے بالائی لباس تبدیل کیا۔سفید شرٹ کی بجائے، اس نے سرخ شرٹ پہنی، بال بنائے اور پرفیوم چھڑک کر باہر آ گئی۔چوں کہ فلائٹ لینڈ ہونے والی تھی اور یقیناً ائیر پورٹ پر شاہجہاں اسے لینے آیا ہوگا تو وہ بری نہیں لگنا چاہتی تھی۔

وہ ائیر پورٹ پر اسے پہچان پائے گی؟ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے پھرتی سے فون نکالا اور شاہجہاں کی تصویر دیکھنے لگی۔وہ اسے بھولی نہیں تھی مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ سب بھول گئی ہو۔کئی بار تصویر کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کے بعد اسے تسلی ہوگئی کہ یقیناً وہ اسے پہچان لے گی۔اس نے فون رکھ دیا۔

اب فلائٹ ائیر پورٹ پہ اُتر رہی تھی۔وہ کھڑکی سے باہر رن وے دیکھ سکتی تھی۔

وہ کیا لے کر آیا ہوگا؟ سرخ گلاب یا سفید کنول؟ نیلے گلِ لالہ یا پھر زرد گلِ نرگس؟ یہ سب

اُس کے پسندیدہ پھول تھے۔ یقیناً وہ استقبال کے لیے کوئی پھول لایا ہوگا، یعنی بکے، سیاہ ریپر میں لپٹا بکے۔

مگر وہ خود کیا پہن کر آیا ہوگا؟ ہمیشہ کی طرح آدھی آستینوں والی ٹی شرٹ اور ہم رنگ جوتے؟ یا پھر کوئی برانڈڈ کوٹ سوٹ؟ یا پھر کوئی جرسی شرٹ؟ آنکھوں پر گاگلز ہوں گے یا پھر پلین چہرہ ہوگا؟ بال کس سمت میں سیٹ کیے ہوں گے؟ دائیں یا بائیں۔ پہلے تو پیشانی پر بکھیر کر رکھتا تھا۔ کیا اس نے پرفیوم تو نہیں بدلہ ہوگا؟ کیا وہ ارمانی کا وہی پرفیوم استعمال کر رہا ہوگا جس کی ایک بوتل وہ خالی اور دوسری چرا کر لائی تھی؟ کیا وہ آج بھی عادتاً اپنا نچلا لب کاٹتا ہوگا یا پھر کیا وہ تاحال سیگریٹ پھانکتا ہوگا؟

جیسے جیسے جہاز نیچے جا رہا تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دل کو اس قدر نہیں دھڑکنا چاہیے۔ یہ اعتماد خراب کر دے گا۔ جوش پہ قابو رکھو لڑکی۔ اس نے خود کو ڈانٹا۔

☆.....☆.....☆

آدھے گھنٹے بعد وہ ٹرالی بیگ کھینچے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ اس کے ساتھ کئی مسافر تھے اور اس سے زیادہ ہجوم باہر لگا ہوا تھا جہاں لوگ اپنے پیاروں کو receive کرنے آئے ہوئے تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بھائی، کسی کے دوست۔

وہ چلتے چلتے درمیان میں رُک گئی۔ ایک بیگ کمر پہ پہنے، دوسرے کو ہینڈل سے تھامے، وہ ہر اُس فرد کو دیکھنے لگی جو وہاں آیا ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے ہر چہرہ دیکھا، بورڈز دیکھے، پھولوں والے پہ خصوصی نظر گئی۔ سب اِسے سرسری نظر سے دیکھ رہے تھے۔

پہلے تو وہ پرجوشی سے مسکرا رہی تھی پھر کافی دیر بعد اسے کوئی نظر نہیں آیا تو مسکراہٹ مدھم

ہونے لگی۔ ایک ایک کر کے لوگ اپنے پیاروں سے ملتے گئے، ہجوم ہٹتا گیا۔ بیس پچیس منٹ بعد وہاں گن کے کچھ لوگ رہ گئے۔ کیا اسے کوئی لینے نہیں آیا تھا؟ اِس نے تو فلائٹ کا وقت، جگہ سب بتا رکھا تھا پھر.....؟

یہی سوچتے ہوئے وہ یہاں وہاں دیکھ رہی تھی جب یونہی ایک مسکین سے آدمی پر نظر گئی۔ وہ بورڈ کو ٹیڑھا کر کے پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے آنکھیں چھوٹی کر کے اس بورڈ پر کچھ پڑھنا چاہا۔ بمشکل وہ.....غضا.....ا.....را..... پڑھ گئی۔ وہ اُردو میں لکھا تھا اور غلط لکھا تھا۔ پھر اس نے آدمی کو دیکھا۔ سفید یونیفارم، سر پہ ''نیوی والی کیپ'' تھکن سے جمائیاں لے رہا تھا۔ وہ کون تھا؟ اس کا کوئی کزن تو نہیں لگ رہا تھا۔

وہ قدرے اُلجھتے ہوئے قریب آئی اور اس سوئے آدمی کے منہ کے آگے ہاتھ جھلایا۔

''ہیلو.....میں غزارا۔''

آدمی جیسے سوئی چبھ کر اُچھلا تھا۔ ''اسلام علیکم میڈم.....'' فوراً بورڈ ٹھیک کیا۔ ٹوپی درست کی۔

''وعلیکم سلام.....تم کون؟''

''فیض دین.....میں ڈرائیور.....شاہ جہاں صاحب نے بھیجا ہے آپ کو لینے کے لیے.....''

وہ جلدی جلدی بولا۔ اس کے اٹھے شانے ڈھیلے ہو گئے، سارے ارمانوں پر پانی پڑ گیا۔

''آپ آئیں میرے ساتھ..... یہ سامان مجھے دیں.....'' ڈرائیور نے اُس کے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے اُس نے خود بخود چھوڑ دیا۔ تو اس نے ڈرائیور بھیجا تھا اِسے لینے.....

وہ بری طرح مایوس ہو گئی۔ شاہ خود کیوں نہیں آیا۔ وہ پندرہ سال بعد آئی تھی۔ اُسے خود آنا چاہیے تھا۔ ایسی بھی کیا نارسائی.....لوگ تو ماہ کے ماہ آنے والے رشتہ داروں کو بھی ٹولیوں کی صورت میں ریسیو کرنے جاتے ہیں وہ تو پھر پندرہ سال بعد آ رہی تھی۔ اتنا لمبا عرصہ پھر اکیلی

بھی تھی۔ آج اتوار بھی تھا۔ یقیناً وہ گھر ہوگا۔ بے مروتی کی حد نہیں ہوگئی کہ ایک ڈرائیور کو بھیج دیا۔ اس کے کزنوں کی فوج میں کسی کو اتنی زحمت نہیں ہوئی کہ ان میں سے کوئی آجاتا۔

شیشہ نیچے تھا۔ گاڑی اسلام آباد کی کشادہ سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ دونوں اطراف سبزہ ہی سبزہ تھا لیکن وہ اس قدر کڑھ رہی تھی کہ باہر کے نظارے جو پندرہ سال میں اتنے بدل گئے تھے کہ پہچانے نہیں جارہے تھے اس کا دل لبھا نہیں پا رہے تھے۔ نظریں تو سب ملاحظہ کر رہی تھیں لیکن دل کی نگاہیں اندھی ہوگئی تھیں۔ اس کا موڈ بہت خراب ہوگیا تھا۔

کچھ دیر گاڑی چلی پھر وہ ایسے علاقے میں داخل ہوگئے جس کے دونوں اطراف فاصلے فاصلے سے شاہانِ شان اور پر آسائش حویلیاں بنی تھیں۔ کچھ دیر اس کشادہ سڑک پر گاڑی چلتی رہی پھر کچھ ہی فرلانگ کے بعد وہ ایک سیاہ اور سنہرے امتزاج کے گیٹ کے آگے رُک گئی۔

ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ کچھ توقف سے گیٹ وا ہوا۔ گاڑی زن سے اندر آگئی۔ اب وہ ذرا جاگی تھی۔ اِس نے پلٹ کر شیشے کے پار سے دور جاتے گیٹ کو دیکھا پھر اس نے دائیں طرف نظر ڈالی، سر جھکا کر ونڈ اسکرین سے آگے دیکھا۔ وہ کچھ جز بز کا شکار ہوگئی۔ گاڑی رُکی تو وہ حیران حیران اُتری اور اطراف میں نظر دوڑائی۔

یہ کونسا راستہ تھا جہاں سے وہ داخل ہوئی تھی۔ یہ دروازہ یہاں تو نہیں تھا یہ تو..... اس نے اُس سمت دیکھا جہاں پندرہ سال قبل یہ تھا۔ اب وہاں اونچی فصیل تھی اور برگد کے درخت تھے۔

''یہ گیٹ یہاں تو نہیں تھا.....'' اس نے خود کو کہتے سُنا۔

''جی میڈم..... اس طرف نئی سڑک بنی تھی تو حویلی کا گیٹ پانچ سال پہلے بڑے صاحب نے اس طرف نصب کرادیا تھا۔'' ڈرائیور اس کا سامان ڈکی سے نکالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پہلے گیٹ حویلی کے عین سامنے تھا۔ گاڑی سیدھ میں چلتی مرکزی دروازے تک آتی تھی اور

اب ذرا بائیں طرف سے۔

ڈرائیور آگے چلا تو وہ بھی قدم اٹھائے عقب میں چلنے لگی۔ گردن بار بار چاروں اور مڑ رہی تھی۔ حویلی کا رنگ روغن بدل گیا تھا۔ لان کی گھاس، پھول، پودے، اینٹیں، دیواروں کا رنگ بھی تبدیل ہو گیا تھا یہاں تک کہ مرکزی دروازہ بھی..... یہی تو وہ جگہ تھی جہاں سے ماں کی ڈولی کو لوگ کندھے پر اٹھائے باہر نکلے تھے۔ وہ پانچ دس سیکنڈ وہاں کھڑی رہی..... پھر وہ اسے چھوتے ہوئے اندر آئی۔

اوپن لاؤنج ویسے ہی تھا جیسے پندرہ سال پہلے تھا۔ البتہ صوفے، سجاوٹیں، رنگ، قالین اور پوش بدل گئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا پہلے کی رنگا رنگی اب ''تھیم'' نے لے لی ہو۔ البتہ چیزیں جہاں تھیں، وہیں تھیں۔ جگہ تبدیل نہیں کی گئی تھی۔

لاؤنج میں تین خواتین صوفوں پر بیٹھی ہوئی تھیں اور دو خواتین فرش پر جن میں سے ایک صوفے پہ بیٹھی باوقار خاتون کی ٹانگیں دبا رہی تھی اور دوسری چائے بنا رہی تھی۔

لاؤنج کے فرش پر بیگ گھسیٹنے کی آواز سُن کر..... وہ تینوں چونکیں پھر یکدم الرٹ ہو گئیں..... ڈرائیور کے دس قدم پیچھے ایک لڑکی بیگ پیک کی اسٹریپس میں کندھوں کے قریب انگلیاں پھنسائے چلی آ رہی تھی..... بے دھیانی سے..... یہاں وہاں دیکھتی جیسے کسی بہت پرانی آثارِ قدیمہ والی حویلی میں آ گئی ہو اور فنِ تعمیر کا جائزہ لے رہی ہو۔

وہ تینوں اسے دیکھنے لگیں۔

بڑی ممانی (طاہرہ)..... عائشہ اور چھوٹی ممانی (روشنا)

''مہمان پہنچ گئی ہیں بیگم صاحبہ۔'' اُس کے بیگ کو ایک طرف کھڑا کر کے، ڈرائیور مؤدب انداز میں بولا۔ اُس کے خطابت پر غزارا بھی جیسے دھیان میں آئی تھی۔ وہ جہاں

تھی، وہیں رُک گئی۔

تینوں کی نظریں کسی اسکینگ مشین کی طرح اُس کے نیچے سے اوپر تک گھومنے لگیں۔

سرخ و سفید جاگرز، سیاہ جینز پر سرخ ٹی شرٹ پہنے، جیکٹ کو پیچھے سے کولہوں کے گرد باندھے، بیگ پیک کے ساتھ وہ لڑکی غزارا یانگ تھی..... یانگ شی تھی..... سفید بالکل دودھ جیسی (کوریا کی اسکن)، دہرے پپوٹوں والی آنکھیں، سیدھی ابرو، چھوٹے مگر بھرے بھرے گلابی ہونٹ، گول چہرہ، ماتھے پر کانوں کے اطراف میں بکھرے بال جو پورے سیاہ تھے۔ وہ حسین تھی..... بے حد حسین.....

جب کہ وہ یوں کھڑی تھی جیسے چوری کرتی پکڑی گئی ہو۔

''بیگم صاحبہ میں جاؤں.....'' ڈرائیور نے سب کا سکتہ توڑا۔

طاہرہ بیگم نے محض ہاتھ سے اِشارہ کیا۔ اُن کی نظریں غزارا کی ہنگامہ خیز جوانی پر تھیں جو یوں نکھر کر سامنے آئی تھی جیسے بارش سے دھلا ہوا آسمان..... کچھ تھا جس کی باریک سوئی اُن کے اندر چبھی تھی۔

ڈرائیور کے جانے کے بعد غزارا چھوٹے چھوٹے قدم لیتی ہوئی قریب آئی۔

''سلام ممانی.....'' وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ ذرا سا جھک گئی۔ آنکھوں میں بے پناہ اپنائیت تھی۔ عائشہ اور روشنا سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

کسی نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔

''صدف.....'' طاہرہ بیگم نے فرش پہ بیٹھی ملازمہ کا نام لیا۔ ''مہمان کا سامان اُس کے کمرے میں چھوڑ کر آؤ.....'' وہ بے حد خشک لہجے میں بولی تھیں۔ صدف اٹھی، اس کے بیگ کی سمت ہاتھ بڑھایا۔

''کیسے ہیں آپ لوگ؟ آپ عائشہ آپی ہیں ناں؟ میں نے پہچان لیا۔ آپ کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہوں۔'' عائشہ نے ٹھنک کے جواب دیا۔

''اور آپ ..... آپ .....'' اس نے روشنا کو دیکھا۔ بڑے بال، شاطر آنکھیں اور استہزائیہ تاثرات۔ ''آپ شاید.....'' وہ ننھی پیشانی بھینچ کر یاد کرنے لگی۔

''دماغ پر زور مت ڈالو لڑکی ..... کمرے میں جاؤ.....'' طاہرہ بیگم نے رکھائی سے کہا۔ وہ چونکی پھر بری طرح شرمسار ہوگئی۔

''جی .....'' اس نے ایک نگاہ عائشہ، روشنا پر ڈالی پھر زبردستی مسکراتی ہوئی صدف کے پیچھے مڑ گئی اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب تک کہ وہ بالائی منزل پر اوجھل نہیں ہوگئی، تینوں کی نظروں نے اُس کا تعاقب کیا تھا یہ بھولتے ہوئے کہ ملازمہ طاہرہ کے آگے کب سے چائے کی پیالی پکڑے ہوئے ہے۔

''عفت کو فون کرو..... اُسے بتاؤ کہ ضد ختم کرے ورنہ جو طوفان آیا ہے، وہ سب تہس نہس کردے گا۔'' طاہرہ بیگم تا حال بالائی راہداری کو دیکھ رہی تھیں۔

''کیا چیز بن کر نکلی ہے یہ لڑکی۔ چلتا پھرتا بارودی بم ہے۔ یہ تو کسی کی بھی جان لے سکتی ہے۔'' عائشہ نے جاتے حواسوں کے ساتھ تبصرہ کیا۔ طاہرہ بیگم نے گردن موڑی اور ملازمہ سے چائے پکڑ لی۔

''اللہ خیر کرے میرے بچے پر.....'' ان کی آنکھوں میں خوف تھا۔

''خیر تو اب نہیں ہوگا بھابھی بیگم.....'' روشنا نے چسکی لیتے ہوئے پراسرار انداز میں کہا۔ ''آپ جانتی ہیں وہ کیوں لوٹ کر آئی ہے۔ پندرہ سال پہلے اُس نے شاہ جہاں سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ یاد ہے؟''

طاہرہ بیگم کی آنکھوں میں وہ منظر لہرایا۔

بی جان (دادی) بچوں کی منگنیوں کے معاملات طے کر رہی تھیں۔ سب بڑے بی جان کے کمرے میں تھے۔ دروازہ بند تھا جب کہ غزارا دروازے سے کان لگائے سُن رہی تھی۔ کسی کو علم نہیں تھا اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے سوائے غزارا کے۔

بی جان شاہ جہاں کا رشتہ حمنہ سے..... عالم شاہ کا (شاہ جہاں کا بڑا بھائی) تیسری ممانی کی بیٹی روبا سے..... عمران (حمنہ کا بڑا بھائی) کا رشتہ تیسری ممانی کی بیٹی (رابی سے جو روبا کی جڑواں تھی) اور تیسری ممانی کے بیٹے سمیر کا رشتہ مرحا سے طے کرنے کی بات ہو رہی تھی۔ سب خاموشی سے سُن رہے تھے۔ سب راضی بھی تھے۔

بی جان ابھی حمنہ اور شاہ جہاں کی بات کر رہی تھیں جب یکدم کمرے کا دروازہ کھلا اور غزارا کمر پر ہاتھ رکھے دھندناتے ہوئے اندر آئی۔

''شاہ صرف میرا ہے۔ اُس سے میں شادی کروں گی۔ حمنہ نہیں۔ سمجھے آپ لوگ۔'' وہ اتنی بے باکی سے بولی کہ سب نے ایک دوسرے کو شرم سے دیکھا پھر اتنی ہی تیزی سے سب نے نظریں چرائیں۔

''یہاں سے جاؤ بے شرم لڑکی..... کوئی تمیز ہی نہیں ان خنزیر خوروں میں.....'' بڑے ماموں تلخی سے بولے۔

وہ نہیں گئی، البتہ دو قدم اور قریب آئی۔

''ابھی میں چھوٹی ہوں لیکن میں جب بیس سال کی ہو جاؤں گی تب شاہ سے شادی کروں گی۔ وہ صرف میرے ہیں۔ آپ لوگ اُس کی شادی کسی اور سے بالکل نہیں کریں گے۔'' وہ سب کو ننھی اُنگلی دکھا کر وارن کر رہی تھی۔ بی جان ہکا بکا اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو دیکھ رہی تھی

جس کے بالائی دانت ٹوٹ چکے تھے اور کھوکھلا منہ یوں لے کر کھڑی تھی جیسے کہیں کی تھانیدارنی ہو۔

طاہرہ بیگم اٹھی، تیزی سے اُس کے پاس آئیں اور اس کو بازو سے پکڑا۔

''تم کہیں سے بھی چھوٹی نہیں ہو۔ وقت سے پہلے بڑی ہوگئی ہو۔ نکلو باہر.....'' اسے بازو سے گھسیٹتے ہوئے وہ باہر لائی اور راہداری میں پھینک دیا۔ وہ منہ کے بل گری اور جو اس کا نچلا دانت ہل رہا تھا، اُدھر ہی ٹوٹ گیا۔

''تم شاہ جہاں سے شادی کرو گی۔ میں ایک چھنال کی بیٹی کو بہو بناؤں گی؟ ایک ایسی عورت کی بیٹی کو جو کافر سے شادی کر گئی تھی؟ نہ بی بی۔ اتنے بھی پھوٹے کرم نہیں میرے بیٹے کے۔ کم از کم جب تک میں زندہ ہوں تم اس کے ہواؤں میں بھی نہیں آؤ گی۔'' وہ اس پر کڑواہٹ ڈال کر پلٹی ہی تھی کہ روشنا کو پیچھے کھڑے پایا۔

وہ غزارا کو کراہت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ اسی لائق ہے۔ چھنال کی اولاد۔'' وہ اس پر تھوک کے بولی۔ ''چلیں بھابھی۔ وقت سے پہلے جوان ہو رہی ہے یہ۔'' وہ طاہرہ بیگم کا ہاتھ تھامے آگے بڑھی جب پیچھے سے اُنھوں نے غزارا کی بلند بانگ آواز سنی۔

''شاہ صرف میرا ہے۔ میں اس سے شادی کروں گی۔ میرا وعدہ ہے۔''

دونوں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ وہ خون آلود منہ اور ٹھوڑی کے ساتھ، ہاتھ پہ ہاتھ رکھے خلفیہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ آج بھی وہ ولولہ، وہ سرخ خون اور وہ لڑکی طاہرہ بیگم کو یاد تھی۔ پیالی میں تیرتی چائے ٹھنڈی ہوگئی تھی لیکن ان کی انا کی آگ نے شعلہ پکڑ لیا تھا۔ چھٹانک بھر کی، وقت سے پہلے جوان ہونے والی لڑکی، اب ایک نوخیزہ باکرہ دوشیزہ تھی۔

”وہ اپنا وعدہ پورا کرنے آئی ہے بھابھی بیگم اور اس بار وہ چھٹانک بھر کی لڑکی نہیں ہے۔“
روشنا نے دبی مگر سراسیمہ سرگوشی کی۔ طاہرہ بیگم کے ان دیکھے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

اِس کو بالائی منزل پر بنا گیسٹ روم دیا گیا تھا۔ وہ کمرہ جو شاہ جہاں سے کوسوں دور تھا۔ بنیادی ضرورت کی ہر چیز یہاں موجود تھی لیکن وہ گرماہٹ جو گھر کے بندوں کے کمروں میں ہوتی ہے۔ وہ نہیں تھی۔ وہ بس ایک ہوٹل کا کمرہ لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اِسے جان بوجھ کر یہ کمرہ دیا گیا ہے تاکہ وہ شاہ جہاں کے کمرے تک جاتے ہوئے بیس اور کمروں کے سامنے سے گزرے..... حق ہا..... یہ لوگ بھی ناں.....

بیگ سے کپڑے اور سامان نکالتے ہوئے اس نے سرد سانس لیا۔

کم چی، اچار چٹنیاں، ساسز سب بحال تھا۔ کچھ ٹوٹا یا لیک نہیں تھا۔ اِس نے صدف نامی ملازمہ کو یہ سامان جلد از جلد فرج میں رکھنے کو کہا اور پھر باقی سامان نکالنے لگی۔ کپڑوں کو الماری میں ٹانگا، جوتے ریک پر رکھے، میک اپ کا سامان ڈریسنگ اور کتابیں وغیرہ اسٹڈی ٹیبل پر رکھیں۔ کچھ موم بتیاں وہ لائی تھی۔ اُنہیں جلا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہیں پر اپنا فون چارجر سے جوڑا پھر وہ کھڑکی کی طرف آئی۔ پردے سرکائے۔ ہلکی ہلکی روشنی اندر آئی۔ سورج دوسری طرف نکلا ہوا تھا۔

کھڑکی کے آگے پچھلا لان تھا جہاں اب آم کا درخت نہیں تھا۔ اس کی نگاہ جیسے ہی اُس خالی جگہ پر پڑی، اس نے بھونچکا کے ریلنگ کو پکڑ لیا۔ کئی بار پلکیں جھپکیں، کیا واقعی آم کا درخت نہیں تھا۔ اسے جیسے یقین نہ آیا۔

وہاں ایک مصنوعی جھولا تھا۔ بڑوں کا جھولا اور اس کے عین سامنے بڑا سا حوض تھا جس کی

نیلی سطح میں پانی نیلا ہی لگ رہا تھا۔ آس پاس سرخ اینٹوں کا پختہ فرش تھا جہاں سن لانگر لگے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ جگہ بالکل خالی تھی۔ کئی لمحوں تک وہاں گزارے لمحوں کو وہ یاد کرتی رہی پھر اس نے لمبا سانس نکالا اور پردے برابر کر دیے۔

وہ باقی سب سے بھی ملنا چاہتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اتوار ہے۔ کوئی بھی بارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھے گا، اس لیے اسے یہ چند گھنٹے خود بھی آرام کرنا چاہیے۔ صبح نو بجے کا وقت تھا۔ وہ ساڑھے گیارہ گھنٹے ہوا میں تھی۔ جسم مسلسل ایک پوزیشن میں ہونے کے سبب ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے شاور لیا، ڈھیلا سی ٹی شرٹ، ڈھیلا سا ٹراؤزر پہنا پھر بستر میں گھس گئی۔ موم بتیوں کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرے کی اجنبیت دور ہو گئی تھی۔ اب وہ اِسی کا کوئی حصہ لگ رہا تھا۔

کچھ دیر کمبل میں سانسیں لینے کے بعد وہ سو چکی تھی۔

اِس کی آنکھ شور سے کھلی۔ مختلف مردوں بچوں وغیرہ کا شور۔ بستر میں لیٹے لیٹے اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ آٹھ گھنٹے تک سوتی رہی تھی۔ اس نے جلدی سے کمبل پھینکا اور باہر نکلی۔

معدے میں تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ جہاز کے پھیکے ناشتے کے بعد اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور ابھی تک وہ کسی سے ملی بھی نہیں تھی۔ اب تک تو سب ویسے بھی جاگ گئے ہوں گے۔ اس نے سوچا اور جلدی جلدی کپڑے بدلے، بال بنائے، تھوڑا بہت چہرے پر کچھ لگایا اور ایک مفلر نما سٹالر گردن سے لٹکائے وہ نیچے آ گئی۔

اتفاقاً سب لاؤنج میں تھے اور چائے پی رہے تھے۔ اچھا خاصا ہجوم تھا۔ ہر صوفہ قریباً فل تھا۔ وہ سب کو دیکھ کے اُترنے لگی۔ ایک ایک چہرے کو۔

ابھی محض ایک نگاہ اس کی طرف اٹھی تھی۔ پھر کہنی سے کہنی ٹکرائی، اشارے ہوئے اور

آہستہ آہستہ سب اِس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اتنی ساری نظروں سے وہ بری طرح کنفیوز ہوگئی۔ نیچے تک آتے آتے وہ باقاعدہ لرزش میں آگئی تھی پھر جیسے ہی وہ صوفوں کے پاس آئی، قدرے جھجک گئی۔

''سلام.....'' اِس نے حسبِ عادت ذرا سا جھک کے کہا۔

جب تک وہ سیدھی ہوتی، کوئی جواب نہیں آیا۔ لڑکے، لڑکیاں، ہم عمر بڑے سب کوتاہ تھے۔ حیرت کے سمندر میں غرق..... طاہرہ، عائشہ اور روشنا البتہ پرسکون تھیں۔ وہ سحر اور حیرت کے اس منظر سے گزر چکی تھیں۔

''میں غزارا یانگ.....'' وہ تعارف کرانے لگی۔ ''ثمن اعجاز شاہ کی بیٹی جو پندرہ سال پہلے کوریا چلی گئی تھی۔''

کسی نے کوئی ردِعمل نہیں دیا۔

''اب بس بھی کرو سب..... پورا دن کوریا کے ڈراموں سے نکلتے نہیں ہو تم۔ یہ بھی وہی ہے بس اُردو بول رہی ہے۔'' طاہرہ بیگم نے جلن بھرے لہجے میں کہتے ہوئے پہلو بدلا۔ تب جا کے سب کے گرے جبڑے واپس کس گئے۔ وہ ایسے لوٹے تھے جیسے سحر ٹوٹ گیا ہو، یا رُکا ہوا وقت چل پڑا ہو۔

''ویلکم یانگ شی.....'' یہ خوبصورت آواز حلیمہ کی تھی۔ حلیمہ تیسری چچی کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی جو اس کی ہم عمر تھی۔

''شکریہ.....'' وہ اپنا کورین نام سن کر مسکرائی۔

اس کے بعد سارے کزنز اُس سے ملے۔ ایک ایک کر کے ہاتھ ملایا۔ تعارف کرایا۔ وہ تو دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جن کزنز کو خالی چہروں کے ساتھ چھوڑ کر گئی تھی۔ اُن کی کتنی گھنی داڑھیاں

اُگی ہیں۔ چھوٹی لڑکیاں، مرحا، روبا، رابی، سب کتنے بڑے ہوگئے تھے۔ عالم شاہ بھائی، سمیر اور عاطف اور بھی بہت بڑے بڑے لگ رہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ اُن کے بچے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو اس وقت روبا، رابی کی گود میں تھے۔

بچے جتنے بڑے ہوگئے تھے، اتنے ہی بڑے بوڑھے ہوگئے تھے۔ بڑے ماموں کے بال سارے سفید ہوگئے تھے۔ چہرہ مرجھا گیا تھا۔ جھریاں آگئی تھیں۔ تیسرے ماموں کے بال سرمئی تھے۔ چھوٹے ماموں البتہ ٹھیک تھے مگر فربہ ہوگئے تھے۔ دہری ٹھوڑی کی وجہ سے عجیب سے لگتے تھے۔

اسے سب ملے، جو اس کے وقت پیدا ہوچکے تھے وہ بھی اور اس کے جانے کے بعد پیدا ہوئے تھے وہ بھی لیکن اسے کئی لوگ نہیں بھی ملے لیکن وہ صرف دو لوگوں کے بارے میں متجسس تھی۔ بی جان اور شاہجہاں!

''بی جان کہاں ہیں؟'' اس نے اتنے ہجوم میں اُنھیں نہ پایا تھا۔ اس سوال پر لاؤنج میں خاموشی چھا گئی سوائے رابی کے بیٹے کے جو جانے کیوں رو رہا تھا۔ اس نے سب کے چہروں پر ایک اُداسی اور ملال دیکھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''بی جان کا چھ سال قبل انتقال ہوگیا تھا۔'' طاہرہ بیگم نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔

کچھ لمحے وہ سانس نہیں لے سکی۔ بی جان، یعنی اس کی نانی اب نہیں تھیں۔ وہ بے یقینی سے طاہرہ بیگم کو دیکھنے لگی جو مطمئن سی بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

''اُن کو ہارٹ اٹیک آیا تھا۔'' عالم شاہ بھائی نے کہا۔

اسے بے حد افسوس ہوا۔ بے حد۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر دعا پڑھی، ان کی روح کے

لیے ایصال کی پھر آنکھیں کھولیں۔ اب لاؤنج میں موجود لوگوں کے چہروں کا تناؤ جا چکا تھا۔ سب جیسے حال میں لوٹ آئے تھے۔

''ام..... وہ.....'' اس نے بے اختیار لٹ کان کے پیچھے کی۔ اِسے وہ بھی تو نظر نہیں آیا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ طاہرہ اور روشنا اس کا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔ سب جیسے منتظر تھے کہ وہ بات مکمل کرے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے یہاں وہاں دیکھا پھر قدرے گلا کھنکارا۔

''وہ..... شاہ..... نہیں نظر آ رہے؟''

''کیا اُس پہ لازم ہے کہ وہ تمہیں ہر وقت دکھے؟'' طاہرہ بیگم نے تیزی سے پوچھا۔

''جی؟''

''اسے بہت کام ہیں بی بی۔ اتنا فارغ نہیں کہ فضول لوگوں سے میل ملاقات کا وقت نکالے یا پھر ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے پھولوں کی مالائیں لے کر ہمہ وقت زرخرید غلاموں کی طرح پیچھے پیچھے لپکے۔'' طاہرہ بیگم نے چہرہ سے استہزاء انداز میں مکھی بھگائی۔ وہ یک ٹک اُنھیں دیکھنے لگی اور قریباً سب ہی بڑی ممانی کی چرب زبانی سے واقف تھے لیکن بی جان کے جانے کے بعد جو رُتبہ اُنھوں نے اپنا لیا تھا، وہ کسی بھی طور پر نا قابلِ مقابلہ تھا۔

''یعنی وہ گھر پر نہیں تھے۔'' وہ زیرِ منہ بڑبڑائی۔

''نہیں۔ اب تم بھی شکل گم کرو یہاں سے.....'' طاہرہ بیگم نے ہاتھ جھلایا۔

وہ اندر تک بجھ گئی۔ جلتا، چمکتا چہرہ یکدم تاریک ہو گیا۔ جو بھی تھا، یہ طے تھا کہ غزالہ اس گھر کے لوگوں کے دلوں میں کوئی مُقام نہیں بنا سکتی تھی۔ اس نے بے اختیار دل کو سہلایا تھا۔

''یانگ شی..... تم میرے ساتھ آؤ۔'' پھرتی سے حلیمہ اس کی طرف بڑھی اور اُس کو بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ باہر لے گئی۔ لاؤنج میں بیٹھا ہر شخص لاتعلقی سے چائے پی رہا تھا۔

''آخر کیوں آئی ہے یہ لڑکی؟'' تیسری ممانی تعجب سے بڑبڑائیں۔''بی جان تو اس کی ماں کو سالوں پہلے عاق کر چکی تھیں۔سوری عاق نہیں، disown پھر یہ یہاں کیا لینے آئی ہے؟'' وہ اُس راہداری کو دیکھ رہی تھیں جہاں وہ حلیمہ کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔

''شاہ جہاں کے لیے آئی ہے۔'' روشنا نے ہنس کر آنکھ دبائی۔

''شاہ جہاں.....مگر وہ تو.....''

'' جانے دیں بھابھی۔ خوش فہمیاں پالنے دیں۔ کیا ہوگا، زیادہ زیادہ ہم اُسے Enjoy کرلیں گے۔کیا آپ ہم سے یہ موقع چھیننا چاہتی ہیں؟'' روشنا نے شیطانی انداز میں پوچھا۔تیسری ممانی (کرن) نے سر جھٹک دیا۔

لاؤنج میں اب محض ٹھنڈک تھی۔

✿.....✿.....✿

(قسط نمبر: 2)

حلیمہ اسے پچھلے لان میں اُس جھولے تک لائی جس کو کچھ دیر پہلے اُس نے دیکھا تھا اور جہاں کبھی کوئی آم کا درخت ہوا کرتا تھا۔ صوفے پر بیٹھتے وقت اُس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ آنکھیں تاریک تھیں۔

سورج قدرے غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر رینگتے سحاب نارنجی سرخیوں کی غازہ پھیرے ہوئے تھے لیکن پھر بھی مدھم سی، سورج کی روشنی لکیر کی مانند لان کے ایک مخصوص حصہ پر پڑ رہی تھی۔ حویلی کا بیشتر حصہ چھاؤں میں آ گیا تھا اور اس کا سایہ لان کے سروں پر بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر طرف بس تاریکی چھانے والی تھی۔

حلیمہ اس کے ساتھ ذرا فاصلے پر بیٹھی تھی اور ہلکا ہلکا جھولا جھول رہی تھی۔

''کیا واقعی شاہ گھر پہ نہیں ہیں؟'' اس نے مایوس کن لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

''نہیں۔ تائی امی سچ کہہ رہی تھیں۔ شاہ بھائی کل رات سے کہیں گئے ہیں۔'' حلمیہ نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ دبلی سی لڑکی تھی۔ بال گھنگریالے تھے اور چہرے پر جا بجا frackles تھے۔ پتا نہیں مصنوعی تھے یا پھر اصلی۔

''کیا اُن کو نہیں پتا تھا کہ میں آ رہی ہوں۔'' وہ روشنی کی اُسی لکیر کو دیکھ رہی تھی۔

''پتا تھا۔ ان فیکٹ اُنھوں نے خود ایمبسی کا وہ لیٹر پڑھا تھا اور ہم سب کو کہا تھا کہ تم کب، کس فلائٹ سے آ رہی ہو۔''

''پھر بھی وہ خود نہیں رُکے میرے لیے.....'' اسے اور مایوسی ہوئی۔

''شاید ضروری کام ہے ہوا اُنھیں اور ویسے بھی تم نہیں جانتیں وہ کتنے robotic ہو گئے ہیں۔ سارا دن آفس میں ہوتے ہیں۔ رات کو واپس آتے ہیں اور فوراً کمرے میں گھس جاتے ہیں۔ ڈنر بھی نہیں کرتے۔ صبح سب کے ساتھ ناشتہ کرتے ہیں اور پھر وہی روٹین۔ ویک اینڈ پہ بھی گھر نہیں ہوتے۔ اِنھوں نے اپنی ویکنڈز بھی شیڈول کی ہوتی ہیں۔ اس لیے کم ہی اُن سے اُمید لگائی جا سکتی ہے کہ وہ گھر پہ ملیں گے.....'' حلیمہ نے سرد سانس لیتے ہوئے کہا۔

اُسے تھوڑے تسلی ہوئی۔ شاید اُسے واقعی کوئی ضروری کام ہو۔

''کب تک آئیں گے پھر وہ؟''

''پتا نہیں۔ آج رات یا پھر کل رات، لیکن جب بھی آئیں گے رات کو ہی آئیں گے۔ دن کو نہیں آتے۔'' حلیمہ نے وثوق سے بتایا۔ اُس نے افسردگی سے سر جھٹک دیا۔ انسان جس چیز کے لیے سب سے زیادہ پر جوش ہوتا ہے۔ وہی چیز، قسمت اُسے دینے میں تاخیر کرتی ہے۔

پچھلے لان میں اب دو تین کزن نکل آئے تھے جو سن لانگرز پر بیٹھ کر اونچا اونچا ہنس رہے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر غزالہ یکدم ٹھٹھک گئی۔

''منجھلی ممانی نظر نہیں آئیں اور حمنہ لوگ بھی..... کہیں گئے ہیں کیا؟''

حلیمہ کے لہجے میں ناگواری آئی۔ ''وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔ پانچ سال پہلے تایا ابو اور چچا کی لڑائی ہوئی تھی بی جان کے جانے کے بعد وہ بٹوارہ کرنا چاہتے تھے لیکن تایا ابو نہیں مانے، پھر انھوں نے تنگ آ کر چچا کا حصہ اُن کو دے دیا۔ وہ سب پانچ سال پہلے حویلی سے نکل گئے تھے۔''

''اوہ.....'' اسے اس پر بھی افسوس ہوا۔

''دفع کرواُن کو۔تم بتاؤ،تم کوریہ میں کہاں رہتی ہو؟''

''میں.....''

''میں پوچھتی ہوں.....سیوول، بوسان، اینڈونگ، جیون جی، جی جوسی، پوہانگ سی یا پھر.....''

''جی جوسی.....''

''جی جوسی۔آئی لینڈ ہے ناں۔آئی نو۔ایکچولی.....میں کوریہ کی بہت بڑی فین ہوں میں نے اسے حفظ کیا ہوا ہے۔'' وہ خفیف سے انداز میں گردن ڈال کر بولی۔غزارا محض مسکرادی۔ لان میں موجود باقی کزن زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے جو بہت نامناسب لگ رہے تھے۔

''اچھا بتاؤ ناں۔کوریہ کیسا ہے؟ کیا ویسا ہی ہے جیسے ڈراموں میں ہوتا ہے؟''

''ڈراموں میں کیسا ہوتا ہے؟''

''بہت پیارا، بہت خوبصورت.....'' وہ چمک کے بولی۔

''ایسا ہی ہے۔''

''سچ میں؟ تم نے کون کون سے شہر دیکھے ہیں؟ کیا تم سیول گئی ہو؟ تم نے این سیول ٹاور دیکھا ہے؟ ہان دریا پر کسی کروز میں بیٹھی ہو؟ کیا تم آہو پسن جنگل گئی ہو جہاں King: Eternal Monarch شوٹ کی گئی تھی؟'' وہ بہت بیتابی سے پوچھ رہی تھی۔

''کوریہ دراصل.....''

''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کیا تم کسی کورین ایکٹر یا ایکٹریس سے ملی ہو یا پھر کسی آئیڈول سے؟ کسی کو قریب سے دیکھا ہے؟ کیا تم نے کن سیویون، جی چیین ووک، لی من ہو کو دیکھا

ہے؟ یا پھر وی، جان کِک کسی سے ملی ہو؟ بتاؤ ناں چپ کیوں ہو؟'' وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

وہ ہنسنے لگی۔

''کوریہ بہت چھوٹا ملک ہے حلیمہ..... صرف پانچ کروڑ لوگ رہتے ہیں وہاں۔ جب سے وہ نارتھ کوریہ سے الگ ہوا ہے، اُس کی زمین اور لوگ بہت محدود ہو گئے ہیں۔ اس لیے شہر بھی چھوٹے ہیں پھر ہمارا معیشت بہت اچھی ہے اس لیے قریباً سب سے بڑے شہروں میں رہ لیتے ہیں۔ ایسے میں کہیں نہ کہیں کسی مال، کسی ریستوران، کسی میٹ اینڈ گریٹ یا پھر کسی شو میں ان ایکٹرز یا ایکسٹرسز سے ملاقات ہو جاتی ہے۔''

''یعنی تم ملی ہو سب سے؟'' اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

''سب سے نہیں۔ چند ایک سے.....''

''کس کس سے؟ بتاؤ.....'' وہ غزارا کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اُس کی آنکھوں کے ذریعے اُس منظر میں چلی جائے گی جہاں وہ ان سٹارز سے کبھی ملی تھی۔

''ام.....'' وہ حویلی کی قامت کو دیکھتے ہوئے یاد کرنے لگی۔ ''کم وو بن، لی جون سوک، سانگ جون کی، او کے تائی یون، لی من ہو، گونگ یو.....اور..... لی ڈان ووک.....''

''تم ان سب سے ملی ہو؟'' وہ ناقابلِ یقین انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں۔''

''میں کیسے مانوں؟ کیا تم نے اُن کے ساتھ تصویر لی ہے؟''

''ہاں۔ آٹوگراف بھی لیے ہیں۔''

''کیا تم مجھے وہ دکھا سکتی ہو؟'' وہ بے حد اوتاؤلی ہوئی۔

''ابھی نہیں۔ ابھی سارا سامان نہیں کھولا۔''

''جب کھولوگی تو مجھے فوراً دکھانی ہیں ٹھیک ہے؟'' اس نے حکم سادیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ مدھم سی مسکرائی اور پیر گھاس سے اٹھا کر جھولا لینے لگی۔ آسمان سے سرخی غائب ہوگئی تھی۔ اب نیلگوں اندھیرا اُتر رہا تھا۔ لان سے وہ والے کزن چلے گئے تھے۔ صرف مالی بابا تھے جو سن لانگرز کو اندر لے کر جا رہے تھے۔

''کیا تم کسی آئیڈول سے نہیں ملی ہو؟'' حلیمہ نے پھر پوچھا۔

''ہاں۔ بلیک پنک کی ساری لڑکیوں سے ملی ہوں.....''

''اور بی ٹی ایس؟ میں v کی بہت بڑی فین ہوں۔ میں نے اپنا پورا کمرہ اس کے پوسٹرز سے سجایا ہے۔ میرے پاس اس کے ہر سولو گانے اور گروپ کے گانوں کی سی ڈیز ہیں۔ میرے پاس سب کچھ ہی بی ٹی ایس پرنٹ کا ہے۔ یہ دیکھو.....'' اس نے اپنی شرٹ کی طرف اشارہ کیا جس پر بی ٹی ایس کے سات لڑکوں کی سفیدی والی تصویر چسپاں تھی۔

غزار نے اس کی مداحیت کو سراہتے ہوئے سر ہلایا۔

''میں ان سب سے ملی ہوں۔ انھوں نے سیول میں میٹ گریٹ رکھی تھی۔ وہیں پر سب سے ملاقات ہوئی۔''

''سچی؟ او مائی گاڈ۔ کیسے لگتے ہیں وہ قریب سے؟ تم نے کتنا قریب سے دیکھا؟''

''ایک فٹ کا فاصلہ ہوگا۔ وہ میز کی دوسری طرف تھے، میں دوسری طرف۔ تم نے دیکھا تو ہوگا، اُن کے میٹ اینڈ گریٹ کو۔ بس ویسے ہی۔''

(کوریا کے پاپ اسٹارز اس طرز کی ملاقات صرف کورین شہریوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ باقی کسی کے ساتھ نہیں۔)

''کیسے لگتے ہیں؟'' اس نے سوال کا بقیہ حصہ دہرایا۔

''اوں.....اچھے ہیں۔بہتر ہیں۔''اس نے ملا جلا تبصرہ کیا۔

''کیا مطلب؟اچھے ہیں۔کیا تمہیں اچھے نہیں لگے تھے؟''اسے جیسے غصہ آیا۔بھلا جان کک اور وی کسی کو برے لگ سکتے ہیں؟

''نہیں۔میرا مطلب وہ چارم نہیں اِن میں جو.....''کہتے کہتے وہ رُک گئی۔

''جیسے؟''حلیمہ اس کو منتظر نظروں سے دیکھنے لگی۔

وہ دھیمی سی مسکرائی۔''جیسے شاہ میں ہے۔اُس کے looks میں ہے۔''

حلیمہ رج کے بدمزہ ہوئی۔''کم آن۔کہاں شاہ جہاں بھائی اور کہاں کم تھائی یانگ(V).....''

''اے.....''غزارا نے انتباہیہ انداز میں گھورا۔''اگر چاہتی ہو کہ میں تمہیں اُن کے آٹوگراف اور تصویریں دکھاؤں تو شاہ کے بارے میں کوئی غلط تبصرہ نہیں کرنا۔وہ جیسے ہیں، اُن جیسا کوئی نہیں۔سمجھیں.....''

اگر وہ مذاق کرتی تو حلیمہ اسے مزید چھیڑ دیتی لیکن وہ مذاق نہیں کر رہی تھی۔وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھی۔بے ساختہ حلیمہ نے سر ہلا دیا۔

شاہ سے نہ ملنے کی وجہ سے اُسی کی جاگتی بھوک سو گئی تھی پھر حلیمہ کے بے چین اور پے در پے سوالات نے اُسے بھلا دیا کہ وہ کچھ کھانے نیچے آئی تھی۔اب یونہی، بے وقت کچھ کھانے کو نہیں مانگ سکتی تھی۔اس لیے اس نے ڈنر کا انتظار کیا جو ساڑھے آٹھ بجے لگ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سب لمبی مستطیل میز کے چاروں اور بیٹھے تھے۔ایک سرے پر بڑے ماموں تھے اور دوسرے سرے پر طاہرہ بیگم۔بائیں اور دائیں قطار میں جو جہاں جی چاہا، بیٹھ جاتا تھا۔وہ بھی

ایک کرسی پر براجمان تھی۔ اس کے سامنے والی کرسی پر حلیمہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میز پر کھانے چُنے گئے تھے۔ بریانی، کباب، نہاری، مچھلی وغیرہ..... اس نے اپنے لیے بریانی نکالی جو اس نے بچپن میں پاکستان میں رہتے وقت کھائی تھی پھر نہیں.....

سب اُس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ جانے وہ پاکستانی کھانا کھا کر کیا ریکشن دے۔ اس کے دائیں بائیں رابی اور روبا بیٹھی تھیں۔ میز پر چمچ پلیٹوں اور چبانے کی آوازیں تھیں۔

وہ چاولوں کی پلیٹ کو دیکھ رہی تھی جس میں نارنجی، سرخ، سفید چاول پڑا تھا۔

''کھاؤ..... یہ تو موسٹ فینس پاکستانی ڈش ہے۔'' روبا نے اسے مخاطب کیا۔ وہ پھیکی سی مسکرائی اور ذرا ہچکچاتے ہوئے ایک چمچ منہ میں رکھا۔ بریانی بہت اچھی تھی۔ اسے مزے دار لگی۔ اس نے اب سکون سے کھانا شروع کر دیا تھا لیکن جیسے ہی اس نے سلاد کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ ٹھٹک گئی۔

''حلیمہ.....!'' اس نے جیسے اعلانیہ انداز میں نام لیا۔

''ہوں؟'' اس نے چونک کے سر اٹھایا۔

''میں کوریا سے کم چی لائی تھی۔ یانگ منی نے بنا کر دی تھی۔ فرج میں رکھی ہوگی۔ جاؤ لے آؤ۔''

''کم چی؟'' بھرے ہوئے منہ کے ساتھ حلیمہ نے بمشکل کہا۔ ''تم واقعی کم چی لائی ہو؟''

''ہاں۔''

اُس نے نوالہ پورا یونہی نگل لیا اور کرسی دھکیل کر تیزی سے اُٹھی اور پچھلی راہداری میں غائب ہوگئی جب واپس آئی تو ہاتھ میں نیلے ڈھکن والا ایک ٹرانسپیرنٹ باکس تھا جسے اس نے کھول رکھا تھا اور کانٹے کم چی سے کھاتی ہوئی آ رہی تھی۔

''I swear میں نے پہلے اتنی بہترین کم چی نہیں کھائی تھی۔'' وہ قریب آنے پر دل گرفتہ انداز میں بولی۔

''ہمیں بھی دو.....'' کسی کزن کی آواز آئی۔

''اے ہے نہیں.....'' کرن ممانی نے اپنے بیٹے کو ٹہوکا دیا۔ ''اس میں وہ وہ ہوتا ہے.....''

''وہ کیا؟'' ابرار نہیں سمجھا تھا۔

''وہی جو اسلام میں حرام ہے۔'' انھوں نے کان کی لوؤں کو چھوا۔ غزارا نے چونک کر اُنھیں دیکھا۔ حلیمہ کا منھ کو جاتا لٹس کے پتوں سے بھرا کا نٹا رُک گیا۔

''آپ کا مطلب پگ؟''

''اس میں پگ نہیں ہے۔ پگ تو گوشت ہے۔ کم چی میں گوشت نہیں ہوتا۔'' غزارا نے رسان سے کہا۔

''exactly.....'' حلیمہ نے اطمینان سے سر ہلایا اور پتے منھ میں ڈال لیے۔

''میں شراب کی بات کر رہی ہوں۔'' کرن ممانی نے توضیح کی۔

حلیمہ کا منھ پھر رُک گیا۔ بچارگی سے غزارا کو دیکھا۔

''نہیں۔ اس میں الکوہل بھی نہیں ہے ممانی جان۔ یہ اُس کے بغیر تیار ہوئی ہے۔ اس میں ہم نے الکوہل کا متبادل کچے آم اور انگور کا پیسٹ ڈالا ہے۔''

حلیمہ گہرا سانس لیا اور واپس کھانے لگی۔

''اب یہ بات ہم کیسے مانیں؟ تم لوگ کتے، بلیاں، چوہے کھانے والے لوگ ہو۔''

''ماما..... پلیز.....'' ابرار نے ناک میچی۔ ''ہم کھانا کھا رہے ہیں۔''

کرن بیگم نے سر جھٹک دیا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں یہ بالکل حلال ہے۔ آپ سب اِسے کھا سکتے ہیں۔'' اس نے اعلانیہ آگاہ کیا جس پر سب نے سوائے ممانیوں کے اپنی اپنی پلیٹ میں کم چی لے لی اور کھانے لگے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جو منھ کے ذائقے کو دوام بخشتی ہے۔ اس کا مرچیلا ذائقہ اور کھٹا جوس، انسان کی اشتہا کو تابناک کر دیتا ہے۔

وہ ڈبا موقع پر بھی ہی تمام ہو گیا۔ دوسرا ڈبا حلیمہ نے رکھ لیا اور سب کو warn کیا کہ کوئی اُسے ہاتھ نہ لگائے۔ جو بھی ایسا کرتے دیکھا گیا، وہ اپنی کسی قیمتی چیز کے ضیاع کا خود ذمہ دار ہوگا۔ جتنی وہ کرن کی چہیتی تھی، سب ہی جانتے تھے کہ اُس سے پنگا نہیں لینا۔

اس کے اٹھ کے چلے جانے کے بعد جب سب ہی قریباً چلے گئے۔ میز پر روشنا ممانی اور طاہرہ بیٹھی رہ گئیں۔ روشنا ذرا سی اُن کی طرف جھکی۔

''بھابھی شاہ جہاں کب تک آئے گا؟''

''کیوں؟'' وہ ٹھٹک گئیں۔

''ایسے ہی۔ وہ لڑکی بہت اوتاؤلی ہو رہی ہے۔ اس لیے۔ کیا آج رات اُس کی واپسی ہوگی؟''

''نہیں۔ آج آنا ہوتا تو اب تک آ جاتا۔ وہ صبح ہی آئے گا۔''

''مگر لگتا ہے یہ لڑکی اُس کے لیے رات بھر انتظار کرے گی۔''

''بالکل بھی نہیں۔ کوئی بھی کسی کے لیے رات نہیں جاگ کے انتظار نہیں کر سکتا۔''

''اس نے پندرہ سال انتظار کیا ہے بھابھی۔ ایک رات ہے ہی کیا اُس کے لیے۔''

طاہرہ بیگم کے دل پر گھونسہ پڑا۔ بات تو سچ تھی۔ پندرہ سال کہاں، کہاں ایک رات، محض چند گھنٹے۔

انھوں نے نیپ کن سے ہونٹ تھپتھپائے۔ ''جو بھی ہے۔ شاہ آج نہیں، کل آئے گا۔ اس نے بتایا تھا مجھے۔'' اور کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئیں۔ روشنا نے اُن جو جاتے ہوئے دیکھا پھر شیطانی انداز میں مُسکرائی۔

''آپ کا بیٹا جا چکا ہے بھابھی بیگم..... قُل پڑھ لیں.....'' اور ہنس پڑی۔

☆.....☆.....☆

کھانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اسے یاد آیا کہ یانگ منی کو فون کرنا تھا لیکن ابھی اِس کا اپنا samsung فون رجسٹر نہیں تھا اور نہ ہی پاکستانی سم تھی۔ گو کہ وہ پاکستانی شہری تھی لیکن اُس کا کارڈ ابھی نہیں بنا تھا۔

اس لیے وہ بادلِ نخواستہ حلیمہ کے پاس گئی تھی جہاں حلیمہ نے اسے اپنا ای میل اکاؤنٹ دیا جس سے اُس نے یانگ منی کو ای میل لکھی اور اپنے پہنچنے کا بتایا۔ حیرت کی بات تھی، جوابی میل فوراً موصول ہو گئی۔ یقیناً وہ فون کھولے اِسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے یانگ منی کو خود سے اس ای میل پر کوئی میل بھیجنے سے منع کر دیا۔ وہ شرابی، کچھ بھی لکھ سکتی تھی۔ اس لیے اس نے کہا کہ جب تک وہ ای میل نہ کرے، اسے ای میل نہ کی جائے پھر جیسے ہی وہ اپنا فون PTA سے رجسٹر کرا لے گی، سم لے گی تو اس سے اپنے فون پر رابطہ کرے گی۔

یانگ منی کا ''اوکے'' والا جواب آیا تو اس نے ای میلز ختم کر کے فون حلیمہ کو دے دیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے شاہ جہاں کی واپسی کا انتظار تھا۔ چوں کہ وہ ابھی سو کر اٹھی تھی تو نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ کتابیں لائی تھی، بیڈ پر ٹیک لگائے، وہی پڑھنے لگی۔ ساتھ کینڈل جل رہی تھیں۔

کئی گھنٹوں تک وہ مطالعہ کرتی رہی۔ بیچ بیچ میں وہ اٹھ کر راہداری میں بھی دیکھ آتی کہ

کہیں شاہ کی واپسی تو نہیں ہوئی۔ بدقسمتی سے پورچ دوسری طرف تھا، گاڑی کی آواز بھی نہیں آسکتی تھی۔

رات کا جانے کونسا پہر تھا، جب وہ راہداری دیکھنے نکل آئی۔ روشنیاں بند تھیں، کہیں کہیں دیوار میں نصب لیمپ جل رہے تھے۔ اُس لمحے اسے کوئی سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دیا۔ بازو پہ کوٹ، ہاتھ میں بریف کیس.....اس نے آنکھیں چندھیائیں اور پھر دل کی دھڑکن جیسے رُک گئی تھی۔

وہ شاہ جہاں ہی تھا.....

وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اِس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اسے دیکھ سکے۔ دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ میں گو کہ کتاب تھی لیکن پھر بھی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔ وہ چپ کے کھڑی رہیہ۔ دل پر ہاتھ رکھے پھر وہ آہستہ سے مڑی اور راہداری میں واپس دیکھا۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

یقیناً وہ کمرے میں جا چکا تھا۔

وہ سرعت سے اندر آئی اور کتاب ایک طرف پھینک کر ڈریسنگ روم کی طرف بھاگی۔ آئینے میں اپنا حلیہ دیکھا۔ اپنا سانس سونگھا لبوں پر بام لگایا۔ وہ فریش تھی۔

اُسے شاہ سے ملنا تھا۔

دبے قدموں سے باہر آئی۔ بلی کی چال چلتے، یہاں وہاں نگاہ ڈالتی وہ کئی کمروں کے سامنے سے گزری اور ایک لمبی راہداری عبور کی، مرکزی لابی کے دوسری رہداری کے عین درمیان شاہ کا کمرہ پڑتا تھا جس کی بالکونی سامنے والے لان میں کھلتی تھی، جہاں سے دور قطار اندر قطار گھر نظر آتے تھے۔

وہ چلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ پندرہ سال پہلے جب مرحا کمرے سے نکالتی تھی تب بھی وہ یونہی کسی زماں و مکاں کی پرواہ کے بغیر اس کے کمرے کی طرف چلی آتی تھی۔ نہ اندھیر راہداریوں سے خوف آتا تھا اور نہ کوئی تنہائی ڈراتی تھی۔ شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبوب کے ٹھکانے کی طرف بڑھنے والے قدموں کو کوئی وحشت نہیں ہوتی۔

دروازے کے آگے پہنچ کر وہ ایک لمحے کو رُکی۔ گہرا سانس چھوڑ کر ایک نظر آگے ڈالی ایک پیچھے ڈالی پھر انگلی کے جوڑ سے ہلکی سی دستک دی۔

دروازہ نہیں کھلا۔

اس نے دوبارہ دی پھر اسے یاد آیا کہ وہ کس طرح دستک دیا کرتی تھی۔ اس نے اُسی انداز سے دی۔ دھیمی دھیمی مگر مسلسل دستک جیسے وہ کوئی چیز ٹھوک رہی ہو۔

وہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلا تھا۔ سفید رنگ کی آدھی آستینوں والی ٹی شرٹ پہنے، ڈھیلا سا ہم رنگ ٹراؤزر۔ وہ تولیے سے بال خشک کر رہا تھا جب یہ دستک، کانوں میں پڑی اور پھر وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں پیچھے چلا گیا۔

پندرہ سال پیچھے.....

اس کا حلق جیسے خشک ہو گیا۔ تولیہ ایک طرف رکھ کے وہ چھوٹے چھوٹے اور خوفزدہ سے قدم لیتا دروازے کی طرف آیا۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے دروازے کے پار وہ نہیں کوئی اور غیر مرئی مخلوق ہو۔ ناب پر جب اس نے ہاتھ رکھے تو ہولے ہولے لرز رہے تھے لیکن اس ڈر سے کہ کہیں گھر والے جاگ نہ جائیں، اس نے ناب گھما دیا۔

کلک کی آواز اُبھری اور پردہ ٹوٹ گیا۔

اس کی پہلی نگاہ جھکی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ آج بھی ساڑھے تین فٹ کی غزارا ہو گی۔

لیکن وہاں غزارا نہیں تھی، جرابوں میں مقید، پٹی جوتوں والے پیر تھے پھر ڈھیلا ٹراؤزر اور پھر گھٹنوں سے شال شروع ہو رہی تھی اور جب تک کے وہ اسے مکمل دیکھتا، قدم تیزی سے آگے بڑھے اور پھر اسے سینے پر دھکا محسوس ہوا، وہ قدرے لڑکھڑا کر پیچھے ہوا، پھر اس نے ان قدموں کو اپنے کمرے میں دیکھا۔ اب وہ مڑ کر دروازہ بند کر رہے تھے۔

جیسے وہ پلٹے، اس نے دیکھنا چاہا لیکن وہ قدم بجلی سی تیزی سے آگے آئے اور دو قدم کے فاصلے پر رُک گئے۔ خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا۔ شاہجہاں میں سکت نہیں تھی کہ اُسے آنکھ اٹھا کے دیکھ لیتا۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور غزارا اُسے دیکھ رہی تھی۔

بڑھی ہوئی شیو۔ پہلے سے توانا جسم۔ لڑکپن والے لاابالے پن کی جگہ اب ایک مردانہ سنجیدگی تھی۔ شخصیت کو پُر کرنے والی سنجیدگی۔ وہ پہلو میں ہاتھ گرائے، مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ بالوں کے نم قطرے اُس کی شرٹ پر گر رہے تھے۔

''ایسا کون کرتا ہے شاہ۔'' کچھ دیر کے بعد اِسے غزارا کی آواز سُنائی دی۔ یہ آواز بچنا کھو چکی تھی۔ یہ آواز اب بچی کی نہیں۔ ایک لڑکی کی تھی مگر اس میں شامل کھنک۔ ہاں وہ کھنک اِسے یاد تھی۔

''اِتنی سرد مہری؟ محبوب سے پندرہ سال بعد ملاقات ہو رہی تو ملاقات کے وقت فرار نہیں ہوتے۔ کتنا مایوس کیا ہے آپ نے مجھے۔ وابستگی نہ سہی، لگاوٹ تو تھی ناں ہمارے درمیان پھر ایسی بے رُخی کیوں؟''

وہ دبے دبے غصے سے پوچھ رہی تھی۔

''کیا آپ نے مجھے یاد نہیں کیا تھا؟'' اب کمر پہ ہاتھ باندھ کے پوچھا۔

وہ اس بار بھی چپ ہی رہا۔

''آپ سے بات کر رہی ہوں۔ آپ شاہجہاں سلیمان ہیں ناں؟'' قریب آئی، چہرہ اٹھا کے اُسے دیکھا۔

شاہجہاں نے ہمت کی۔ پلکوں کو حرکت دی۔

''بتائیں مجھے۔ میرے شاہ ہی ناں آپ؟''

آنکھوں میں ایک عکس اُبھرا۔ جالوں سے بھرا عکس۔ دھندلا۔ مٹیالا۔

''کب سے بول رہی ہوں۔ سنائی دے رہا ہے؟''

عکس صاف ہونے لگا۔ جسم ایک شکل اختیار کرنے لگا۔ بال، شال، ہلتے لب اور ہاتھ۔

''شاہ؟'' وہ چہرے کے آگے ہاتھ جھلا رہی تھی۔

دوہرے پپوٹوں والی وہ لڑکی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ناک گلابی۔ ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ پندرہ سال پہلے وہ کوریا سے پاکستان آئی تھی۔ یہی دوہرے پپوٹے تھے۔ اوورسائز پینٹ شرٹ۔ ملائی سے نرم گال۔ وہ اس وقت بیس سال کا تھا اور یہ لڑکی اُسے دیکھ کے ماں کے، ڈر کے مارے ماں کے پیچھے چھپ جاتی تھی۔

''آپ کو میں یاد نہیں آتی تھی کیا؟ بتائیں ناں۔ کیا آپ اپنی یانگ شی کو بھول گئے تھے؟ اتنی جلدی، اتنی جلدی کون بھولتا ہے۔ میں تو نہیں بھولی ان پندرہ سالوں میں؟ دس سال سے پوچھا ہے میرا۔ ملے مجھ سے؟'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

''کسی کو یاد رکھنے کے لیے کیا ضروری ہے کہ اُسے بار بار ملا جائے؟'' شاہ جہاں نے خوشگواریت سے پوچھا۔

''تو پھر کیسے معلوم ہوگا کہ وہ یاد آ رہا تھا خصوصاً وہ جو وصل سے فرار ہو جائے؟'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

شاہجہاں زیرلب مسکرایا۔ ''میں فرار نہیں ہوا تھا۔ ایک ضروری میٹنگ تھی میری۔''

''مجھ سے بھی ضروری؟''

''نہیں۔ تم سے کچھ ضروری نہیں۔'' وہ مسکرا کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔

''پھر مجھے لینے کیوں نہیں آئے؟'' وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی جو سائیڈ ٹیبل کا دراز کھول رہا تھا۔

''آنا چاہتا تھا لیکن جس کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ تھی اُسے آج یو ایس نکلنا تھا۔ اس لیے نہیں آسکا.....'' وہ دراز سے کچھ نکال کر سیدھا ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پھولوں کا گلدستہ تھا۔ سیاہ کاغذ میں لپٹا، چار بڑے پھولوں کا بکے۔

''خوش آمدید.....'' وہ بکے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ پہلے تو وہ چونکی پھر مسکرانے لگی۔

''شکریہ۔'' بکے لیتے ہوئے وہ احتراماً جھکی۔

بکے میں اس کے پسندیدہ پھولوں کا ہر پھول تھا۔ اس نے ناک کے قریب لے کر سونگھا۔

''ڈونٹ وری۔ فریش ہیں۔ ابھی آتے وقت خریدے ہیں۔''

''آپ کو پتا تھا میں آپ کے آتے ہی آپ سے ملوں گی؟'' اس نے ناقابلِ اعتبار لہجے میں پوچھا۔ جب سے وہ آئی تھی اور جس مایوسی کا سامنا اُسے کرنا پڑا تھا۔ وہ یہ کم از کم expect نہیں کر سکتی تھی۔

''مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں تم دروازے میں نہ بیٹھی ہوں اور جیسا کہ تمہاری عادت ہے، بھاگ کر گلے لگنے لگی تو میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم کسی گولی کی طرح میرے گلے نہ لگ جاؤ اور اگر گھر والوں نے دیکھ لیا تو میں اپنی خفت کیسے چھپاؤں گا۔'' وہ پائنتی پر بیٹھ گیا اور گیلے بالوں

میں ہاتھ چلانے لگا جس سے قطرے اڑاڑ کر دائیں بائیں گرنے لگے۔

''اس لیے آپ رات کو آئے تا کہ سب سو رہے ہوں؟'' اس نے شرارت سے اُسے دیکھا۔

''ہاں۔ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل مجھے صبح آنا تھا۔ میں نے ماں کو بتایا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ یہ خطرناک ہوسکتا ہے۔ اس لیے رات کو ہی آ گیا۔''

''خطرناک کیسے؟'' وہ الجھی۔

''بھئی تم سب کے سامنے میرے گلے لگتیں، خطرناک نہیں تھا۔''

''مگر میں تو نہیں لگی۔ اب نہیں لگا کرتی گلے۔'' وہ فاصلے بناتے ہوئے اُس کے ساتھ بیٹھ گئی، پھول ایک طرف رکھ دیے۔

''کیوں؟'' شاہجہاں نے بے ساختہ پوچھا۔

''ام.....'' وہ سوچنے لگی پھر کچھ جواب بن نہیں پایا تو شانے اُچکا دیے۔ ''معلوم نہیں۔''

شاہجہاں نے گہرا سانس لیا۔ وہ سمجھدار ہو رہی تھی۔

''تم نے داڑھی کیوں رکھی ہے؟''

''کیوں بری لگ رہی ہے؟''

''نہیں تو۔ اچھی لگ رہی۔ میں نے کم ہی کوئی داڑھی والا مرد دیکھا ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''ہاں۔ کوریا میں مرد داڑھی جو نہیں رکھتے۔ میں نے اس لیے رکھی کہ میں رکھنا چاہتا تھا۔'' اس نے پھر سے بال رگڑے۔ ''میں سینتیس سال کا ہو چکا ہوں۔ یہ ایک بڑی عمر ہے۔''

کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ سائیڈ ٹیبل کا لیمپ جل رہا تھا جس کی روشنی ایک دائرے تک

محدود ہو رہی تھی۔

''ہاں..... کچھ لوگ بوڑھے ہو کر جوان رہتے ہیں اور کچھ جوان ہو کر بوڑھے.....'' اس نے بے ضرر سا تبصرہ کیا۔

''نہ میں جوان ہوں اور نہ میں بوڑھا پھر.....؟''

''آپ شاہ ہیں اور کیا.....'' وہ ہنس پڑی۔ ماحول بہت فسوں زدہ تھا۔ گہری پراسرار سرگوشی والا..... وہ ہونٹ چھپائے ہنس رہی تھی جس سے آنکھیں مزید چھوٹی ہو رہی تھیں..... شاہجہاں کو لگ رہا تھا وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گا۔

''فلائٹ کیسی رہی؟'' فسوں کو توڑتے ہوئے وہ سنبھل کے بولا۔

''اچھی تھی۔''

''یانگ منی اور تمہارے..... تمہارے بابا؟''

''ٹھیک تھے۔''

''رہا ہوئے؟''

''اونہوں..... ابھی پانچ سال رہتے ہیں۔'' اس نے سرد سانس کھینچا۔

''اوہ.....'' شاہ نے اُس کے تاسف میں اُس کا ساتھ دیا۔ ''ڈونٹ وری، جلد وہ باہر ہوں گے۔''

''پتا نہیں.....'' اس کے لہجے میں کرب تھا۔

''کیوں؟ ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟'' شاہجہاں نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''یانگ منی اور میں، اُن کی ضمانتوں کی درخواستیں، کمپنی کی منتیں ترلے اور عدالت کے چکر کاٹ کاٹ کر مر گئے ہیں۔ اتنا پیسہ خرچ کیا ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم دیکھو گے ناں

یانگ منی کو، تم یقین نہیں کرو گی کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ وہ بوڑھی ہو چکی ہے۔ بالکل ناکارہ..... اور..... شاید کہیں..... کہیں میں بھی.....''

اس نے بابا Idol تھے۔ آئیڈول کوریا میں گلوکار کو کہتے ہیں۔ جس طرح ایک رائٹر ایک اُشاعتی ادارے کے لیے لکھتا ہے۔ ایک ایکٹر ایک مخصوص پراڈکشن ہاؤس کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک مصور ایک خاص گیلری سے منسلک ہوتا ہے اسی طرح کوریا میں تمام گانے والے ایک کمپنی سے جڑے ہوتے ہیں۔ جیسے بی ٹی ایس ''بگ ہٹ'' اور بلیک پنک کی ''وائے جے'' ہے۔ اسی طرح غزارا کے والد یانگ ہو کی کمپنی کا نام ''سپر سٹے'' تھا۔ وہ ایک بینڈ کا حصہ تھے جس میں سب ہی گاتے تھے۔ یہ تین لوگوں پر مشتمل گروہ تھا۔ تینوں کو سپر سٹے پروموٹ اور لانچ کرتا تھا۔ کوریا میں ان کمپنیوں کے عجیب وغریب اصول ہوتے ہیں۔ یہ آپ کو آئیڈول تو بنا دیتے ہیں لیکن آپ کی ساری زندگی، جب تک آپ بینڈ کا حصہ ہیں یا پھر کمپنی سے جڑے ہیں، انہی کی اصولوں، ضابطوں اور قوانین کی نذر ہو جاتی ہے۔

وہ اصول کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے دن میں کتنی کیلوریز لینی ہیں۔ وہ بھی۔ یہ سب کمپنی ڈیسائیڈ کرتی ہے۔ آپ گرل فرینڈ رکھیں گے یا نہیں، سوشل میڈیا پہ کیسا تبصرہ ڈالیں، پرفامنس میں کونسے کپڑے پہنیں گے، کب میٹ اینڈ گریٹ کریں گے۔ بالوں کا رنگ کونسا ہوگا؟ کس برانڈ کے ساتھ کام کریں گے۔ شادی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ سب کچھ وہ طے کرتے ہیں۔ بدلے میں وہ آپ کو شہرت، پیسہ اور ایک نام دیتے ہیں۔ نا مٹنے والا نام.....

اس کے والد بھی ایسی ہی ایک ہٹ آئیڈول تھے پھر اُن کی زندگی میں ثمن یعنی غزارا کی ماں آئی جو سیول یونیورسٹی سے ایم بی اے کرنے گئی تھی۔ وہاں یانگ ہو کو میٹ اینڈ گریٹ کے لیے آنا تھا۔ یوں ایک مسلمان لڑکی سے، ایک کرسچن آئیڈول کو محبت ہوئی اور پھر وہ تباہ کن

مرحلے شروع ہو گئے جس نے یانگ ہو کو جیل اور ثمن کو قبر میں پہنچا دیا۔

کمپنی سے بغاوت، اسلام کی قبولیت، اچانک گلوکاری کو الوداع، فرار، اس سب کی آڑ میں یانگ ہو کو بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ اس کا بینڈ ٹوٹ گیا۔ گانے واش آؤٹ کیے گئے۔ کمپنی کا بڑا لاس ہوا تھا اور بے انتہا نفرت کا سامنا یانگ ہو کو کرنا پڑا۔ وہ ثمن کے ساتھ چند مہینے رہا تھا، ثمن کے والدین اور اس کے بھائی، اُس کی شادی پر راضی نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے پاکستان میں بھی جاہِ پناہ نہیں مل رہی تھی پھر اسے وطن سے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے کوریا کے قانون کا سامنا ہر حال میں کرنا تھا۔

اس نے قانون کے آگے خود کو پھینک دیا۔ خود کو محبت کی سزا دے ڈالی۔ وہ ثمن اور اس کے پیٹ میں پلنے والی غزارا کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جیل جانا، عدالت کا سامنا کرنا منتخب کیا۔ ثمن اُس کی ضمانت میں لگی رہی۔ اُس نے اخباروں، میڈیا یہاں تک کہ یو ایس ہیومن رائٹس سے رابطہ کیا جس کے مطابق ہر انسان اپنا مذہب، عقیدہ اور شادی کے لیے پارٹنر منتخب کرنے پر آزاد تھا لیکن یو ایس یہ کہہ کر پیچھے ہو گیا کہ آئیڈل کمپنی سے پندرہ سال کا کانٹریکٹ کر چکا ہے۔ اُسے نتائج بھگتنا تھے۔

وہ پاکستان بھائیوں کو فون کرتی رہی کہ اُس کی مدد کی جائے لیکن یہاں سرد مہری کی سرد مہری چھائی رہی۔ اُس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ اور یانگ منی دن رات چھوٹے چھوٹے کام کر کے پیسے کما رہی تھیں۔ بھائی کے لیے یانگ منی نے ہر بری لت چھوڑ دی۔ صرف کام کے آگے خود کو ڈال دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے کئی بریک اپس ہوئے۔

ثمن کی ساری جوانی، چند سالوں میں بہہ گئی۔ مسلسل محنت اور مشقت کی وجہ سے وہ بیمار ہو گئی۔ نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔ خوراک وقت پہ نہیں تھی اوپر سے اتنی پریشانی اور تنہائی۔ وہ

جھیل نہیں پائی۔ جب صبر جواب دے گیا، برداشت ختم ہوگئی۔ طاقت جاتی رہی، وہ پانچ سالہ غزارا کو لیے، گردوں کے المناک مرض میں مبتلا پاکستان آ گئی۔

اسے امید تھی کہ سات آٹھ سال کے فراق کے بعد اُس کی ماں، بھائی اسے گلے لگائیں گے۔ اُس کی لاغری کو سمجھیں گے، اُس کا علاج کریں گے۔ اُس کا سہارا بنیں گے لیکن یہاں کوریا سے بڑی دھتکار تھی۔ اس نے نہ صرف محبت کا جرم کیا تھا بلکہ ایک غیر مسلم سے محبت، پھر شادی اور پھر بچے کا جرم کیا تھا۔ یہ جرم پاکستان کے معاشرے میں ازل سے ناقابلِ قبول تھا۔

اسے کوئی سراہ نہیں ملی۔ کوئی سہارا نہیں ملا۔ وہ اور دھتکاری گئی۔ اس پر لعنت ملامت کی گئی اور پھر ایک رات وہ غشی میں گئی اور پھر کبھی نہیں لوٹی۔ اُس کے خراب گردے، فیل ہو کر اُس کی جان لے چکے تھے۔ اُس کی موت پر یانگ منی نہیں آ پائی تھی۔ اسے مقامی قبرستان میں دفنا دیا گیا اور ننھی غزارا تنہا رہ گئی۔ دو سال بعد یانگ منی آئی اور غزارا کو لے گئی۔ اب وہ پندرہ سال بعد بائیس سال کی نوجوان لڑکی بن کر آئی تھی۔

وہ چپ تھی، کئی لمحوں سے چپ۔ شاہجہاں نے اس خاموشی کو نہیں توڑا تھا۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے شاہ.....'' فرش پہ گرتی لیمپ کی روشنی کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اُن کو ہی ہمیشہ سزا کیوں ملتی ہے؟ محبت کرنا نہ جرم ہے اور نہ کوئی گناہ پھر تقدیر کیوں دو محبت کرنے والوں پر اس قدر نامہربان ہوتی ہے؟ جب ساری کائنات کی بنیاد ''محبت'' پر رکھی گئی ہے۔ جب ہر تعلق، ہر واسطہ محبت ہی محبت ہے تو پھر اتنی سفاکیت کیوں ہے؟ زمانہ، معاشرہ اور تقدیر؟ یہ دو پیار کرنے والوں کو کیوں نہیں ملاتی؟'' وہ گہرے شکوے سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اُداسی کے بادل تھے۔ ''کتنی

داستانیں ہم نے پڑھی ہیں۔ کبھی کوئی بھی عاشق محبوب کو خوشگوار اختتام نہیں ملا۔ دو محبت کرنے والوں کا اختتام اچھا کیوں نہیں ہوتا؟''

''محبت کی مختلف شرائط ہوتی ہیں یانگ شی۔ وہ ساری شرائط اُس کی بلندی کے درجے ہیں۔ سیڑھی کی طرح۔ اس کی کی آخری شرط یعنی آخری سیڑھی ''فنا'' ہونا ہے۔ جب تک یہ ساری شرطیں مکمل نہیں ہو جاتیں، محبت کو دوام یا ابدیت نہیں ملتی۔ محبت تب ابدی ہوتی ہے جب دو محبت کرنے والے کبھی نہ ملیں۔ ہر داستان اگر آج تک زندہ ہے تو اس لیے کہ دو محبت کرنے والے اُس میں کبھی نہیں ملے تھے۔ تاریخ محض اپنے برے واقعات سے یاد کی جاتی ہے۔ مؤرخ صرف بچھڑنے، فنا ہونے اور ٹوٹ کر زیزہ ریزہ ہونے کی داستان لکھتا ہے۔'' وہ بھی اسی آزردہ آواز میں بولا تھا۔

''لیکن کیوں؟'' اس نے دفعتاً سر اٹھایا۔ ''کیا یہ ظلم نہیں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''ہے تو۔ لیکن یہ اب شرط ہے۔ اور شرائط لازمی ہوتی ہیں۔'' اس نے سرد سانس کھینچا۔ غزارا کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ محبت سے نفرت کا تاثر۔

''کیا ثمن اور یانگ کی محبت کو ابدی کرنے کے لیے..... تقدیر نے یہ سارا کھیل رچایا ہے؟''

''ہاں..... شاید.....''

''کیا اُس کھیل میں غزارا یانگ کا کوئی نام ہے؟'' اس نے بھرائی ہوئی نظروں سے شاہ جہاں کو دیکھا۔ وہ ایک لمحے کو کچھ بول نہ سکا۔ ''کیا تقدیر کو میں یاد ہوں شاہ؟''

''تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟'' وہ یکدم پریشان ہو گیا۔

''کیوں نہ سوچوں..... کیا مجھے اپنی ماں اور باپ کی کہانی سے سبق نہیں سیکھنا چاہیے؟ کیا تقدیر مجھے اس کانٹوں بھرے راستے سے باز نہیں رکھ رہی؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں.....''

وہ کچھ پل اُسے دیکھتی رہی پھر اُس نے گہرا سانس لیا۔

''جانے دیں..... میرا انتخاب، میرا اپنا ہے۔ مجھ پر کسی کا کوئی زور نہیں۔''

''کیا ہوا ہے یانگ شی؟'' اس نے تشویش سے اسے دیکھا۔ ''مجھے بتاؤ۔''

وہ سیدھی ہوگئی۔ ''کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔ ماما پا کی لوو سٹوری بہت ہارٹ بریکنگ ہے اس لیے مجھے ہمیشہ اُداس کر دیتی ہے۔'' وہ آنکھ کا بھیگا گوشہ صاف کر رہی تھی۔

''ہوں.....'' شاہ جہاں نے سمجھ کر سر ہلایا۔

''پتا ہے شاہ میں تم تمہیں بہت یاد کیا۔ ہر وہ پل جس میں مجھے تکلیف ملی، میں نے ہر آہ میں تمہارا نام لیا۔ میں اور یانگ منی، سارا دن کام کر کے، جب رات کو کمرے میں اپنے اپنے بستروں پر لیٹتی تھیں تب ایک لمبی خاموشی ہوتی تھی ہمارے درمیان..... وہ کم سو کا نام لیتی تھی اور میں تمہارا..... ہمارے غم ایک جیسے نہیں تھے لیکن زخم ایک جیسے تھے۔ میں سوچتی تھی کہ میں کب تمہارے پاس آؤں گی۔ کب میری اتنی استطاعت ہوگی کہ میں یہاں آسکوں؟ تم نہیں جانتے میں نے بہت تکلیف اٹھائی ہے یہاں تک آتے آتے..... ایک اذیت گزاری ہے۔''

''میں محسوس کر سکتا ہوں۔'' وہ اسے مان دے رہا تھا۔ اسی لمحے دروازے کے باہر کچھ قدموں کی آواز آئی۔

''کوئی آرہا ہے۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''شش.....'' شاہجہاں کھڑا ہوگیا۔

قدم دروازے کے پاس ختم ہوگئے اور پھر ہلکی سی دستک ہوئی۔ غزارا بری طرح اُچھلی اور ہراساں انداز میں اُس کے پیچھے چھپ گئی۔

''ماں ہوں گی۔ چیک کرنے آئی ہوں گے۔'' وہ بے حد دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''اب.....؟'' اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

دستک تین دفعہ ہوئی پھر ختم ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے قدموں کی آواز دوبارہ پیدا ہوئی اور دھیرے دھیرے دور جاتے ہوئی سنائی دی۔ جب وہ نا سننے کی حد تک ختم ہوگئی، تو شاہ جہاں نے اُسے آہستہ سے عقب سے باہر نکالا۔

''ماں ہی تھیں۔ جب جب میں آتا ہوں۔ وہ اسی طرح آتی ہیں۔ تین دفعہ دستک دیتی ہیں۔ اگر میں نے دروازہ کھول دیا تو حال احوال پوچھتی ہیں، نہ کھولا تو چلی جاتی ہیں۔ وہ چلی گئی ہیں۔''

اس نے آنکھیں بند کر کے سکون کا سانس لیا۔

''اب تم جاؤ۔ بہت رات ہوگئی ہے۔''

''ہوں.....'' اس نے سر ہلایا اور چادر اچھی طرح اوڑھ کر بیڈ سے بکے اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

صبح وہ آفس نہیں گیا تھا۔ وہ دیر تک سویا رہا تھا۔ غزارا بھی لیٹ اٹھی تھی۔ آفس میں کام کرنے والے سبھی جا چکے تھے۔ سکول، کالجوں اور یونی ورسٹیوں والے بھی نکل گئے تھے۔ صرف بڑے ماموں کہ انھوں نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی گھر پہ تھے اور گھر کی خواتین۔ کرن ممانی البتہ منجھلی ممانی عفت کی طرف نکل گئی تھیں۔

قریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت شاہجہاں کچن میں تھا۔ میز پر بیٹھ کر وہ ناشتہ کر رہا تھا۔ سرمئی رنگ کی شرٹ پہ سیاہ ٹائی لگائی تھی۔ آستین کی کف موڑ رکھے تھے۔ اس کا سیاہ کوٹ ساتھ والی کرسی کی پشت پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنا پسندیدہ ناشتہ، پراٹھا اور scrambled egg اور چائے پی رہا تھا۔

ملازمہ چولہے کے پاس کھڑی، دودھ اُبال رہی تھی۔

اسی لمحے غزارا جمائیاں روکتی ہوئی کچن میں چلی آئی۔ نیوی بلیو پینٹ پہ، کریم رنگ کی ٹی شرٹ پہنے، بالوں کو پونی میں باندھے، وہ ایک لمحے دروازے کی چوکھٹ پر، گردن کی پشت تھامے کھڑی رہی پھر یکدم اُس کی نظر شاہجہاں کی پشت پر پڑی۔

وہ مسکراتے ہوئے قریب آئی اور شاہجہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ ''گڈ مارننگ.....''

ملازمہ نے دیدے پھاڑ کر اس لڑکی کی جرات کو دیکھا جو ادب آداب، عمر لحاظ بالائے طاق رکھے ایک غیر محرم کو چھو رہی تھی۔ شاہجہاں نے سٹپٹا کر پیالی نیچے رکھی اور تیزی سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔

''گڈ مارننگ.....'' قدرے خجالت اور شرمندگی سے اُسے قریبی کرسی پر بٹھا دیا۔

کچھ لمحے تو غزارا سمجھ نہیں پائی کہ اُس نے اتنے رکھائی سے اُس کے ہاتھ کیوں ہٹائے پھر دفعتاً اُس نے پیچھے کھڑی ملازمہ کو خود کو ناگواری سے گھورتے دیکھا۔ وہ بڑی ہی تپانے والی ادا سے مسکرائی۔

''تمہیں بھی صبح بخیر صدف.....'' اس نے قصداً اس کا نام لیا۔ صدف نے ''ہونہہ'' کر کے سر جھٹکا اور دودھ کے نیچے چولہا بند کر دیا۔ اس نے اپنے حصے کا تمام کام کر لیا تھا۔

غزارا کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''ابھی اٹھی ہو؟'' شاہ جہاں نے پوچھا۔

''جی.....''

''پھر تو ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔ صدف یا تنگ شی کے لیے ناشتہ بناؤ جلدی سے.....'' اس نے ملازمہ کو حکم صادر کیا جس پر وہ کچن سے نکلتے نکلتے رُکی۔

''صاب مجھے کوریے کے کھانے نہیں بنانے آتے۔'' اس نے جلدی سے بہانہ بنایا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں سکھا دوں گی۔'' وہ اسی جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اچھا بتاؤ کیا کھاؤ گی؟''

''کوریا میں ناشتے میں اُبلے چاول لیتے ہیں، بھونے ہوئے گوشت کے ساتھ جو ٹماٹر اور پیاز میں محض فرائی کیا گیا ہوتا ہے۔'' صدف پر نظر مرکوز کیے وہ رک رک کر کہہ رہی تھی۔ ''اور بیک کیے گئے کچھ ڈو ہوتے ہیں، جو ہم رس بیری جیم کے ساتھ لیتے ہیں اور کافی پیتے ہیں، کالی کافی۔''

''ٹھیک ہے۔ صدف اِس کے لیے یہ سب بنا دو۔''

صدف تلملا گئی۔ (کمینی کہیں کی)

''چکن یا مٹن؟'' شاہجہاں نے غزارا سے پوچھا۔

''سو.....ر.....'' صدف کہنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی غزارا نے چکن کہہ دیا تھا۔ اس نے ضبط آمیز سانس لیا اور گوشت نکالنے کے لیے فریزر کی طرف بڑھ گئی۔

''تم ابھی آفس جاؤ گے؟'' غزارا نے کوٹ کو استری خراب ہونے کے دھیان سے دوسری کرسی پر ڈال دیا۔

''ہوں۔'' اُس نے چائے کا گھونٹ لیا۔

''تم ماموں کے آفس میں کام کرتے ہو؟''

''ہاں۔''

وہ کچھ دیر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو پھنسائے، انگوٹھوں کو آپس میں لڑاتی رہی۔ فرائی پین پر گھی ڈلنے کی آواز آرہی تھی۔ ''کیسی کمپنی ہے؟''

''کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ ہم بڑی بڑی بلڈنگز بنانے کا ٹھیکہ لیتے ہیں۔''

''آپ ٹھیکے دار ہیں؟'' اسے اس شعبے کا کچھ علم نہیں تھا۔ اس لیے معصومیت سے پوچھا۔ شاہجہاں بے ساختہ مسکرایا۔

''نہیں میں سی ای او ہوں کمپنی کا۔''

''اوہ.....'' وہ نادم ہوئی۔ ''سوری.....''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ سہولت سے بولا۔

وہ پھر انگوٹھوں کو لڑانے لگی۔ تیز تیز.....

کچھ لمحے یونہی گزر گئے۔ شاہجہاں نے اُسے ایک دفعہ دیکھا، کچھ پوچھنا چاہا پھر توقف کیا۔ رسٹ واچ پر نظر ڈالی، ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ اس نے خالی کپ ایک طرف رکھ دیا اور پلیٹ پیچھے کر دی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے، انگوٹھے لڑا رہی تھی۔ اس نے نیپ کن سے ہونٹ تھپکے اور اسے ایک طرف رکھنے کے بعد اُسے دیکھنے لگا۔ وہ فکر مند نظر آرہی تھی۔ پیشانی پر ان دیکھے بل تھے۔ کچن کی کھڑکی سے آنے والی روشنی میں اُس کا بے داغ اور ملائی سا چمکتا چہرہ بہت خوبرو لگ رہا تھا۔

صدف اب گوشت میں مسالے ڈال رہی تھی۔ مرچوں کی خوشبو کچن میں پھیل رہی تھی۔

''یانگ شی.....'' اس نے آہستہ سے مخاطب کیا۔

''جی.....'' اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''تم یہاں.....میرا مطلب.....'' وہ ہچکچایا۔

''پاکستان کیوں آئی ہوں؟'' اس نے تیزی سے اُسے دیکھا۔ وہ جو الفاظ مول تول رہا تھا، سکتے میں آ گیا پھر اس نے سر جھٹکا اور خوشگوار انداز میں مسکرایا۔

''نہیں۔ وہ تو تم کبھی بھی آ سکتی ہو، یہ تمہارا گھر.....''

''نہیں ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ''میں یہاں کسی کام سے آئی ہوں۔''

صدف نے چولہا کم کر دیا تا کہ مسالوں کی کم آواز نکلے اور وہ آسانی سے دونوں کی باتیں سُن سکے۔ آخر کو تو وہ بھی ایک چاپلوس صفت انسان تھی۔ طاہرہ بیگم کی کن سوئی۔

''کس.....کس کام سے.....'' شاہجہاں نے محتاط انداز میں پوچھا۔ (دل دھڑکا تھا)

''بابا کو جو پانچ سال مزید قید کی سزا ہوئی ہے شاہ، وہ ایکسٹرا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ چونکا۔

''بابا کی سزا بیس سال قید تھی لیکن اب یہ پانچ سال مزید بڑھائی گئی ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''کمپنی کی مرضی۔'' وہ کرب سے ہنس پڑی۔

''لیکن یہ کیا بات ہوئی؟ وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟'' شاہجہاں کو طیش چڑھا۔

''کمپنی ذاتی مفاد نکال رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ ہم کچھ اماؤنٹ (اس نے فگر نہیں بتائی) بطور ہرجانہ جمع کریں گے تو ہی یہ سزا کم ہوگی۔ میں اور یانگ منی دن رات محنت کر کے یہ رقم جمع کر رہے تھے لیکن تم جانتے ہو کوریا کی کرنسی بہت گری ہوئی ہے۔ یہاں کے ہزار روپے اور وہاں کے پانچ ہزار کے برابر ہیں۔ اس لیے میں یہاں آ گئی کہ کچھ.....'' اس نے ناچاہتے

ہوئے بھی نظریں چرائیں۔ ”کچھ پیسے جمع کر سکوں تاکہ بابا یہ بلاوجہ کی سزا نہ کاٹیں.....“

”اوہ.....“ شاہجہاں کو دل سے برا لگا۔

”ہم یہ رقم قسطوں میں بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ کافی ..... مطلب اچھی خاصی رقم ہے۔“

”کتنی ہے۔ مجھے بتاؤ۔ میں دے دیتا ہوں۔“ اس نے فوراً پیش کش کی۔

”نہیں شاہ۔“ وہ درشتی سے بولی۔ ”پیسے میں خود کمانا چاہتی ہوں۔ تم سے لینے ہوتے تو میں پہلے ہی لے لیتی۔“

”لیکن تم کیسے کماؤ گی؟ تم مجھے بتا.....“

”میں جاب کروں گی۔“

”یانگ شی تم کیا کہہ رہی ہو؟ جاب اور تم؟“ اس نے بے یقینی سے کہا جس پر وہ اُس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

”آئی نو۔ میں نے پڑھائی نہیں کی تو جاب مشکل سے ملے گی لیکن شاہ تم میرے لیے کوئی جاب.....“

”ویٹ۔ کیا کہا؟“ وہ جیسے بھونچکا تھا۔

”میں نے پڑھائی نہیں کی.....“ اس کی آواز پست ہوگئی۔

”پڑھائی۔ سکول۔ تم سکول نہیں گئیں؟ ایک بھی کلاس، ایک بھی کلاس نہیں پڑھی یہاں سے جانے کے بعد؟“ وہ سکتے میں آ گیا تھا۔ غزارا نے دائیں بائیں سر ہلایا۔

”مگر کیوں؟“ وہ غصے سے بولا۔

صدف اب پلیٹ میں رکھے چاولوں پر گوشت ڈال رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اِدھر بھی کان کیا

ہوا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ غزالہ سر سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ ہاتھ اب گود میں تھے۔

''یانگ منی کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے شاہ کہ مجھے اسکول بھیج سکتی۔ بابا کے لیے وہ پہلے ہی دن رات کام کر رہی تھی۔ میں پہلے سال گئی تھی۔ چھ یا سات مہینے۔ اس کے بعد نہیں جا سکی۔''

''میں پانچ سال تک تمہیں خط لکھتا رہا، تم نے ایک دفعہ بھی مجھے بتانا گوارا کیوں نہیں کیا؟''

''یانگ منی نے منع کیا تھا۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں..... اُس سے پوچھیں۔''

''اب کیا پوچھوں اُس سے؟ کچھ رہ گیا پوچھنے کو؟''

''تو آپ مجھ پہ کیوں غصہ کر رہے ہیں؟ ہمارے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں نے نہیں پڑھا۔ بس۔'' وہ پھٹ پڑی اور تب ہی صدف نے پلیٹ اُس کے سامنے رکھ دی۔ وہ بڑی گول پلیٹ تھی جس پر درمیان میں گوشت کی بھونی ہوئی بوٹیاں رکھی تھیں۔

''چاول ہم لوگ پیالے میں کھاتے ہیں۔ پلیٹ میں نہیں.....'' اس نے صدف کو خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

''معذرت بی بی!'' وہ شرمندہ ہوگئی۔ ''میں اُس میں ڈال کے لاتی ہوں۔'' اس نے پلیٹ واپس اٹھالی۔

''اور یہ دونوں ایک دوسرے پر ڈلے نہیں ہوتے۔ دونوں الگ الگ باؤلز میں ہوتے ہیں اور پلیز مجھے چمچ نہیں، چاپ سٹک دیں۔'' وہ بے حد تلخی سے بولی۔ شاہجہاں اسے دانت

پیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''پڑھائی نہیں کی۔ پڑھائی کی۔ پیٹ کے لالے پڑے تھے پڑھائی نہیں کی.....'' وہ انگوٹھوں کو واپس لڑاتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ اس وقت سخت تشویش کا شکار تھی۔

''ہم اس معاملے پر شام میں بات کریں گے یانگ شی.....'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے انگوٹھے روک کر اُسے دیکھا۔ ''کس معاملے پر؟''

''تمہاری پڑھائی پر.....''

''پڑھائی پر کیا بات؟''

''تم پہلے پڑھائی مکمل کرو گی۔ اس کے بعد باقی سب دیکھیں گے۔''

''کیا تم مجھے بائیس سال کی عمر میں سکول بھیجو گے۔'' وہ ہنس پڑی۔

''نہیں، مگر میں ضرور چاہوں گا کہ تم کچھ پڑھ لو۔'' وہ کرسی کی طرف بڑھا، اپنا کوٹ اٹھا کر بازو پر ڈالا۔

''میں ابھی پڑھنا نہیں کمانا چاہتی ہوں۔''

''اُس کے لیے تمہیں پڑھنا پڑے گا۔'' وہ باور کراتے ہوئے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ گومگو۔ پرسوچ انداز جب تک کہ صدف اُس کے لیے دو پیالے لے آئی۔ جیسے ہی اُس نے غزارا کے سامنے رکھے۔ وہ جھٹ سے کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی اور باہر چلی گئی۔

شاہجہاں پورچ میں کھڑی گاڑی میں بریف کیس رکھ رہا تھا۔ وہ جب موڑ ہوتا تو گاڑی خود ڈرائیور کرتا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ دور لان میں کرسیوں پر طاہرہ بیگم، بڑے ماموں، روشنا بیٹھے ہوئے تھے۔

''میں پڑھائی نہیں کروں گی شاہ.....'' اس نے دو قدم دور رُک کر رکھائی سے اعلان کیا۔

وہ جو گاڑی کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ ناگواری سے مڑا۔

''جاب پڑھائی کے بغیر ممکن نہیں ہے یانگ شی.....اچھے پیسوں والی جاب کے لیے کچھ آنا اہم ہے۔''

''مجھے پڑھائی کے بغیر والے کام آتے ہیں۔ مجھے اُردو پڑھنی آتی ہے۔ ایک سٹور پہ کام کرتے وقت تھوڑی بہت انگریزی بھی سیکھی تھی اور کورین تو ساری آتی ہے۔ بولنی بھی لکھنی بھی..... میں اچھی ٹرانسلیٹر ہوں۔ مجھے کورین کزین بنانی آتی ہے۔ میں بائیک چلا کر ڈیلیوری کر سکتی ہوں۔ کال سینٹر میں بھی کام کیا تھا اور تھوڑی بہت نرسنگ بھی آتی ہے۔ تم مجھے کوئی بھی جاب دلاؤ گے تو میں خوب محنت سے کروں گی۔''

''یہ لیبر ورک ہے یانگ شی۔ اس سے تم کتنا کما لو گی؟ مہینے کے چند ایک ہزار۔''

''میں دن میں تین تین جابز کرتی تھی۔ یہاں بھی کروں گی۔''

''یہاں دن میں صرف دو ہی شفٹوں میں کام ہوتا ہے۔ صبح شام۔ کوریہ کی طرح یہاں گھنٹوں کے حساب سے اجرت نہیں ملتی۔ شفٹ کے حساب سے ملتی ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے آگاہ کیا۔

وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی پھر اس نے نم سانس کھینچا۔

''میں نے خود کو ایک سال کا وقت دیا ہے شاہ۔ صرف ایک سال میں، میں نے بہت محنت کرنی ہے۔ اتنی محنت کہ بابا پانچ سال کی قید سے بچ سکیں۔ آپ سمجھیں اس بات کو۔ میرے پاس..... میرے پاس پڑھائی کا وقت نہیں.....''

شاہجہاں اُس کی بھرائی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

''شاہ ہم لوگ، ہم لوگ ایک اچھا وکیل بھی نہیں کر سکتیں تا کہ اُس کمپنی کو عدالت میں چیلنج کر سکیں۔ میں اتنی رقم جمع کرنا چاہتی ہوں تا کہ بابا کا کیس عدالت میں لے جاؤں، مجھے علم ہے، کمپنی سے ہم نہیں جیت سکتے، لیکن مجھے یہ بھی بھروسہ ہے کہ عدالت یہ رقم کم کر دے گی۔''

''اس میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں یانگ شی، تم پلیز.....''

''کتنی بار کہوں؟ میں خود کماؤں گی، اپنے ہاتھوں سے۔ سمجھیں اس بات کو۔'' وہ جس مضبوط لہجے میں بولی تھی، شاہ جہاں کچھ نہیں کہہ سکا۔ غزارا کی آنکھوں میں التجا تھی جس میں بے بسی تھی اور ایک ایسی اٹل ضد تھی جس سے وہ کسی بھی طور پر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہونے والی تھی۔

شاہجہاں نے شانے ڈھیلے چھوڑ دیے۔

''ٹھیک ہے۔ میں اپنی کمپنی میں تمہارے لیے کوئی جاب ڈھونڈتا ہوں۔''

''تم کنسٹرکشن کا کام کرتے ہو۔ میرے لائق وہاں کوئی کام نہیں۔ میں وہ کام کرنا چاہتی ہوں۔ جو میں کر سکتی ہوں۔ جو میری خدمات کا پیسہ دے۔ میں احسان کی رقم نہیں لوں گی۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

شاہ جہاں بھونچکا گیا تھا۔ اُسے فوری رقم چاہیے تھی اور وہ رقم محنت و مشقت سے کمانا چاہتی ہے۔ فوری رقوم کس نے حلال طریقے سے کمائی ہیں؟

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' وہ سر جھٹک کے بولا۔

غزارا اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد اسی طرح اندر آ گئی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر گاڑی لے کر کر حویلی سے نکل گیا۔ دونوں کو اتنی دیر تک گفت و شنید کرتے ہوئے لان میں بیٹھے افراد نے دیکھا تھا۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ شاہ جہاں آج صبح آئے گا۔'' روشنا نے جتاتی نظروں سے طاہرہ بیگم کو دیکھا۔ ''یہاں تو میل ملاقات بھی ہو چکی ہے لیلہ مجنوں کی اور میں انتظار کر رہی ہوں کہ کب دونوں کا براہِ راست وصل دیکھوں گی۔''

طاہر بیگم نے پہلو بدلا۔ ''وہ رات بغیر بتائے آ گیا تھا۔''

''کیوں بھابھی بیگم۔ جب آپ کو اطلاع دے دی تھی تو اچانک کیوں آیا بھلا؟''

سلیمان صاحب اخبار پڑھ رہے تھے۔ صفحہ سختی سے پلٹتے ہوئے انھوں نے ناگواری جتائی مگر روشنا پر خاک اثر ہوا۔

''آ گیا ہوگا۔ اُس کی مرضی۔''

''ہاں بھئی۔ سینتیس سال کا بیٹا ہو تو انسان کیا ہی کر سکتا ہے۔ خیر۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ اس لڑکی کا کچھ کر لیں۔ میل ملن ہو گیا ہے تو اب جائے۔''

طاہرہ بیگم متفکر نظر آئیں۔ انھوں نے سلیمان صاحب کو دیکھا۔

''سلیمان..... آپ کچھ کریں ناں؟ میرے بیٹے کی ہنستی بستی زندگی تباہ ہو جائے گی۔''

''میں کیا کروں؟'' انھوں نے بے نیازی سے اخبار جھٹکا۔ ''تمہارے بیٹے کا ذاتی انتخاب ہے۔ وہی سنبھالے سب۔''

''تو کیا ہم اپنے بیٹے کو اس چھنال کی اولاد کی گود میں پھینک دیں گے؟'' وہ بے یقینی سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

''یہ روک تھام آپ کو پندرہ سال قبل رکھنی چاہیے تھی طاہرہ بیگم۔ اب اِس کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''کیسے فائدہ نہیں ہے میں بھی دیکھتی ہوں۔ وہ دو کوڑی کی لڑکی۔ میں اس کو نکال باہر

کروں گی، اپنے بیٹے کی زندگی سے جیسے پندرہ سال پہلے نکالا تھا۔'' وہ جارحانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''دیکھ لیں پھر آپ۔ اگر ایسا ممکن ہو سکا تو۔ وہ لڑکی، اس کی جوانی کے جذبات کی اولین رو میں بہی ہے۔ وہ رو جس میں کوئی بھی بہہ جائے تو امر ہو جاتا ہے۔ مشکل ہی ہوگا، اُس کو نکالنا۔''

''آپ مجھے چیلنج کر رہے ہیں؟'' طاہرہ بیگم تیورائی۔

''نہیں، تمہاری حریف کی طاقت بتا رہا ہوں۔''

انھوں نے استہزائیہ انداز میں منہ بھینچا۔ ''دیکھتے ہیں، کس میں کتنا دم ہے۔''

روشنا اُن کے ولولے پر گہری مسکرائی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک وسط حجم کا بنگلہ تھا۔ سٹنگ روم میں اس وقت تین لوگ تھے۔ کرن ممانی، عفت ممانی اور اُن کی بیٹی حمنہ عرفان..... کرن ممانی اور عفت ایک ہی صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں جب کہ حمنہ سنگل صوفے پر ٹانگیں اوپر چڑھائے، ہاتھ میں کافی کا مگ پکڑے گم صُم بیٹھی جانے کونسے خلا میں پہنچی ہوئی تھی۔

کرن ممانی غزارا کے آنے کی خوب آگ لگا رہی تھیں۔ عفت تو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔ لاؤنج میں صرف کرن ممانی کی آواز تھی باقی ہر طرف گہری خاموشی تھی۔

''میں تو کہتی ہوں ختم کرو یہ جھگڑا۔ حمنہ کا کچھ نہ کچھ میری بہن ورنہ حالات بہت خراب ہونے والے ہیں۔ بڑی بھابھی نے پیغام بھجوایا ہے کہ اب یہ کشیدگی ختم ہو جانی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو بھگتان دونوں کو بھگتنا ہوگا۔ شاہجہاں کو بھی اور حمنہ کو بھی۔''

''بھابھی میں کیا کروں؟ یہ لڑکی سنتی ہی نہیں ہے۔'' عفت نے مایوسی سے کہا۔ کرن ممانی نے مصلحت آمیز نظروں سے حمنہ کو دیکھا پھر سمجھانے کی غرض سے ذرا آگے ہوئیں۔

''حمنہ بچے.....''

''مجھے اُس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا ممانی۔ میری طرف سے وہ دس غزارا سے شادی کرے یا بیس۔ بھاڑ میں جائے، جہنم میں جلے۔'' وہ انتہائی نفرت سے پھنکاری۔

عفت نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔

''بکواس بند کرواپنی۔ سُنا نہیں تم۔ وہ غزارا ہے۔ وہی غزارا جس سے شاہجہاں نے بچپن میں شادی کا وعدہ کیا تھا۔''

''تو کیا وہ اب تک بچپن میں ہے؟'' وہ تیزی سے بولی۔ ''بچپنا بچپنا ہوتا ہے امی۔ اس عمر میں انسان بہت کچھ کہہ جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ بڑے ہو کر وہ انہی بچگانہ وعدوں کو پورا کرے۔ وہ سینتیس سال کا آدمی ہے۔ تیرہ سال کا کوئی لڑکا نہیں۔''

''اس کا تو دماغ چل گیا ہے بھابھی۔'' عفت نے اپنی بیٹی کو مایوسی سے دیکھا۔ ''آپ چھوڑیں اِسے۔ اس کے بابا آتے ہیں تو میں بات کرتی ہوں۔ ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔''

''جلد کرنا بہن۔ وہ لڑکی کوئی ایسا حسن نہیں لے کر آئی کہ شاہ جہاں صاحب تحمل رکھ سکیں۔ آفت بن کر آئی ہے وہ اور پھر مردوں کو چاہیے ہی کیا، ایک سرخ سفید جسم.....'' کرن ممانی نے کروفر سے ہاتھ جھلایا۔

''اب بس بھی کرو تم۔'' عفت کوفت زدہ ہوئی۔ ''وہ کورین لڑکی ہے۔ موریوں میں تو ان کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ کہاں سے خوبصورتی ہوگی تم بھی ناں، زمین آسمان کی قلابیں ملا رہی

ہو۔"

"میری بات پر یقین کرو عفت۔ میں نے دیکھا ہے اُسے۔ اب میں جھوٹ تھوڑے ہی بولوں گی۔" کرن ممانی نے زور دے کر کہا۔ عفت سوچ میں پڑ گئی۔

اگلے ہی لمحے حمنہ تنگ میز پر پٹخا اور پیر مارتے ہوئے باہر نکل گئی۔ کرن ممانی نے ایک اچٹتی نظر سے اُس کی اکڑ دیکھی پھر منہ بنا کر سر جھٹکا۔

☆.....☆.....☆

آفس کی کھڑکی سے روشنی جوت کر اندر گر رہی تھی۔ ذرے یوں ہوا میں رقصاں تھے جیسے کسی نے وہاں سنہری افشاں چھڑک دی ہو۔ وہ ریوالنگ چیئر کو آخری حد تک پیچھے گرائے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔

آفس خالی تھا اور کم روشن بھی۔

"میں نے پڑھائی نہیں کی۔"

"میں نے ہر لمحہ اذیت سے گزارا۔"

"میں نے خود کو ایک سال دیا ہے۔ ایک سال میں اتنی محنت کرنی ہے کہ بابا کو پانچ سال کی سزا نہ ہو سکے۔"

غزارا کی باتیں اُس کے دماغ میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں اور پھر اسی دوران اِسے وہ لمحہ یاد آیا جب یہ رابطہ منقطع ہوا تھا۔ وہ حادثہ، وہ بھیانک المیہ، اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔

حمنہ کا چیخنا..... گھر والوں کا چیخنا..... شور، غوغا..... ماتم..... بابا کی آواز، عفت ممانی کی سینہ کوبی، عرفان چچا کی وحشت، سارے کزنز کی سرگوشی بھری، ڈری ہوئی نگاہیں..... لعنت

لعنت لعنت.....

یکدم اِس نے آنکھیں کھول دیں۔

سامنے آفس کی سفید سیلنگ تھی۔ کمرہ خاموش تھا۔ وہ فوراً سے سیدھا ہوا، میز پر پڑی پانی کی بوتل کھولی اور چند گھونٹ لیے پھر اس نے انٹرکام سے سیکرٹری کو سیاہ کافی لانے کا کہا۔

اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اُس کا سارا دن یونہی گزرا تھا۔ کڑھتے، جلتے اور بابا کو سوچتے۔

وہ عجیب سے جذبات کا شکار تھی۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بیڈ پر حلیمہ سینے کے بل لیٹی اس کی ڈائری کھولے، آٹوگراف دیکھ رہی تھی۔

غزارا کی عادت تھی کہ وہ ڈائری کا مخصوص صفحہ ہر اداکار یا گلوکار کے فنی و شخصی امتزاج پہ سجاتی تھی جیسے vintage diaries ہوتی ہیں، پھر جب کبھی اُن سے ملتی، صفحے پر بنائے گئے مخصوص جگہ آٹوگراف لیتی اور تصویری کھنچوا کر اُسی صفحے پر کونے میں چپکا دیتی۔ یہ ایک کورین جین رکھنے والی لڑکی کی girly desires تھیں۔ وہ کچھ پاکستانی اداکاروں کی بھی فین تھی اور یہ ڈائری اس لیے لائی تھی کہ کیا معلوم، اس ایک سال میں وہ اپنی کسی پسندیدہ شخصیت سے مل سکے۔

کھڑکی کی چوکھٹ سے سیاہ آسمان نظر آ رہا تھا۔ چاند نہیں تھا، البتہ تارے موتیوں کی طرح جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی تیز چمک رہا تھا تو کوئی مدھم۔ کوئی گردش میں تھا تو کوئی جل بجھ رہا تھا۔

کوریہ میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد تارا بن جاتا ہے اور آسمان سے

ہمیں دیکھتا ہے۔ وہ رات کو چمکتا ہے اور جو زیادہ چمکتا ہے، وہ اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ مرنے والا اپنے گھر والوں کو یاد کر رہا ہے۔

وہ گود میں کتاب رکھے، ایسے ہی ایک ستارے کو دیکھ رہی تھی جو اِس کے خیال میں اِس کی ماتھیں۔ پندرہ سال پہلے، ایک ایسی رات وہ حویلی کی چھت پر بنی ٹنکی کے کنارے شاہ جہاں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں کی ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں۔ شاہجہاں کی ٹانگیں ساکت تھیں جب کہ وہ بار بار اپنی ٹانگیں ترا رہی تھی۔

دونوں رات گئے، خفیہ طور پر کچن سے آئس کریم چرا کر لائے تھے اور اب اپنا اپنا سکوپ پکڑے مزے سے کھا رہے تھے۔ اُس رات بھی آسمان ایسا ہی سیاہ تھا اور تارے ایسے ہی جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

''آسمان میں اتنے تارے کیوں ہوتے ہیں شاہ؟'' وہ آسمان کو گھور رہی تھی۔

''تاکہ ہمیں آسمان رات کو ڈرائے نہیں.....''

''کیا تارے وہ لوگ ہیں، جو مر چکے ہیں یا پھر یہ پتھر ہیں جیسا کہ سائنس کی بک میں لکھا ہے۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' شاہ جہاں دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگا۔

غزارا نے ایک نظر آسمان کو دیکھا، آنکھیں چھوٹی کیں اور کچھ سوچنے لگی۔ ہر طرف تارے ہی تارے تھے۔ کچھ جھرمٹ میں تو کچھ اکیلے..... کچھ مخصوص شکل بنا رہے تھے تو کچھ گردش میں تھے۔

''شی ڈانگ او کہتا ہے کہ لوگ مرنے کے بعد تارے بن جاتے ہیں جیسے اُس کے ابا بن گئے تھے۔ وہ رات کو بالکونی میں بیٹھ کے اُن کو دیکھتا تھا پھر صبح مجھے کہتا کہ اُس نے رات ابا سے

بات کی۔شاہ.....'' کہتے کہتے اُس نے شاہ جہاں کی طرف گردن گھمائی۔'' ما بھی تارا بن گئی ہوں گی ناں؟''

''ہاں.....وہ بھی تارا بن گئی ہوں گی۔''

''کونسے والا؟''

شاہ جہاں نے آسمان کی سمت دیکھا کہ کوئی بڑا ستارا چُن سکے۔دفعتاً اسے غزارا کی آسمان کی طرف اٹھی انگلی دکھائی دی۔''وہ ہے ما.....'' وہ ایک بڑے سے روشن تارے کی طرف اشارہ کررہی تھی۔شاہ جہاں اس کے انتخاب پر سر نیہوڑا۔

''ہاں وہی ہیں.....''

''کیا وہ مجھ دیکھ رہی ہیں۔''

''بالکل لیکن بہت ناراضی سے.....''

''وہ کیوں؟'' اس نے جز بز انداز میں شاہجہاں کو دیکھا۔

''کیوں کہ.....اُن کی لاڈلی بیٹی اوائل سردیوں میں، آدھی رات کو چھت پہ بیٹھ کے آئس کریم کھا رہی ہے۔اگر اُس کا گلا خراب ہوا تو بیمار ہو جائے گی اور پھر نہ سکول جا سکے گی اور نہ ہی کوئی کارٹون دیکھ سکے گی۔''

''پھر تو آپ کو ڈانٹنا چاہیے ناں.....''

''مجھے؟ مجھے کیوں؟''

''کیوں کہ آئس کریم آپ مجھے کھلا رہے ہیں۔'' وہ آنکھیں دکھانے لگی۔

''میں کھلا رہا ہوں؟'' شاہ جہاں سکتے میں آ گیا۔

''بالکل.....'' اس نے گردن کڑالی۔

''اچھا جی۔ رُکو ذرا۔'' شاہجہاں نے سکوپ ایک طرف رکھا پھر اسے پکڑ کر خوب گدگدایا اتنا کہ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ گئی اور معافی مانگنے پر اُتر آئی۔ وہی گرہیں، وہی بل اسے ابھی پیٹ میں محسوس ہوئے تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اس کی یکا یک اٹھنے والی کلکاری کو سن کر حلیمہ چونک گئی۔

''کیا ہوا؟''

''ہوں؟''

''ہنس رہی ہیں؟ کتاب میں کوئی لطیفہ پڑھ لیا ہے کیا؟''

''کتاب؟'' یکا یک وہ اپنے خیالوں سے واپس آئی تھی۔ ''اوہ..... کتاب، ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔'' بیشتر وہ سیدھی ہوئی، خود کو سنبھالا۔

حلیمہ نے سر جھٹک کے ڈائری کا صفحہ موڑا اور جب ہی، اسے ایک تصویر نظر آئی۔ وہ سوئی کی چبھن سے اٹھ کے بیٹھ گئی۔ غزارالی من ہو کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ دونوں مسکرا کر کیمرے کو دیکھ رہے تھے۔

''لی..... من..... ہو.....'' وہ صفحے کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ غزار نے پلٹ کے اُسے دیکھا۔

''بوسان آیا تھا، اپنے ڈرامے کی پرموشن کے لیے۔ اُس وقت لی تھی یہ تصویر۔ تمہیں پتا ہے ناں کہ یہ آرٹسٹ لوگ اپنی تخلیق کی نمائش کے وقت ہی اتنے اچھے بن جاتے ہیں۔''

وہ اتری اور کتاب کو مخصوص ریک میں رکھتے ہوئے عام سا تبصرہ کیا۔

''تم نے اسے قریب سے دیکھا ہے۔'' وہ جیسے اس حادثے پر قطعی بھروسہ نہیں کر پا رہی تھی۔

''ہاں۔تصویر لی ہے تو قریب سے دیکھا ہوگا۔''

''کیا یہ قریب سے بھی اُتنا ہی ہینڈسم دکھتا ہے جتنا یہ دور سے ہے؟''

''کتنا دور سے؟ سات آٹھ ہزار کلومیٹر؟'' وہ پائنتی کے پاس کھڑے ہو کر بولی۔ حلیمہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

''نہیں۔میرا مطلب، جتنا یہ دی ہیرس، لیجنڈ آف دابلیوسی یا پھر کنگ انٹرنل مونارک میں ہے، اصل میں اُتنا ہینڈسم ہے یا نہیں؟''

''دیکھو، ڈرامے میں effects and filters ہوتے ہیں۔میک اپ ہوتا ہے۔ مخصوص سٹائل کے کپڑے اور بال وغیرہ بنائے جاتے ہیں اور خصوصاً کوریا میں میل لیڈ کا ہیر اسٹائل دس دفعہ تجربہ کیا جاتا ہے۔سو اگر وہ سب نکال دیں تو یہ ایک انسان ہے جس کی دو ٹانگیں، دو ہاتھ، ایک ناک ہے اور اس کے چہرے پر بھی وہی نشانات ہیں جو سب کے ہوتے ہیں۔سو اس میں متاثر ہونے والی کوئی بات نہیں۔''

حلیمہ کا جوش غائب ہو گیا۔شاہ بھائی سے محبت کرنے والی یہ لڑکی، لی من ہو کو تھوڑے ہی ہینڈسم اور اچھا بولے گی۔

''گھر کی مرغی ..... دال برابر..... ہونہہ.....'' چشمہ ناک پر دھکیلتی حلیمہ منہ ہی منہ بڑبڑائی جو غزارا نے نہیں سُنا کیوں کہ وہ بالوں کو سمیٹتی ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی۔

بالوں کو مٹھی میں پکڑے وہ ٹیبل کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی اور دراز کھول کر بینڈ نکالا۔بالوں میں کس کر بینڈ ڈالنے کے بعد وہ اٹھنے ہی لگی تھی جب یونہی رُک گئی۔ہاتھ خود بخود نچلے دراز تک گیا جہاں اِس نے ایک فائل رکھی تھی۔آہستہ سے دراز کھول کر اس نے فائل باہر نکالی۔ وہ کورین میں لکھی کوئی رپورٹ تھی، کسی ڈیڈ لائن کی رپورٹ اور اُس پر نچلے دائیں کونے

میں ''twelve months'' لکھا تھا۔ اس نے اس دورانیہ پر اُنگلی پھیری، دل میں ایک عجیب سا درد محسوس ہوا جیسے کوئی مخصوص نس کھینچ گئی ہو۔ اس نے ہاتھ سے وہ مقام سہلایا پھر فائل بند کے واپس رکھ دی۔

☆.....☆.....☆

شاہ جہاں ڈنر کے بعد آیا تھا پھر جیسے ہی وہ فریش ہوا، اسے سلیمان صاحب کے کمرے سے بلاوا آ گیا۔ وہ رف سی سیاہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس سادی سی چپل پہنے، وہ بکھرے بالوں کے ساتھ اُن کے کمرے میں آیا جہاں پنچائیت لگی ہوئی تھی۔ بابا، ماما، چچا، چچیاں اور عالم شاہ، اُس کی بیوی (بڑی بہو جو تھی طاہرہ بیگم کی) فاصلے فاصلے سے یہاں وہاں بیٹھے تھے۔

وہ جانتا تھا یہ پنچائیت لگے گی۔ اس لیے بغیر حیران ہوئے اندر آیا اور درمیان میں رکھے ایک خاص صوفے پر بیٹھ گیا جو یقیناً اُس کے لیے خالی چھوڑا گیا تھا جیسے عدالت میں ''کٹہرا'' مجرم کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

''آپ نے بلایا تھا بابا؟'' اس نے سب پر ایک طائرانہ ڈالنے کے بعد سلیمان صاحب کو مخاطب کیا۔ وہ شال اوڑھے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ساتھ ہی دوسری طرف طاہرہ بیگم بیٹھی تھیں۔ سب کے چہروں پر تناؤ تھا۔ گہری فکر، جو کسی بادشاہ کے چہرے پر تب ہوتی تھی جب کوئی اُس کی سلطنت پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔

''ہاں.....'' وہ ٹیک ہٹا کر سیدھے ہو گئے۔ ''کچھ پوچھنا تھا۔''

''پوچھیے۔ سن رہا ہوں۔''

''آج تم نے پروموشنل منیجر کو کہاں بھیجا تھا؟'' سلیمان صاحب نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

''منیجر؟'' وہ جیسے چونکا پھر اُس نے ایک نظر اپنے چچا کو دیکھا جو اس کے دیکھتے ہی نظر چرا گئے تھے یعنی انھوں نے ہی کن سوئی کی تھی پھر اس نے گہرا سانس لیا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

''غزارا کے لیے جاب ڈھونڈنے ایک ریستوران بھیجا تھا۔''

''کیوں؟''

''اُسے جاب کی ضرورت ہے بابا۔''

''کیوں؟''

''اُس کے بابا کی سزا پانچ سال مزید بڑھ گئی ہے جو اُس کے مطابق غیر قانونی ہے۔ کمپنی جس کے ساتھ یہ کیس چل رہا ہے، وہ ایک صورت پر یہ سزا ختم کرنے کا کہہ رہی ہے۔ اُس نے ایک خطیر رقم ہرجانے کے طور پر رکھی ہے۔ غزارا جب تک وہ جمع نہیں کروائے گی، سزا ختم نہیں ہوگی۔ اس لیے وہ یہاں آئی کہ کچھ پیسے بنا سکے۔'' وہ ہمدردی سے بولا۔

سلیمان صاحب واجبی غمگساری کے پیش نظر خاموش ہوگئے۔ چچا نے بھی جیسے لب بھینچ لیے تھے۔ طاہرہ بیگم کے تناؤ میں البتہ اس جواب کو سُن کو کچھ کمی آئی تھی لیکن روشنا نے اپنی آنکھیں چھوٹی کر کے جاسوسانہ انداز میں شاہ جہاں کو گھورا۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا..... پیسے تو وہ وہاں بھی کما سکتی تھی شہزادے پھر یہاں آنے کا مقصد؟''

''کرنسی چچی..... کوریا کی کرنسی بہت ماندہ ہے۔'' عالم شاہ کی بیوی روبا نے کہا۔

روشنا نے جل کر پہلو بدلا جیسے یہ information اس کے علم میں کیوں نہیں تھی۔

''تو وہ محض..... محض پیسے کمانے کے لیے آئی ہے؟'' طاہرہ بیگم نے ایک بار پھر تسلی چاہی۔

''جی امی..... اُس کو اُردو آتی تھی کوئی اور زبان نہیں۔ اِس لیے سیدھی یہیں چلی آئی۔ کسی دوسرے ملک نہیں گئی۔''

''چلو یہ اچھا ہو گیا۔'' وہ ڈرامائی انداز میں ہنسے لگیں۔ ''پتا نہیں ہم کیا کیا سوچ رہے تھے۔''

''بالفرض.....'' روشنا کینہ توز انداز میں مسکرائی۔ ''اگر وہ اُس.....اُمید..... سے آئی بھی ہے جو ہم.....ہم سوچ رہے تھے تو ایسا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ کیوں بھابھی؟'' ایک آنکھ دبا کر طاہرہ کو دیکھا جس پر وہ گڑبڑا گئیں۔

''کس اُمید سے چچی؟'' شاہجہاں نے ٹھٹھک کر دونوں کو دیکھا۔

''اب تم اتنے بھی بھولے مت بنو شاہ جہاں..... تمہیں سب علم ہے میں کس اُمید کی بات کر رہی ہوں۔''

''نہیں مجھے نہیں پتا چچی۔ کھل کر بتائیں۔'' اُس نے فراغت سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائی۔ روشنا اُس کی دلیری کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے دھدکھا گئی لیکن پھر وہ اپنے مخصوص پراسرار انداز میں مُسکرائی۔

''تم سے شادی کی اُمید لاڈلے.....''

ایک لمحے کو شاہجہاں کو لگا کہ وہ سانس لینا بھول گیا ہے۔ چلتے چلتے جیسے کسی سحر نے اُسے پکڑ لیا ہو۔ لاؤنج میں غیبی خاموشی تھی۔ سب اُسی کو دیکھ رہے تھے۔

پہلے اس کی تیوری ختم ہوئی، پھر آنکھوں میں چمک آئی اور آخر میں وہ محظوظ سا مسکرایا۔

''بالفرض.....اگر وہ اُس اُمید سے آئی ہے جو آپ سوچ رہے ہیں تو ایسا کیوں ممکن نہیں ہے چچی؟''

ایک ان دیکھا زلزلہ تھا جو وہاں آیا تھا۔ سب ایک دوسرے کو ایسے دیکھنے لگے جیسے عرصے

بعد دیکھ رہے ہوں۔ سلیمان صاحب اور طاہرہ بے چینی سے پہلو بدل گئے۔

روشنا کی مسکراہٹ پہلے تو غائب ہوئی پھر اُس کی جگہ مخصوص شیطانیت نے لے لی۔

''کیوں کہ شہزادے اگر اُس لڑکی کو تمہاری سچائی بالخصوص اُس ''رات'' کی سچائی معلوم ہوگئی تو وہ کرچی کرچی ہو جائے گی۔ اُس کی اُمید، اُس کی خواہشیں سب ختم.....!!''

شاہ جہاں کا اطمینان بھک سے اُڑ گیا۔ چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''کیا ہوا؟ اُڑ گئی ہوائیاں؟''

''تم چپ کرو روشنا۔ گڑے مردے مت اُکھاڑو، اس بات کو دس سال ہو گئے ہیں۔'' طاہرہ بیگم نے سبک سا پچکارا جس پر وہ مزید شیر ہو گئی۔

''دس سال ہوں یا دس صدیاں۔ زلیخا کا کلنک نہیں دھلا، ان کا دھل جائے گا؟''

شاہجہاں کی تیوریاں گہری ہونے لگیں۔ لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

''اچھا اب بس کرو۔ چپ ہو جاؤ۔'' طاہرہ بیگم جھنجھلائی۔

''ہم تو نہیں چپ ہوں گے۔ ہم نے تو کسی سے وفا، عشق اور فنا کے وعدے نہیں کیے تھے۔ ہم نے تو کسی کو اُمید پر نہیں رکھا تھا کہ اُس سے شادی کریں گے۔ اسے اپنائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اب جس نے رکھا تھا، وہ ہی اتنا حوس.....''

''شٹ اپ!!'' وہ دھاڑتے ہوئے کھڑا ہوا۔

روشنا چچی کمینی سی مسکرائی جیسا یہی تو وہ چاہتی تھیں۔ شاہجہاں کو مات دینا.....

طاہرہ بیگم بیٹے کی اُبھرتی نسوں، پھولی سانسوں کو دیکھتے ہوئے تیزی سے اٹھ کر اُس کے پاس آئیں۔

''جاؤ یہاں سے شاہ جہاں۔ کمرے میں جاؤ بیٹا۔'' انھوں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے

کہا۔ وہ روشنا کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی کھا جائے گا۔ آنکھیں لہولہو ہو رہی تھیں۔

''جایئے اپنے کمرے میں۔ سچائی تو آپ ویسے بھی نہیں سُن سکتے۔'' روشنا نے اسی دلیری سے ٹونٹ کیا۔

''چچی!!'' وہ خوفناک انداز میں بولا۔

''اگر آپ نے، یا اس گھر میں موجود کسی نے بھی، کسی نے بھی یا نگ شی کو اس بارے میں بتایا تو.....'' وہ رُکا پھر ایک انتباہیہ نظر سب کے چہروں پر دوڑائی۔ ''میں.....اُس.....کو..... چھوڑوں گا.....نہیں.....سُنا سب نے.....''

کمرے کی دیواریں اس کی چیخ سے لرز گئیں۔ سب خاموش تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

''سنا سب نے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''سن لیا ہے۔ زیادہ چیخو نہیں۔'' روشنا نے کان میں اُنگلی ڈالی۔

''یہی بہتر ہوگا۔'' وہ سب پر ایک اچٹتی نظر ڈالتا، فینسی میز کو زوردار لات مار کر باہر نکل گیا۔ روشنا نے چٹاخ سے گرتی میز کو دیکھا پھر ''ہونہہ'' کر کے ہاتھ جھلایا۔

☆.....☆.....☆

غزارا ابھی اُس سے ملنے کے لیے کمرے سے باہر آئی تھی جب اُس کو بڑی ممانی کے کمرے سے نکلتا دیکھا۔ وہ اس کو آواز دینا چاہتی تھی لیکن وہ بہت تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے آئی۔ کمرے والی راہداری پر جیسے ہی وہ مڑی، شاہجہاں کے کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا۔ آواز اتنی خوفناک تھی کہ وہ جہاں کھڑی تھی، خود بخود تھم گئی۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ جا کے اُس سے مل آتی۔

☆.....☆.....☆

وہ چلتے چلتے بیڈ کے پاس آ کر رُک گیا کیوں کہ اِس سے آگے دیوار تھی۔ کچھ دیر یونہی کھڑے ہو کر، گہرے گہرے سانس لینے لگا پھر وہ پائنتی کے ساتھ نیچے فرش پہ بیٹھتا چلا گیا۔ دماغ کے کسی انجانے عصبے میں سوئی جیسی چبھتی ہوئی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اس نے آنکھوں پر انگلیاں رکھ دیں۔

''دس سال ہوں یا دس صدیاں۔ زلیخا کا کلنک نہیں دھلا، ان کا دھل جائے گا؟''

کلنک.....

کیا کوئی بھی لفظ اس سے بھاری ہو سکتا ہے؟

دماغ تیزی سے اُس لمحے کی طرف لپکا، جب یہ سب ہوا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھا۔ اسٹڈی روم میں۔ ستائیس سال کا شاہجہاں جو چار دن پہلے طاہرہ بیگم کو حمنہ سے شادی کرنے سے انکار کر کے آیا تھا اور جس پر عفت چچی کسی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھیں۔ اِس نے دوٹوک الفاظ میں غزارا سے شادی کا کہا تھا۔ طاہرہ بیگم نے اِسے دونوں کی عمروں کا، نسل کا اور تہذیب کا فرق یاد دلایا لیکن اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تہذیب اور نسل سے اُسے فرق نہیں پڑتا اور رہی بات عمر کی تو وہ دس سال انتظار کرے گا جب کہ تک وہ بڑی نہیں ہو جاتی۔

''تو کیا تم اُس سے محبت کرتے وہ شاہجہاں؟''

وہ رُکا۔ اس سوال کا جواب عجیب تھا۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے محبت ہے، وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُسے محبت نہیں ہے۔ وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھا۔

''بتاؤ.....اس سے محبت کرتے ہو؟''

''مجھے نہیں پتا۔ لیکن میں صرف اُسی کو اپنانا چاہوں گا۔''

''کیوں؟ ایسا کیا ہے اُس میں؟''

''امی..... جب کوئی اچھا لگتا ہے تو یہی تو سمجھ نہیں آتا کہ اُس میں کیا اچھا لگتا ہے؟ ساری زندگی اسی چیز کی تلاش میں گزر جاتی ہے کہ ''اچھا'' آخر لگا کیا تھا۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے اس سے محبت ہے، میں نہیں جانتا۔ مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اُس سے اپنانا ہے۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا ہے۔''

''وعدے کا کیا ہے شاہجہاں؟ بچوں کو ہم بہت کچھ بول جاتے ہیں تو کیا ہمیں وہ سب کر لینا چاہیے؟''

''سب کچھ کیا ہوتا ہے، میں نہیں جانتا۔ لیکن، وہ میرا انتظار کر رہی ہے اور میں اگر اُسے امید دے رہا ہوں تو مجھے اس پہ قائم رہنا ہے۔''

کم عقلی تھی، بے وقوفی تھی..... بقول طاہرہ بیگم..... لیکن وہ اڑ گیا تھا۔ اس نے سب کو اس موضوع پر مزید کوئی بھی بات کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ ستائیس سال کا نوجوان تھا۔ بزنس سنبھال رہا تھا۔ ایک مقام، ایک حیثیت رکھتا تھا۔ طاہرہ بیگم کو اُس کے انکار نے اندر تک تیزاب کی طرح جلا ڈالا تھا۔

پندرہ سال پہلے اُس نے غزار کو اِسی لیے تو اس حویلی سے نکالا تھا کہ وہ یہ آنے والا وقت دیکھ رہی تھیں۔ جس دن اُس کی فلائٹ تھی، طاہرہ بیگم نے ہی تو شاہ جہاں کو لاہور بھیجا تھا اور یہ طاہرہ بیگم ہی تھیں جس نے جھوٹ بولا تھا کہ یانگ منی اُس کی custody کے طور پر آئی تھی اور چوں کہ ولدیت کوریا کی تھی اور ابھی اُس کا باپ زندہ تھا تو وہ کسی بھی طور پر غزار کو جانے سے نہیں روک سکے۔ وہ وہیں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہیں رہنا چاہتی ہے۔ تب شاہجہاں نے اس بات کو سمجھا تھا۔ وہ اس وقت پڑھ رہا تھا۔ کاروبار میں مشمول نہیں تھا، شاید

یہی وجہ تھی کہ اُس کی رائے کا احترام ابھی فی الحال نہیں کیا جاتا تھا۔

پھر غزارا کوریا میں ہو یا پھر پاکستان میں..... کیا فرق پڑتا تھا۔ بات تو یہ امر تھی کہ اُس نے شادی غزارا سے ہی کرنی تھی لیکن پانچ سال بعد جب وہ شادی کی عمر کو پہنچا تو حمنہ عرفان کو اس کے سامنے ''صرف وصرف انتخاب'' کے طور پر رکھ دیا گیا۔ اسے گفت وشنید کا موقع تک نہیں دیا جا رہا تھا لیکن اب وہ کاروبار میں شامل ہو چکا تھا۔ تین سال سے ایک بہترین کارکردگی دکھا رہا تھا۔ اب اُس کی بات میں وزن تھا۔ اس لیے اس کا انکار گھر والوں کو بری طرح گھائل کر گیا تھا۔

خصوصاً حمنہ کو، وہ تو جیسے غشی میں تھی۔ دو دن تک کمرے سے باہر نہیں آئی تھی اور جب آئی تو رو رو کر آنکھوں میں موتیا کر دیا تھا۔ اس کی حالت کو دیکھ کے شاہجہاں تو کوفت بھرا سانس نکالتا لیکن طاہرہ بیگم اور عفت، ضبط کا گھونٹ بھر کے رہ جاتیں۔

اُس رات جب وہ سٹڈی روم میں تھا، اس نے کمرے میں کسی کے آنے کی آواز سُنی۔ اُسے لگا طاہرہ بیگم ہوں گی۔ وہی بغیر اجازت آتی تھیں لیکن کچھ دیر بعد اسی یہ آہٹ اسٹڈی روم میں سُنائی دی۔

''اگر آپ دودھ لائی ہیں امی تو میں بتا رہا ہوں نہیں پیوں گا۔ میں سات سال کو کوئی بچہ نہیں ہوں۔'' وہ مسکراہٹ روکے، بغیر سر اٹھائے بولا۔

سامنے سے جواب نہیں آیا۔ وہ لاشعوری رو میں، وہاں کسی نسوانی وجود کو محسوس کر رہا تھا اور وہ نسوانی وجود اسے طاہرہ بیگم کا لگ رہا تھا لیکن کافی دیر تک اپنی بات کا جواب نہ پا کر آخر کار اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ حمنہ تھی۔ انتہائی نامناسب لباس میں ملبوس۔ آنکھوں میں عجیب سی خوابیدہ سُرخی لیے

دیکھ رہی تھی۔

وہ سوئی سے چبھن سے کھڑا ہوا۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ حمنہ؟ اس طرح..... اس کمرے میں کیسے آسکتی ہو؟'' اُس کا صاف اِشارہ اس کے عریاں لباس پر تھا جہاں اُس کا انگ انگ بخوبی نمایاں ہو رہا تھا۔

''کیوں؟'' وہ بوجھل سے لہجے میں بولی جیسے خواب میں بول رہی ہو۔ ''کیا میں اچھی نہیں لگ رہی شاہ؟''

''مجھے اس نام سے مت بلاؤ اور جہاں تک اچھے لگنے کی بات ہے تو جا کر اپنے باپ کو دکھاؤ۔ وہ بہتر بتائے گا کیسی لگ رہی ہو۔'' اس نے تلخی سے کہا جس پر اس نے طنزاً بھرا ہنکار لیا۔

''باپ.....'' وہ قدم قدم اُس کی طرف بڑھی۔

''میرے قریب مت آؤ۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''اچھا.....'' وہ اس کے گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اگر قریب آ گئی تو؟ کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ؟'' وہ اس کے ہونٹوں کو غور سے دیکھنے لگی۔

شاہجہاں نے اس کے بازو پیچھے ہٹانے چاہے لیکن وہ اِسے موقع دیے بغیر اُس سے چپک گئی۔ شاہجہاں نے اُسے پیچھے کرنا چاہا لیکن اُس نے اپنے جسم کا فائدہ اٹھایا، اپنی اداؤں اور بے باکیوں سے شاہجہاں کو بری طرح بے بس کر دیا۔ جذبات کی رو میں وہ اس بری طرح بہکا کہ جب ہوش آیا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ وہ حمنہ کے پرسکون بانہوں میں تھا۔ پھر اس نے حمنہ کو ہڑبڑا کر اٹھتے دیکھا۔ وہ چادر سے خود کو چھپا رہی تھی، دروازہ کے پار طاہرہ بیگم، عفت اور ماموں

سب چلا رہے تھے۔

شاہجہاں نے چکراتے سر کے ساتھ حمنہ کو دیکھا جو پرسکون تھی پھر اس نے جلدی سے اپنی ٹی شرٹ اٹھا کر پہنی اور جیسی ہی وہ بستر سے اُترا، اس نے حمنہ کو چیختے سُنا۔

اب وہ ''امی ابو، بچاؤ بچاؤ..... چھوڑو مجھے شاہ.....'' کے نعرے لگا رہی تھی۔

وہ تلملا کر پلٹا۔

''امی ابو..... شاہ نہیں کروایسا..... پلیز..... چھوڑو مجھے.....''

شاہجہاں سکتے کے عالم میں اُس کو دیکھ رہا تھا پھر اُس نے دھڑا دھڑ چیزیں گرانا شروع کیں۔ میز، بیڈ شیٹ، تکیے، ناختوں سے اپنی ہی کلائیاں کھرچنے لگی۔ بال بکھیرے، جگہ جگہ خود کو ناختوں سے اُدھیڑا۔ باہر موجود مرد اب کندھوں کے زور سے دروازہ کھول رہے تھے۔ دروازہ مضبوط نہ ہوتا تو اب تک ٹوٹ چکا ہوتا۔

شاہجہاں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا تھا۔ وہ حمنہ کے جال میں پھنس گیا تھا۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا پھر کب دروازہ کھلا، کب وہ پکڑے گئے۔ کب اُن کا نکاح کیا گیا۔ سب پلکوں کی جنبش میں ہوا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں۔ وہ بس نقش کا لحجر بنا رہا۔ چپ۔ خاموش۔ کسی روبوٹ کی طرح سب کچھ ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔

اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بہک گیا تھا۔ وہ غزارا سے بے وفائی کر گیا تھا۔ وہ اس قدر کمزور اعصاب یا جذبات کا مالک تو نہیں تھا۔ وہ تو توانا تھا۔ مضبوط۔ منفی جذبوں سے خود کو دور رکھنے والا۔ پھر وہ کیسے اتنا بے حیا اور بے شرم ہو گیا تھا؟

کیا کسی لڑکی کا نیم برہنہ جسم اُسے ورغلا سکتا تھا۔ اسے کمزور کر سکتا تھا؟

اس سب صورتحال میں اُسے ایک چیز سمجھ آئی کہ اُس کی محبت میں ''خلوص'' نہیں تھا۔

محبت میں purity نہ ہو تو وہ باسی ہو جاتی ہے۔ اسے اپنی محبت کو باسی اور پراگندہ کر دیا تھا۔

نو ماہ بعد وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا تھا لیکن یہ نو ماہ، پھر بقیہ نو سال تین ماہ، اُس نے ''پچھتاوے'' اور ''خود اذیتی'' میں گزارے تھے اور یہ وہی وقت تھا جب اِس نے غزارا سے رابطہ ختم کر دیا تھا کیوں کہ وہ اب ''پاکیزہ'' نہیں رہا تھا اور وہ کیسے ایک پاکیزہ لڑکی کی پاکیزہ محبت کا دعویدار ہو سکتا تھا۔ اس نے شعوری طور پر کوشش کی کہ غزارا کو بھول جائے، اُس کو زندگی سے نکال دے۔ اب وہ اِس کے لائق نہیں تھا۔ اس سب میں اُس نے حمنہ سے زیادہ خود کو دوش دیا تھا۔ وہ بہکا تھا، بے شک بہکایا گیا تھا۔ کیا ایک اچھا انسان، بہکتا ہے؟ چاہے صورتحال جیسی بھی ہو؟

زید کی پیدائش کے بعد وہ لندن چلا گیا تھا۔ چار سال اِس نے وہاں کی برانچ سنبھالنے میں لگائے۔ دو بار حمنہ اُس سے ملنے آئی تھی۔ زید کو بھی لائی تھی۔ جتنے دن وہ رہی، وہ زید کے ساتھ ہی رہا تھا۔ پھر اُس نے وہ تصویر کھینچی تھی جو غزارا نے فیس بک پر دیکھی تھی اور پھر اس نے اُسے بلاک کر دیا تھا۔

زید اب نو سال کا تھا اور پچھلے تین ماہ سے حمنہ زید کو لے کر ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ شاہجہاں سے علیحدگی چاہتی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیوں کہ شاہجہاں نے اُس رات کی بہک کے بعد، اُسے تا حال نہیں چھوا تھا۔ جس لمس کو اس نے غیر شرعی اور غیر اخلاقی طور پر حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اب جب کہ وہ اس کے لیے حلال اور جائز ہو گیا تھا، شاہجہاں نے ہاتھ روک لیا تھا۔

اِس کے سارے جذبات اُس رات اٹھ کر، اُبل کر اب جوش کھو چکے تھے۔ اُس رات کے بعد حمنہ کا جسم اُس کے لیے ایک نمائشی پتلے کے علاوہ کچھ نہیں رہا تھا اور پتلے چاہے جتنے بھی حسین

ہو جائیں، ان میں کشش ہوتی ہے اور نہ ہی دلکشی۔

دو سال قبل غزارا بیس کی ہو چکی تھی۔ جیسے اس نے حساب لگایا تھا۔ وہ نہیں آئی یا آ پائی۔ اب جب کہ وہ خیال کر چکا تھا کہ غزارا نہیں آئے گی۔ وہ اپنی زندگی میں مصروف ہو چکی ہو گی، وہ آ گئی تھی۔

اچانک ایمبسی سے ملنے والا اُس کا خط اور اس کی آمد کی اطلاع، اس کے لیے ایسی تھی جیسے دوزخ کی وعید۔ دس سال قبل کے سارے لمحات و واقعات اژدھے کی طرح پھن پھیلا کر کھڑے ہو گئے اور زہریلی یادیں زبان نکالے، اُس کی رگ و پے میں کڑوا زہر اُتارنے لگی تھیں۔

عفت اور طاہرہ کا بنایا ہوا منصوبہ کامیاب تو رہا تھا لیکن جلد ہی اِنھیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ مرد کو بہکانا، عارضی وقت کے لیے ورغلانا آسان ہے لیکن اسے اُس چیز پر راضی کرنا بہت مشکل ہے جس پر وہ راضی نہیں ہونا چاہتا۔ مردوں کی ذات میں موجود انا اور ضد، عورتوں کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے۔ انھوں نے حمنہ کو زبردستی شاہجہاں کی زندگی میں ٹھونس تو دیا تھا لیکن اب وہ اس بات پر پچھتا رہی تھیں کیوں کہ شاہجہاں نے اُس کو صرف کمرے تک رکھا تھا۔ زندگی میں حمنہ عرفان کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔

پھر اس سارے وقت اُس کی سوچ کا محور صرف زید اور بزنس ہو گئے تھے۔ زید سے وہ بغیر کسی وجہ کے محبت کرتا تھا لیکن بزنس اُس نے اپنے گناہ کے پچھتاوے سے بچنے کے لیے ایک ''وجہ'' بنا لیا تھا۔ دن رات وہ کام میں مشغول ہوتا۔ ویک اینڈز پہ وہ زید کے ساتھ سارا وقت گزارتا اور جو وقت بچ جاتا وہ کسی میٹنگ، یا پھر غزارا کی یادوں کی آوارہ گردی میں۔

پچھلے چار ماہ سے وہ زید سے بھی کم کم ہی مل رہا تھا۔ وجہ تھی حمنہ اور اس کا غصہ۔ وہ باپ

سے ملنے پر زید کو بری طرح ڈانٹتی اور سزا دیتی تھی جس کے پیشِ نظر وہ زیادہ نہیں ملتا تھا اور زید کو حمنہ کسی بھی طور پر آنے نہیں دے رہی تھی۔

ماضی جب حال ہوتا ہے، تب قابو میں رہتا نہیں اور جب ماضی بن جاتا ہے تو بھیانک یاد کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر ہر اُس لمحے میں ڈارتا ہے جہاں آپ مسکرانے، یا جینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ کنوارا اور غیر شادی شدہ ہوتا اور پھر غزارا یوں آتی تو معاملہ مختلف ہوتا۔ جذبات مختلف ہوتے لیکن اب یہاں محض ویرانیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

سر کی ٹیسوں کو نظر انداز کیے، وہ ایسی ہی بیٹھا تھا جیسے سامنے کسی پیارے کی میت کو دیکھ رہا ہو اور میت کوئی اور نہیں، اس کی اپنی ہو۔ بے تاثر آنکھیں، سلے لب.....

کئی ساعتوں تک ایسے ہی بیٹھا رہا پھر اس کی توجہ فون کال نے اپنی جانب مبذول کر لی۔ بیڈ پہ پھینکا اس کا فون تھرتھرا رہا تھا۔ ہمت جمع کر کے اس نے بازو لمبا کیا اور فون اٹھایا۔ زید کی کال تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر اٹھائی۔

"I know,This is late but would you tell me کہ آپ میری پرفامنس دیکھنے آ بھی رہے ہیں یا نہیں؟I am just trying to figure out کہ جس پلے میں، میرے بابا نے participate کیا تھا، اب میں کروں گا اور جب آپ دیکھیں how would it feel like؟"

اُس نے اسپیکر پہ فون ڈالا تھا۔ اُس کے پس منظر میں مشینی گن فائر، ٹھاہ ٹھوں کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً وہ ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔

"It would feel amazing کیوں کہ میرا بیٹا بہت قابل ہے۔" وہ سب کچھ بھلا کر گرمجوشی سے بولا۔ اپنی زندگی کی تلخیوں سے وہ زید کی زندگی کڑوی نہیں کرنا چاہتا

تھا۔وہ معصوم تھا۔totally innocent۔

''تو آپ آرہے ہیں؟''

''آف کارس.....''اس نے یقین دلایا۔

''Dang it۔'' یکدم وہ چلایا۔یقیناً اُس کے آن لائن گیم پارٹنر نے اسے کوئی مات دی تھی۔''I am going to kill you bro,just watch.....'' وہ دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

شاہ جہاں بس سن رہا تھا۔ پیاروں کی آواز، ہاں اُن کی محض آواز بھی علاج کا کام کرتی ہے۔ کچھ دیر تک ویڈیو گیم کی ژوں ژوں کرتی آواز چلتی رہی پھر اسے زید کی لہکتی ہوئی آواز آئی۔

''دیکھا۔میں نے کر دیا۔بابا جانی.....جانتے ہیں میرا کتنا سکور ہو گیا ہے؟''

''کتنا؟''

''seventy thousand.....''وہ اترا کے بولا۔

'' نائس۔ ویری گڈ لیکن میرا ریکارڈ توڑنے کے لیے ابھی تمہیں ایک لاکھ مزید اسکور چاہیے چیمپ۔''اس نے پھر جتایا جیسے ہر بار اسے حوصلہ دینے کے لیے جتایا کرتا تھا۔

''اور ninja کا توڑنے کے لیے مجھے دو لاکھ اسکور چاہیے۔ویسے ڈیڈ.....'' وہ تھوڑا بے تکلف ہوا۔'' آپ نے ابھی تک ninja کا اسکور کیوں نہیں توڑا؟''

''کیوں کہ تمہارے باپ کے پاس تم جیسا فارغ وقت نہیں ہے ناں؟''

زید ہنس پڑا۔اتنا کہ وہ اس کی ہنسی کی آواز گونجتی ہوئی سُن سکتا تھا۔اسے بہت سکون ملا، اتنا سکون کہ ساری کلفت دور ہو گئی۔زید نے فون اٹھا کر منھ کے قریب پکڑ لیا۔

”ڈیڈ.....“

”ہوں.....“

”ایک دن میں آپ کا ریکارڈ توڑ دوں گا پھر اُس ninja کا بھی، آپ دیکھ لینا۔“ وہ عجب عزم سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے تم پر یقین ہے چیمپ۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”تھینک یو.....اب مجھے گیم کھیلنی ہے۔ گڈ نائٹ۔ بائے۔“ اس نے مبازرت بھرے انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔

”گڈ نائٹ.....“ شاہ جہاں فون کان سے ہٹا کر دھیما سا مسکرایا۔

✿ ..... ✿ ..... ✿

(قسط نمبر: 3)

صبح شاہجہاں سب کے اٹھنے سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ وہ اُسے اپنے فون اور نیٹ ورک کا کہنا چاہتی تھی لیکن نہیں کہہ سکی۔ اس لیے بادلِ نخواستہ وہ کچھ کورین کرنسی (جو وہ ساتھ لائی تھی) اور اپنا فون لیے خود ہی مارکیٹ کی طرف چلی آئی۔ ٹیکسی کو اس نے قریبی بینک جانے کا کہا جہاں سے اُس نے وہ کرنسی بدلی۔ اُسے یقین نہیں آیا تھا کہ بنڈل بھر کورین وان کے بدلے اُسے بیس ہزار پاکستانی روپے ملے تھے۔

کوریہ کو میوزک کے ساتھ ساتھ کرنسی پر بھی توجہ دینی چاہیے تھی۔ ڈالر اوپر جا رہا تھا اور کرنسی نیچے..... ہا.....

ٹیکسی والا کرائے کے لیے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

تھکی سی سانس نکال کے اُس نے ٹیکسی والے کو کرایہ دیا پھر پوچھتے پوچھتے وہ کسی سم کی قریبی فرینچائی میں آئی۔ وہاں سے اپنا فون رجسٹر کروایا، اس کے چند ہزار لگے پھر اس نے سم لی، اس کا شناختی کارڈ نہیں تھا۔ سو پاسپورٹ پر نکلوائی جو محدود وقت کے لیے نکلی۔ سم فون میں چلنے لگی تھی۔ وہاں سے چل کر وہ سیدھا قریبی کیفے آ گئی۔ اسے جلد از جلد یانگ منی کو آگاہ کرنا تھا کہ اُس سے اب اس فون کے ذریعے رابطہ رکھے۔

گیارہ بجے کا وقت تھا۔ کیفے میں کئی لوگ موجود تھے۔ کافی، چائے کے بھاپ اُڑ رہے تھے۔ وہ کونے والی میز پر بیٹھی تھی۔ اِس نے کیفے آنر سے وائے فائے مانگ لیا تھا جو اس کو ٹورسٹ سمجھتے ہوئے آسانی سے فراہم کر دیا گیا تھا۔

وہ یانگ منی کو kakao app (کوریا کا وٹس ایپ) پر میسج کر دیتی لیکن اُس کے لیے صرف کورین نمبر چاہیے ہوتا ہے۔ اس لیے اِس نے وٹس ایپ انسٹال کیا جو اس نے یانگ منی کو بھی انسٹال کر کے دیا تھا۔ اس نے یانگ منی کا کورین نمبر سیو کیا اور اسے کورین زبان میں لمبا چوڑا پیغام لکھا۔

''آن یانگ ہسیو (اسلام علیکم؟ صبح بخیر) کیسی ہو یانگ منی۔ کیا تم نے صبح کی شراب پی ہے؟ اگر ایسا ہے تو تمہارا دن اچھا گزرے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو پی لو تا کہ تمہارا دن اچھا گزرے۔ آئی نو، اس وقت وہاں تین بج رہے ہوں گے اور تم ابھی بھی سٹور پہ ہو گی، اُداس، پریشان۔ لیکن تم اُداس مت ہونا۔ شاہ میری نوکری ڈھونڈنے میں مدد کر رہے ہیں۔ جلد مجھے اچھی والی نوکری مل جائے گی پھر میں ڈھیر سارے پیسے کما کر تم کو بھیجوں گی۔ تمہیں جیسے یہ پیغام ملے، مجھے جواب دو۔ میں تمہاری خیریت کے بارے میں فکر مند ہوں۔''

چوں کہ وہ شراب نوشی کرتی تھی اس لیے غزارہ کو لحہ لحہ اُس کی خیریت کی فکر ہوتی تھی۔ اوپر سے یانگ منی کو ڈپریشن کے دورے بھی پڑتے تھے اور گھبراہٹ بھی ہوتی تھی۔ اس ذہنی خلفشار میں وہ، اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی لیکن بہت مجبور تھی۔

وہ کالی کافی پی رہی تھی۔ ساتھ ساتھ شیشے سے باہر مرکز میں ہوتی چہل قدمی بھی انجوائے کر رہی تھی۔ اسلام آبادی مہنگی گاڑیوں میں آ جا رہے تھے۔ ہر کوئی سوٹڈ بوٹڈ اور کسی نہ کسی برانڈ کے لباس میں ملبوس تھا لیکن یہاں عجیب سی خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی کوریا میں نہیں ہوتی۔ وہاں لوگ، چھوٹی چھوٹی دکانیں چلاتے ہیں لیکن اتنی بھیڑ بھاڑ اور شور شرابہ ہوتا ہے کہ زندگی کی رمق محسوس ہوتی ہے۔ تر و تازہ چہرے، پر جوش، دن کو محبت سے شروع کرنے والے جب کہ یہاں تو جیسے زندگی کی رمق کہیں نہیں تھی بس موت کا سکوت تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ باہر

دیکھ رہی تھی جب فون کی بپ سنائی دی۔

وہ پیالی رکھ کر فوراً سیدھی ہوئی۔ یانگ منی نے جواب دیا۔

''سلامتی کی دعائیں میری گڑیا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آج سٹور کے باس نے ہمیں ٹیم ڈنر پہ انوائٹ کیا ہے۔ ہمارے اس ہفتے کی سیل بڑھی ہیں، شام کو ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے، مئے پیں گے۔ اچھا ہوا کہ تمہیں جلد جاب مل جائے گی۔ لیکن جاب کی آڑ میں اپنی صحت فراموش مت کر دینا۔ پاکستانی کھانے دھیان سے کھانا۔ کشمیری مرچوں اور گرم مسالوں سے پرہیز کرنا۔ گھی تو بالکل مت کھانا۔ ٹھیک ہے؟''

اس نے جلدی سے ٹائپ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ سمجھ گئی۔ کیا میں بھی تمہیں ایک نصیحت کروں؟''

''جی نہیں۔ تم چھوٹی ہو اور چھوٹے نصیحتیں کرتے اچھے نہیں لگتے۔''

''شراب کم پیو۔ بوائے فرینڈز کو کم گالیاں دو۔ جلدی متاثر مت ہو جایا کرو۔ رات کا کھانا کھا کر سویا کرو۔ بالوں میں کنڈیشنر لگایا کرو۔ ہر وقت انعامی بانڈ نہ خریدو کرو۔ وغیرہ وغیرہ.....'' وہ لکھتی رہی اور آگے سے عجیب عجیب کوفت زدہ ایموجی آتے رہے۔ وہ کونے میں بیٹھی، یانگ منی کو میلوں دور سے تپاتی بہت محظوظ ہو رہی تھی۔

''اچھا یانگ شی.....'' کچھ دیر بعد ایک متفکر سا پیغام آیا۔

وہ جو مزید کوئی لطیفہ ٹائپ کرنے لگی تھی، جلدی سے مٹایا اور ''بولو.....'' لکھ دیا۔

''آج میں ہایون کے پاس گئی تھی۔'' اس نے ایک مشہور کے پاپ سنگر کا نام لیا جس کا کیس بالکل یانگ ہو جیسا تھا۔ غزالہ اس کی بات پر محتاط سی ہو گئی۔

''پھر؟''

''اس نے کہا کہ سارا مسئلہ ہرجانہ بھرنے کا ہے۔ جب تک وہ نہیں بھرے گا، وہ بھائی کی سزا ایسے ہی بڑھاتے جائیں گے جب کہ اوپا (بھائی).....!!''

فقرہ ادھورا تھا۔ غزارا کی دل میں ٹیس اٹھی، اس نے فوراً دل سہلایا۔

''اس لیے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ہم پیسے بھریں۔'' اگلا پیغام روتے ہوئے ایموجز کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے رسماً مسکراہٹ چہرے پر سجائی جیسے خدانخواستہ یانگ منی فون سے اُس کے تاثرات دیکھ رہی ہو۔

''تم فکر کیوں کرتی ہوں یانگ منی۔ میں نے بتایا ناں کہ مجھے جاب مل جائے گی جلد ہی۔ بس تم پریشان نہ ہوں۔ تمہاری صحت خراب ہوجائے گی پھر اپا (بابا) کو ملنے کون جائے گا؟ میں تمہارے سہارے اُن کو چھوڑ کے آئی ہوں۔'' وہ تلخیوں کو جھٹک رہی تھی۔ یانگ منی نے محبت بھری ایموجی بھیجی اور پھر اس نے فون بند کردیا۔

کافی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ سفید کپ سے بے دھیانی میں چھلکے دو قطرے زرد بھوری دھار بناتے ہوئے اس کی سطح پر پھسل کر اب کوسٹر پر پڑے تھے۔ اس کے لبوں کی چھاپ کپ کے کنارے چسپاں تھی جس کا گلوز دھوپ کی کرنوں میں ہلکا ہلکا چمک رہا تھا۔ وہ جس طرف بیٹھی تھی، وہاں سورج کی شعائیں چھن کر آرہی تھیں جس کی وجہ سے اِسے باقی کیفے تاریک لگ رہا تھا۔

بابا کو رہائی ملنا ضروری تھا کیوں کہ اُن کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ خصوصاً اُن کے پھیپھڑے جس میں شاید کوئی انفیکشن ہوگیا تھا۔ جیل میں ہر ہفتے قیدیوں کا باقاعدہ چیک اپ ہوتا تھا، ڈاکٹر آکر اُن کا مکمل معائنہ کرتے تھے۔ اُنہی ڈاکٹر نے جو کبھی بابا کے فین ہوا کرتے تھے، غزارا کو ذاتی ملاقات میں بتایا تھا کہ اُس کے بابا کے پھیپھڑوں کی حالت خراب

ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے جیل میں اُنھیں کوئی مخصوص گیس سونگھائی جا رہی ہے یا پھر وہ جس کمرے میں ہیں وہاں کوئی زہریلی گیس چھوڑی جا رہی ہے تا کہ وہ آہستہ آہستہ پوئزن ہو جائیں اور رہائی سے پہلے ہی فوت ہو جائیں۔

غزارا جانتی تھی کہ یہ حربہ جرائم کی دنیا میں نیا نہیں۔ ایک طرف آپ کو ہرجانے کا کہہ کر رہائی کی یقین دہانی کراتے ہیں اور دوسری طرف آپ کے قیدی کو مار دیتے ہیں اور اس کے بابا کے ساتھ تو شاید جان بوجھ کر یہ کیا جا رہا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اِس عرصے میں کوریا میں نئے نئے آئڈول بنے، نئے بینڈز اور گروپس نے دنیا میں میوزک سے کہرام مچا دیا ہے۔ ایسے میں کبھی اُس کے بابا کا بھی کوئی بینڈ ہوا کرتا تھا، سب بھول چکے ہیں تو کوئی بھی نہیں جو اُن کے لیے stand لے۔ اوپر سے غزارا کے پاس اتنے وسائل، روپے پیسہ بھی نہیں تھا کہ وہ ذاتی طور پر کمپنی کو ہرجانہ دے سکتی۔

وہ اپنی ما کو کھو چکی تھی۔ اپنے اپا کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ ہر ہفتے ملاقات کے اُن پانچ منٹوں میں اُسے اپا ''رہائی'' کی گزارش کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے تمام ساتھی، رہا ہو چکے تھے۔ روز نئے ساتھی آ رہے تھے۔ اب تو اُن کے چہرے پر بڑھاپا اس قدر چھا چکا تھا کہ وہ کہیں سے بھی بیالیس سال کے نہیں لگتے تھے۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ چہرے پر جھریاں آ رہی تھیں اور آنکھیں تو وہ جیسے دھنس کر رہ گئی تھیں۔

شعاعوں میں اُڑتے ذروں کو دیکھتے ہوئے وہ اپا کی صورت یاد کر رہی تھی جنھیں صرف محبت کی سزا ملی تھی۔ ثمن کے جانے کے بعد اُن کی آنکھوں کے دیے بجھ رہے تھے۔ کوئی چمک، کوئی روشنی نہیں تھی۔

''میڈم..... بل.....'' ویٹر نے آہستہ سے مخاطب کیا تو وہ سوچوں کے گرداب سے نکلی۔

پرس سے چند سو نکال کر اُس نے ویٹر کو دیے پھر بیگ اور فون لیے وہ باہر آ گئی۔

کچھ دیر وہ دروازے کے آگے بنی سیڑھیوں پر کھڑی رہی یہ دیکھنے کے لیے کہ اب کس سمت جائے؟ زندگی کے قافلے کو کس راہ پر ڈالے؟ دائیں یا بائیں یا ایک ہی جگہ پر طواف شروع کر دے؟ زندگی کے اپنے اپنے معاملات سنبھالنے والے یہ لوگ جن کی بھیڑ اُسے سامنے نظر آ رہی تھی۔ کس قدر بے خوف تھے۔

پاکستان کا امیر کبیر علاقہ، ہائے فائی لوگ۔ پیسہ ہی پیسہ۔ اُنھیں کیا معلوم کہ یہاں وہ کھڑی، اُن کو دیکھتی، کس قدر اذیت میں ہے۔ اسے اپنا سانس سینے میں اٹکتا محسوس ہوا تو اس نے ایک لمبا سانس کھینچا جیسے آس پاس کی ساری آکسیجن وہ لے لے گی۔ اس قدر لمبے سانس کی وجہ سے اُس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی تو فوراً سانس چھوڑ دیا۔

پھر وہ چلنے لگی۔

دماغ کی گرداب کو قابو کرنے کے لیے اسلام آباد کے اُن علاقوں کی طرف جو اسے شاہ جہاں نے دو سال میں دکھائے تھے۔ کچھ جگہوں کے دھندلے دھندلے عکس تھے اس کے دماغ میں اور کچھ جگہوں کی روشن تصویریں۔ خصوصاً اُس پارک کی جہاں شاہ جہاں اسے لے کر جاتا تھا اور جہاں کے جھولے آج بھی اِسے یاد تھے۔ پندرہ سال کا وقفہ..... علیحدگی، جدائی۔ کیا کیا بدلا ہوگا اُس پارک میں؟ وہ پارک جہاں سے وہ زخم لائی تھی۔

ٹھوڑی کو چھو کر وہ اُداسی سے مسکرائی۔

مگر سب سے پہلے..... ہاں سب سے پہلے اسے جانا تھا.....

ماں کے پاس.....

ماں کے قبرستان.....

اور وہ آئی تھی..... پندرہ سال بعد.....

قبرستان کے گرد پہلے لوہے کی گرل تھی مگر اب اُس کے قد تک آتیں فصیلیں تھیں۔ ایک بڑا سا سیاہ گیٹ بھی جس کا ایک دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر اُس چوکھٹ میں کھڑی رہی پھر زنگ آلود گیٹ کو وا کرتے ہوئے اندر آ گئی۔

شروعات سے چند قدم چھوڑ کر قطار اندر قطار قبریں شروع ہو رہی تھیں۔ قطار کی شکل میں لمبائی سے چوڑائی میں جاتیں، چوڑائی سے لمبائی میں آتیں۔ درمیان میں گزرنے کے راستے تھے جن پر ہری ہری گھاس اُگی تھی جو پندرہ سال قبل نہیں تھی۔ درمیان میں کہیں کہیں سایہ دار درخت بھی تھے۔ قریباً سب ہی قبریں پکی تھیں۔ سنگِ مرمر سے تعمیر کی گئیں، سیمنٹ گارے کی قبریں جن پر مرمریں کتبے کندہ شدہ معلومات کے ساتھ نصب تھیں۔

اِس نے وہاں سے ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی، اسے ماں کی قبر کی جگہ یاد ہی نہیں آ سکی۔ شاید اس قدر تبدیلیوں سے وہ گڑبڑا گئی تھی۔ بیگ کی اسٹریپ کو سہلاتی، وہ پزل نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اسی اثنا ایک گورکن، ہاتھ میں کھرپی لیے اس سمت آیا۔

''سلام بی بی.....'' خاکستری شلوار قمیص پہنے گورکن نے سلام کیا۔

اس نے چونک کر اُسے دیکھا پھر قدرے رسماً مسکرائی۔ ''سلام.....'' ذرا سا جھکی۔

''آپ کسی کی قبر ڈھونڈ رہی ہیں؟'' گورکن نے اندازہ لگایا۔

''جی..... میری ماں کی قبر۔ سولہ سال قبل اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہیں کہیں اُن کی قبر تھی۔ شاید..... شاید اُس درخت کے پاس یا پھر، اُس دیوار کے پاس۔ مجھے یاد نہیں۔ تب میں بہت چھوٹی تھی اور پھر یہ جگہ بھی بدل گئی ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر کہنے لگی۔

''کوئی بات نہیں۔ آپ اپنی امی مرحومہ کا نام بتا دیں۔ فقیر کو اس قبرستان کی ہر قبر اُنگلیوں

کے پوروں یاد ہے جی۔'' گورکن نے سر پہ باندھی صافے کی پگڑی درست کرتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

''اچھا.....'' وہ نرمی سے مُسکرائی۔ ''میری امی کا نام ثمن شاہ تھا۔ وہ اعجاز شاہ کی بیٹی تھیں۔''

''ثمن شاہ.....'' گورکن نے حیرت سے کہا۔ ''آپ شاہ صاحب کے خاندان سے ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''جی۔ میں اُن کی نواسی ہوں۔''

''شاہ صاحب کی قبریں تو اُس طرف ہیں۔ وہاں درخت کے پاس۔ آئیں میں آپ کو لے جاؤں۔'' گورکن اُس کے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کی پیروی میں آگے بڑھی۔ جب ماں کی قبر آئی تو گورکن رُک گیا اور احتراماً غزارا کو اشارہ کیا۔

''یہ رہی آپ کی والدہ مرحومہ کی آخری آرام گاہ.....''

وہ پیروں کے سمت آئی۔ وہ مٹی کی ڈھیری جس پر وہ اُس ڈیڑھ سال میں کئی بار آئی تھی۔ اس وقت سیاہ سنگ مرمر کی چمکتی ہوئی سطح سے ڈھکا ایک مقبرہ تھا۔ ایک چکور کتبہ سرہانے نصب تھا جہاں نام، ولادت و وفات کی تاریخ درج تھی۔

قبر کے ساتھ ایک لمبا قطعہ خالی تھا۔ وہ جگہیں شاہ خاندان نے مرنے والوں کے لیے مختص کی تھیں۔ ما کی قبر کے ساتھ نانی کی قبر تھی جو اُتنی ہی تراشیدہ اور پختہ تھی جتنی کہ ما کی۔

قبر۔ کتنی بھیانک چیز ہے ناں؟ اندھیرا، تنہائی اور وحشت۔ منوں مٹی تلے دم گھٹانے والی چیز۔ کلاسٹروفوبک کرنے والی۔ موت خوفناک نہیں ہوتی، قبر خوفناک ہوتی ہے۔

اسے جانے کیوں وحشت ہونے لگی۔ دم گھٹنے لگا۔ اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی

لیکن کامیاب نہیں ہوسکی۔ وحشت بڑھتی گئی یہاں تک کہ سانس تیز ہوگئی، دل ڈوبنے لگا۔ دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ اس نے بے ساختہ سینہ مسلا لیکن یہ اذیت بڑھتی گئی۔ گورکن اب قریبی قبر کے پاس موجود جھاڑی کو اُکھاڑ رہا تھا۔ کھرپی چلانی کی کھرچ کھرچ مزید وحشت طاری کرنے لگی۔

وہ دعا مانگنا چاہتی تھی نہیں مانگ سکی، اُس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ گرتی، وہ دو قدم پیچھے ہوئی۔ گورکن نے دیکھا، وہ لڑکھڑا رہی ہے پھر وہ سرپٹ دوڑنے لگی۔ گیٹ پر نظریں مرکوز کیے حواس باختہ انداز میں بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گورکن کھڑا ہوا، پلٹ کر قبر کو دیکھا پھر گہرا سانس لے کر سر جھٹک دیا۔

☆.....☆.....☆

باہر آکر وہ دور ایک بوسیدہ سے بنچ پر بیٹھ کر خود کو متعدل کرنی لگی۔ وہ ایسے خوف و ہراس کا شکار نہیں ہوتی تھی، جس قدر اب ہوئی تھی۔ دل میں متواتر ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے بیگ سے ایک دوا نکال کر منہ میں رکھی اور آنکھیں موند لیں۔ ہوا کے دوش سے درختوں کے پتے ہولے ہولے سرسرا رہے تھے جس کی ہلکی ٹھنڈک اِسے اچھی لگ رہی تھی۔

کئی ساعتوں تک وہ اسی طرح رہی، دوا نے اثر دکھا دیا تھا۔ اِس کی گھبراہٹ کم ہوگئی اور حواس کام کرنے لگے۔ اس نے آنکھیں کھول کر آس پاس دیکھا جیسے بیس پچیس منٹ کی نیند سے اٹھی ہو۔ کچی نیم غنودگی والی نیند۔

وہ جہاں بیٹھی تھی، اِکا دُکا لوگ وہاں تھے جو اِسے نہیں دیکھ رہے تھے، اپنے کاموں میں جٹے تھے۔ اپنی حالت کو درست کرنے کے بعد وہ اٹھ گئی۔ سوچ میں وہ پارک آرہا تھا جہاں اس نے غیر معمولی وقت گزارا تھا۔ ماں کی وفات کے بعد وہ قریباً ہر شام وہاں آتے تھے۔ وہاں

کئی قسم کے جھولے تھے، گھنے درخت تھے جن کی چھاؤں میں گھاس کے قطعے تھے جس پر جاگنگ ٹریک بنے ہوئے تھے۔ اسے نام یاد نہیں تھا، ذہن میں بس نقشہ تھا۔ نقشہ تو بدلتا رہتا ہے۔ ان پندرہ سالوں میں بہت کچھ بدلا ہوگا۔ ذہن میں تشویش اُبھری کہ اب وہ کیسے وہاں جائے؟

اس نے دماغ پر زور ڈالا اور سوچنے لگی کہ کوئی مخصوص چیز جو وہاں سے وابستہ ہو، جس کے بدلنے کا اِمکان نہ ہو۔ اسے یاد آجائے۔ پارک کے اندر تو سب بدلا ہوگا مگر باہر..... ہاں پارک کے گیٹ کے آگے کچھ بلڈنگز تھیں۔ شاید پلازے تھے۔ پلازے کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔ وہاں ٹنگے بل بورڈز..... ہاں، وہ یاد آرہے تھے۔

میجر کمال..... مینیجر کمال.....

کلینک..... ہسپتال..... لیبارٹری.....

کمال..... کمال دین..... کمال اسلام.....

کچھ ایسا ہی تھا۔ مینیجر..... میجر..... کمال..... ہاں..... یاد آگیا.....

میجر ریٹائرڈ ڈاکٹر کمال الاسلام کا کلینک ہوا کرتا تھا جس کی لیبارٹری کا بڑا سا بل بورڈ وہاں آویزاں تھا اور پھر ایک رات طوفانی بارش کی وجہ سے اکھڑ گیا تھا۔ بورڈ کے لوہے اور پوسٹر سڑک پر گرے ہوئے تھے۔ اسے یاد آیا، اس نے پوچھا تھا شاہجہاں سے کہ بورڈ کو کیا ہوا تب اُس نے بارش کا بتایا تھا۔

اسی جھلک کے تعاقب میں وہ چلتی، سڑک پر آگئی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے وہ ایک پرہجوم مقام پر پہنچی جہاں کئی گاڑیاں، دکانیں، ٹھیلے اور لوگ تھے۔ وہاں اسے ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی والے کو اِس نے پارک، ڈاکٹر کلینک وغیرہ کا بتایا تو اُس نے فوراً پہچان لیا۔ متعلقہ مقام پر

پہنچانے کی یقین دہانی کروا کر وہ ٹیکسی میں بیٹھی چلی آئی۔

پندرہ منٹ بعد وہ پارک کے سامنے تھی۔

جیسا اِس نے سوچا تھا۔ ویسا ہی ہوا۔ پارک کا قریہ قریہ بدل گیا تھا۔ جھاڑیوں اور بیل دار پودوں سے ڈھکی فصیلوں کے عقب میں چھایہ دار درختوں کے جھرمٹ تھے۔ یہ وہ درخت تھے جو پندرہ سال قبل وہاں بوئے گئے تھے، اب تناور گھنیری شاخوں والے شجر سایہ دار بن گئے تھے۔ وہ قدم قدم چلتی ہوئی اندر آ گئی۔

پارک میں اس وقت رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ ماسوائے کچھ خواتین، مالی اور پارک کے گارڈز کے وہاں کوئی نہیں تھا۔ خواتین جاگنگ کر رہی تھیں جب کہ مالی پودوں کی کانٹ چھانٹ میں لگے ہوئے تھے۔ پارک میں ہجوم ہمیشہ شام کو یا پھر اتوار والے دن ہوا کرتا تھا جب والدین بچوں کو لیے یہاں چلے آتے تھے۔

وہ اطراف پر خوشگوار یک متحیر نگاہیں ڈالتی ہوئی اُس عرشے میں آئی جہاں جھولے تھے۔ جھولے خالی تھے۔ وہ حیران ہوئی کہ تمام جھولے یکسر بدل گئے ہیں۔ پہلے یہاں جدا جدا جھولے لگے ہوتے تھے۔ پینگیں الگ تھیں، سی سا الگ تھا، سلائڈز دور دور تھیں۔ اب وہ گنجلک ہو گئی تھیں۔ لوہوں کا بڑا سا ٹیڑھا میڑھا سانچا تھا جس میں ہر جھولا ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ پہلے نیچے پتھریلی روش ہوا کرتی تھی، اب گھاس اور مٹی تھی۔

وہ اسی عرشے میں کھڑی ماضی میں لوٹ گئی۔

یہاں اس کا ایک چھوٹا سا لڑکا دوست بنا تھا۔ وہ ہر شام ماں کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ اس کی ماں باقی خواتین کے ساتھ مل کر گپ لگاتیں اور وہ دونوں مل کر جھولے لیتے۔ شاہجہاں اکثر جاگنگ کرتا تھا۔ اُس دن وہ اسی لڑکے کے ساتھ پینگیں لے رہی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ لڑکا

نہیں آیا تھا۔ غزارا اُس سے نہ آنے کی وجہ پوچھتے ہوئے بولی۔

''میرے ماموں کی شادی تھی۔ ہم لاہور گئے تھے۔''

''کیا تھی؟'' اب کے وہ ٹھٹکی۔

''ماموں کی شادی.....''

''وہ کیا ہوتی ہے؟''

گو کہ اس نے شادی کا لفظ سُنا تھا لیکن وہ مفہوم سے واقف نہیں تھی۔

''کتنی بدھو ہو تم..... تمہیں شادی کا نہیں پتا.....''

''میں کورین ہوں ناں۔ کیسے پتا ہوگا؟'' اس نے معصومیت سے پلکیں جھپکیں۔

''شادی میں اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ بہت میوزک ہوتا ہے۔ اچھا کھانا ہوتا ہے۔ بہت سارے لوگ آتے ہیں۔ سب ڈانس کرتے ہیں۔''

''پارٹی ہوتی ہے کیا وہ؟''

''ہاں ناں۔ بڑی والی پارٹی۔ پتا ہے۔'' وہ شرمیلی سی مسکان کے ساتھ تھوڑا قریب ہوا۔ ''اس میں دلہا دلہن بھی ہوتے ہیں۔ ماموں دلہا بنے تھے۔ اتنے ہار پہنے تھے انھوں نے..... پیسوں والے بھی تھے۔''

''دلہا کیا ہوتا ہے؟''

''پتا نہیں۔ بس کچھ ہوتا ہے۔'' لڑکے نے شانے جھٹک کے کہا۔ وہ شش و پنج میں آ گئی تھی۔ شادی کیا ہو سکتی ہے؟ شاہ سے پوچھے گی وہ، وہ بتا دیں گے۔ اس نے سوچا۔

جب شاہجہاں جاگنگ کر کے واپس آیا تو وہ دونوں بینچ پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ شاہجہاں بوتل سے پانی پی رہا تھا۔ اس کی سفید ٹی شرٹ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور وہ پھونکنی کی طرح

سانس لے رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں شاہ.....'' اس نے حسبِ معمول پراسرار انداز میں کہا۔

''پوچھو.....'' وہ پانی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

''شادی کیا ہوتی ہے؟''

شاہجہاں کے منہ سے پانی پھوار بن کر نکلا۔

''کیا کہا؟''

''آحل اپنے ماموں کی شادی پہ گیا تھا۔ یہ شادی کیا چیز ہوتی ہے؟''

شاہ جہاں نے منہ آستین سے رگڑا اور سوچ میں پڑ گیا کہ اب اِس سوال کا کیا جواب دے۔ کبھی کبھی بچے ایسے سوال پوچھ لیتے ہیں کہ بندہ جواب تلاش ہی نہیں کر پاتا۔ بوتل کو ڈھکن چڑھا کر اس نے ایک طرف رکھ دی۔ غزارا اس کو منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''شادی.....'' اس نے سر ہلا کر کہنا شروع کیا۔ ''شادی ہوتی ہے ایک پارٹی۔ اس پارٹی میں دو لوگ، ایک لڑکا، ایک لڑکی وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔''

''صرف لڑکا لڑکی؟'' غزارا کی آنکھیں پرسوچ انداز میں چھوٹی ہو گئیں۔

''ہاں۔''

''وہ ساتھ رہتے ہیں پھر؟''

''ہاں۔''

''الگ نہیں ہوتے؟''

''ہو سکتے ہیں اگر وہ چاہیں۔''

''اگر نہ چاہیں تو نہیں ہو سکتے؟''

''نہیں۔''

''کوئی بھی لڑکا لڑکی ایسا کر سکتے ہیں؟'' اس نے سوال کا رُخ ایک فیصلے کی طرف موڑ دیا جس سے شاہجہاں بے خبر تھا۔

''ہاں۔''

''پھر ٹھیک ہے۔ میں بھی آپ سے شادی کروں گی پھر ہم بھی ساتھ رہیں گے ہمیشہ۔''

شاہجہاں نے بھونچکا کے اُسے دیکھا۔ وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔

''کیا کہا تم نے؟'' اس کو یکدم ہنسی آ گئی۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ایک پارٹی رکھیں ناں۔ اس میں ہم دونوں بھی وعدہ کر لیں گے۔'' وہ اس کا بازو پکڑ کر ضدی لہجے میں بولی۔

''دماغ ٹھیک ہے لڑکی۔ شادی صرف بڑوں کی ہوتی ہے۔ چھوٹوں کی نہیں ہوتی اور بچوں کی تو بالکل نہیں ہوتی۔'' شاہجہاں نے اپنا بازو چھڑا لیا۔

''بچوں کی نہیں ہوتی۔''

''نہیں۔'' سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کتنے بڑے ہو جاؤ تو ہوتی ہے؟''

''کم از کم بیس سال۔'' شاہجہاں نے تپے ہوئے انداز میں کہا اور بوتل اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ غزارا نے ہاتھوں کی اُنگلیاں کھولیں۔ شاہجہاں بوٹ کے تسمے کس رہا تھا۔

''میں چھ سال کی ہوں۔ ایک، دو، تین..... مجھے پورے چودہ سال لگیں گے۔''

شاہجہاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بوٹ کے تسمے کس کر سیدھا ہوا۔

''چلو چلتے ہیں۔ دیر ہوگئی ہے۔'' اس نے غزارا کو ہاتھ دیا تو وہ بنچ سے پھدک کر اُتری پھر وہ اس کا ہاتھ تھامے ٹریک پر اُچھل اُچھل کر چلنے لگی۔

''جب میں بیس سال کی ہو جاؤں گی تو شاہ سے شادی کروں گی۔'' وہ کورین میں بڑبڑا رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا شاہجہاں اتنا ہی ہوگا بس اسے بڑا ہونا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ شاہجہاں کی عمر بھی تو بڑھے گی۔

بنچ ویسا ہی تھا۔ وہ اس پر متمکن وہ لمحے یاد کر رہی تھی۔ یہ بنچ دونوں کی خاص نشست تھی کیوں کہ یہاں سے جھولوں کا سارا عرشہ نظر آتا تھا اور شاہجہاں یہاں بیٹھ کر اسے کھیلتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اسے یاد آیا، اسی بنچ سے ہی تو وہ گری بھی تھی اور ٹھوڑی پہ چوٹ آئی تھی جس کے زخم کا نشان کوریہ جانے کے بعد ختم ہوا تھا۔

اس نے جھک کر وہ جگہ دیکھی جہاں وہ گری تھی۔ تب بنچ کے نیچے کی روش پتھریلی ہوا کرتی تھی۔ اب وہاں گھاس تھی۔ اگر اُس وقت بھی ہوتی تو اِسے یہ چوٹ نہ لگتی اور چوٹ نہ لگتی، تو یہ یاد کیسے بنتی؟ یادیں، چوٹوں سے زندہ ہوتی ہیں۔

یہی سوچ کر وہ کھڑی ہوگئی۔

سب کتنا nostalgic تھا۔ جانے کتنے وقت تک وہ وہاں پھرتی رہی پھر وہ اوبر سے مختلف مراکز میں، چیدہ چیدہ ریستوران میں گھومی جہاں اس نے کبھی کھانے کھائے تھے، کبھی مزے کیے تھے۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر لور لور پھرتی، یادوں سے جھجتی وہ شام چار بجے تھک ہار کر ایک بس سٹاپ کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس سارے وقت میں اُس کے دماغ سے بابا کی سوچیں نکل گئی تھیں۔ وہ قدرے پرسکون ہوگئی تھی۔

بس تو یقیناً نہیں آنی تھیں۔ وہ وہاں پہ اوبر بلانے لگی۔ picking request بھیج کر وہ انتظار کرنے لگی۔ اُس کے ساتھ دوسری سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ شلوار قمیص پہنے، گلے میں مفلر کی طرح دوپٹہ ڈالے۔ اُس کا پرس سائیڈ سے لٹکا ہوا تھا اور وہ ہینڈ فری لگائے کوئی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے یونہی، ایک نظر اُس کی اسکرین پہ ڈالی۔ وہاں کوئی کورین ڈرامہ آرہا تھا۔ وہ مسکرادی۔ یعنی یہاں بھی اسی مشغولیت سے ڈرامے دیکھے جاتے تھے جیسے وہاں دیکھے جاتے ہیں۔

اس نے پھر نظر ڈالی پھر یکدم ہی وہ ٹھٹک گئی۔ اسکرین پر کسی بھی قسم کے subtitles نہیں آرہے تھے۔ اسکرین پلین تھی تو کیا وہ لڑکی کوئی کورین تھی؟ اس نے بغور اُس کا چہرہ دیکھا۔ وہ عام سی پاکستانی نقش ونگار والی لڑکی تھی پھر کیا اُسے کورین آتی تھی۔

''بات سنو.....'' اس نے انگلی سے اس کے کندھے پر ٹھوکا۔ لڑکی چونکی، اپنی ہینڈ فریز اُتارے۔

''جی؟''

''کونسا ڈرامہ دیکھ رہی ہیں؟'' اِس نے پوچھا۔

''وہ جو کہہ دے مجھے..... کورین ڈرامہ ہے۔ کیوں؟''

''وہ جو کہہ دے مجھے.....؟'' اس نے دہرایا پھر اچنبھے سے اسکرین کو دیکھا۔ وہ لی من ہو کا ڈرامہ ''The Heirs'' تھا۔ وہ لڑکی اس کو ''وہ جو کہہ دے مجھے'' کیوں کہہ رہی تھی؟

''اس کا نام دی ہیرس ہے۔'' اس نے بتایا۔

''جی۔'' وہ سمجھی نہیں۔

''یہ جو ڈرامہ ہے۔ اس کا نام دی ہیرس ہے۔ وہ جو کہہ دے مجھے نہیں ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''نہیں تو۔ وہ جو کہہ دے مجھے ہے۔ یہ دیکھو۔'' لڑکی نے caption دکھایا جہاں ''wo jo keh de muhjy'' لکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک اور لفظ تھا جس کی طرف اس کی توجہ مبذول ہوئی تھی۔ ''Urdu dubbed''

''اوہ.....تو اُردو ڈب میں دیکھ رہی ہیں؟''

''جی۔'' لڑکی نے سر ہلایا۔ ''آپ کورین ہیں؟''

''نہیں تو۔ دیکھو کتنی اچھی اُردو بولتی ہوں۔ لگتی ہوں کورین؟''

لڑکی تھوڑی جز بز ہوئی پھر سر جھٹک دیا۔

''آف کارس نہیں۔'' اس نے واپس ہینڈ فری چڑھا لی۔

یعنی پاکستان میں کوریہ کے ڈرامے ڈب کیے جا رہے تھے۔ اِسے یاد آیا، ایک اسکول کے لیے ایک اُردو پلے کو اس نے کورین میں ترجمہ کیا تھا اور ڈب بھی جس پہ اِسے اُس اسکول نے اچھی رقم دی تھی۔

ڈبنگ، ترجمہ، پروموشن، ڈیلیوری، ریڈنگ، رائٹنگ یہ ایسی چیزیں تھیں جو وہ کوریا میں بطور نوکری کرتی آئی تھی۔ اس نے دوبارہ یونہی دیکھا تو اسکرین پر ڈرامہ جس چینل نے ڈب کیا تھا، اُس کا نام آ رہا تھا۔ وہ کچھ پر سوچ انداز میں اس لوگو کو دیکھتی رہی پھر اس کے دماغ میں ایک جھماکا ہوا۔

اگر وہ اس چینل کے پاس چلی جائے اور اپنی ڈبنگ صلاحیتوں کو پیش کرے تو ممکن ہے کہ وہ اِسے کچھ گھنٹوں کی جاب دے دیں۔ گو کہ شاہجہاں اُس کے لیے تلاش رہا تھا لیکن اِسے پارٹ ٹائم جاب بھی کرنی تھی تو کیا ہی اچھا ہو کہ وہ یہاں خود اپلائی کر لے؟

یہی سوچ کر اِس نے رائیڈ میں لوکیشن بدل کر اُس چینل کے ہیڈ کوارٹر کی ڈال دی۔

تھوڑی دیر بعد رائیڈ آئی تو اس نے لڑکی کا ذرا سا جھک کے شکریہ ادا کیا اور چینل کے لیے روانہ ہوگئی۔

وہ کوئی نجی چینل تھا۔ کیوں کہ جب اوبر نے اُسے اُتارا اور اس نے سر اٹھا کر اس بورڈ کو دیکھا جو چینل کی نشاندہی کر رہا تھا تو وہ سمجھ گئی کہ یہ ایک چھوٹا سا چینل ہے جو شاید ابھی کھلا ہو یا پھر محدود وسائل میں چل رہا ہو۔ عمارت چھوٹی ضرور تھی لیکن خستہ حال نہیں تھی۔ بھورے گیٹ پر مستعد چوکیدار اسلحے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اندر ایک پتھریلی روش تھی جس کے اطراف میں سبزہ نظر آ رہا تھا۔

وہ چوکیدار سے پوچھ کے اندر داخل ہوئی تو اِسے عمارت کا دروازہ کھلا ملا جہاں اُس کی نگاہ تیزی سے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی رسپشنسٹ تک گئی۔ اِس نے دعا سلام کے بعد اپنی آمد کا بتایا جس پر لڑکی نے اُسے ڈائریکٹر سے ملوانے کے لیے کچھ دیر انتظار کا کہا لیکن اسے زیادہ وقت نہیں رُکنا پڑا۔ جلد ہی عام سے حلیے میں ملبوس، سر پہ ٹوپی رکھے وسط عمر کا آدمی اس سے ملنے کے لیے آ گیا۔

اسے خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ ڈائریکٹر جس کا نام عثمان تھا، اُس سے بڑی گرم جوشی سے ملا۔ اس کی خیریت دریافت کی اور پھر اُسے لے کر ایک کمرے میں آ گیا جو شاید سٹنگ روم تھا۔ وہاں اور بھی لڑکیاں، لڑکے، وسط عمر کے لوگ اور بزرگ آرٹسٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ روم میں خوب گپ شپ ہو رہی تھی جس کی آواز اسے کم از کم باہر تک نہیں آئی تھی۔

روم کی ایک دیوار شیشے کی تھی جس کے پار ایک کمرہ تھا۔ لاؤنج نما اور پھر ایک اور کمرہ تھا۔ ریکارڈنگ روم جہاں بڑا سارا ایل ای ڈی لگا تھا، مائیک تھے اور ریکارڈنگ کے آلات..... وہاں ایک لڑکی ہیڈ فون پہنے، ہاتھ میں کاغذ پکڑے، اسکرین کو دیکھتے ہوئے لائنز پڑھ رہی

تھی۔اِس کو اُسی روم میں لایا گیا تھا۔

''آپ اِدھر کھڑی ہو جائیں۔'' ڈائریکٹر نے کہا اور خود سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔اس کے ساتھ دائیں بائیں دو لوگ اور تھے جو شاید ریکارڈنگ ایکسپرٹ اور مترجم ہوں گے۔غزارا کو یہی لگا۔

فنکار لڑکی ٹھیک بول رہی تھی لیکن مسئلہ اُس کے انداز میں آ رہا تھا۔وہ جس کو dubb کر رہی تھی۔وہ ہیروئن تھی۔اُس کا انداز بالکل الگ تھا اور فنکارا کا بالکل جدا۔کچھ دیر تک جب لڑکی ہیروئن کا انداز capture نہیں کر پائی تو ڈائیریکٹر نے ''کٹ'' بول دیا۔فنکارا نے گہرا سانس لے کر ہیڈفون اُتار دیے۔

اب ڈائریکٹر کُرسی پر اُس کی طرف پلٹا۔

''کیا نام بتایا تھا آپ نے؟''

''غزارا.....''

''غزارا۔'' اس نے پرسوچ انداز میں دہرایا۔''ڈبنگ آتی ہے۔کبھی lipsing کی ہے کسی چیز پر، ڈرامے، گانے یا کسی شو کے لیے؟''

''جی۔کوریہ میں ایک اُردو پلے کو کورین میں ڈبڈ کیا تھا۔'' وہ ایک ہاتھ کی کلائی پکڑے مؤدب سی کھڑی تھی۔بیگ کراس میں کولہے پر لٹک رہا تھا۔

''آپ کی اُردو صاف ہے، کیا آپ کو دونوں زبانیں آتی ہیں؟''

''جی۔'' اس نے سر ہلایا۔

ڈائریکٹر نے انگلی سے اسکرین کی طرف اِشارہ کیا۔''یہ والا ڈرامہ دیکھا ہے کبھی؟''

اس نے ہاں کیا کیوں کہ وہ کوریہ میں چار سال قبل چلا تھا اور بے حد مشہور ہوا تھا۔

''اس ہیروئن کا انداز بہت مشکل ہے۔ ہونٹوں کی حرکت، آنکھوں کی جنبش اور تاثرات ہم سے balance نہیں ہو رہے۔ کیا آپ یہ کر لیں گی؟'' ڈائریکٹر کا انداز جھلایا ہوا تھا۔

فنکارا ریکارڈنگ روم سے اس والے روم میں آ گئی تھی۔

اس نے ایک باریک نظر ہیروئن پر ڈالی۔ وہ صرف اِس ڈرامے میں ہی نہیں، ہر ڈرامے میں اپنے تاثرات کی وجہ سے مشہور تھی۔ وہ اس طرح ایکٹنگ کرتی تھی کہ سین میں جان پڑ جاتی تھی۔ وہ تیزی سے جملے ادا کرتی تھی اور بمشکل اُسے کے ہونٹ ہلتے نظر آتے۔ وہ کسی بھی فنکارا کے لیے ایک challenge ہو سکتی تھی مگر چوں کہ وہ خوب جانتی تھی کہ کورین میں وہ کیا کہہ رہی ہے تو اسے کیچ کرنا آسان تھا۔

ڈائریکٹر نے ایک کاغذ اُس کی طرف بڑھایا جس میں ہر مکالمے کا اُردو ترجمہ لکھا تھا۔

''اُردو پڑھ لیتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی۔ لکھ بھی لیتی ہوں۔'' اس نے کاغذ تھامتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم دس پندرہ منٹ لے لو، اس سین کو غور سے دیکھ لو پھر ہم آ کے آپ کا ڈیمو لیتے ہیں۔'' ڈائریکٹر اور باقی لوگ وہاں سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ وہ اسکرین کے قریب چلی آئی۔ فنکارا لڑکی، اُدھر ہی کھڑی اِس کو دیکھنے لگی۔

دس بارہ منٹ میں اس نے ہیروئن کی شخصیت کو بھانپ لیا تھا۔ ایسی لڑکیاں تو کوریہ میں بہت تھیں۔ وہاں اتنے سال رہنے کے بعد لڑکیوں کے انداز، ادائیں جانچنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔

اس نے کورین مکالموں کے ساتھ، اُردو کا ترجمہ ملایا تو اسے احساس ہوا کہ جو کورین جملے وہ چند اُردو لفظوں میں ادا کر سکتے ہیں، ان کی جگہ یہاں مترجم نے لمبے جملے لکھے ہیں جس کی

ادائیگی دیر سے ہونے کی سبب ہیروئن کے ساتھ lipsing نہیں ہو پا رہی تھی۔

اس نے ہولڈر سے پین اٹھا کر جملوں میں ردو بدل کیا، بڑے روزمرہ کو چھوٹا کیا، محاروں کو درست کیا، لفظیات ختم کیں پھر اس نے ادائیگی کی کوشش کی تو ہیروئن کے ساتھ وہ ملی سیکنڈ کے وقفے سے match ہو رہی تھی۔

''تم ترجمہ نہیں بدل سکتیں۔ مترجم ناراض ہوں گے۔'' فنکار الڑکی نے بے زاری سے آگاہ کیا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ دیوار سے کندھا جوڑ کر کھڑی تھی۔ ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے تھے۔

''مگر ترجمہ اگر صحیح نہ ہو تو؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''کیا تمہیں مترجم سے زیادہ آتا ہے؟''

''زیادہ نہ سہی مگر ''ٹھیک'' ضرور آتا ہے۔'' وہ گہری مسکرائی۔

''ایسا ہے تو پھر ٹرائی کرو۔ میں نے یہ سین بیس مرتبہ کیا ہے۔ نہیں ہوا۔ تم کر لو۔ دیکھتے ہیں تم کر سکتی ہو یا نہیں۔'' وہ کرسیوں کی سمت آئی اور اسے ریکارڈنگ روم میں بھیجا۔ وہاں بھی ایسی ہی ایل ای ڈی اسکرین تھی۔ اس نے ہیڈ فون پہنا، مائیک کے قریب منھ کیا اور اسکرین کو دیکھتے ہوئے مکالموں کی lipsing کرنے لگی..... فنکار الڑکی شیشے کی اسکرین سے اُسے بغور دیکھ رہی تھی۔

کچھ ہی جملے تھے جو اُس نے پڑھے، اُس کے بعد فنکار الڑکی تیزی سے باہر نکلی اور ڈائریکٹر اور باقی اسٹاف کو بلا کر لائی۔ غزارا منہمک سی بولی جا رہی تھی۔ وہ اسکرین کے پار سے اُسے دیکھنے لگے۔ ہیروئن میں غزارا نے جو چیز پکڑی تھی وہ ہیروئن کی ''ادا'' اور ''ادائیگی'' تھی۔ وہ انداز تھا جس نے ادائیگی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ فنکار الڑکی، یہ ادا نہیں پکڑ پا رہی

تھی۔آخری مکالمے بولنے کے بعد اس نے اسکرین سے ڈائریکٹر کو دیکھا۔

''ہم ریکارڈ کر رہے ہیں، آپ دوبارہ بولیے.....'' ڈائریکٹر نے جلدی جلدی آلات آن کر کے، کرسیاں کھینچیں۔اس نے دوبارہ پڑھا لیکن پڑھتے ہوئے ڈائریکٹر ٹھٹکا۔

''ایک سیکنڈ.....رُکیں.....'' اس نے ہاتھ اٹھایا۔

''کیا آپ نے مکالمے بدلے ہیں؟''

''جی۔'' اس نے فوراً اعتراف کیا۔''اُردو کے جملے بڑے تھے، جس کی وجہ سے ہیروئن کے ساتھ ادائیگی میچ نہیں ہو رہی تھی۔اگر ہم اس کو جلدی بھی پڑھیں گے تب بھی ہیروئن کی اسپیڈ کو نہیں پکڑ سکتے۔''

ڈائریکٹر نے مترجم کو دیکھا جس کی تیوری گہری ہوگئی تھی اور وہ ناگواری سے غزارا کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ پلیز ناراض نہ ہوں مگر میں ایک عرصے تک مترجم رہی ہوں۔میں جانتی ہوں کہ اُردو کا کونسا ''ایک'' لفظ، کورین زبان کے پورے ''جملے'' کا متبادل ہوسکتا ہے۔اگر ہم اتنے بڑے بڑے جملے لکھیں گے تو ہیروئن کی ادا نہیں پکڑ سکتے۔''

''اور سمجھ بوجھ کا کیا محترمہ۔کیا سامعین کو آپ کا انداز سمجھ آئے گا؟'' مترجم نے جل کر پوچھا۔

''یہ میں نے ترجمہ کیا ہے۔کیا آپ کو نہیں سمجھ آیا سر؟''

مترجم کے نتھنے پھول گئے جب کہ ڈائریکٹر مسکرا دیا۔اُسے شو کے لیے ہیروئن کی ڈبر اور مترجم مل چکی تھی۔اُس دن اُس نے چینل سے شو کا کانٹریکٹ سائن کیا۔شو آن ائیر تھا۔چار اقساط آچکی تھیں۔دو ڈبڈ تھیں جب کہ ساتویں کی ڈبنگ ہو رہی تھی۔اسے پراجیکٹ کے

حوالے سے پیسے ملنے تھے۔

ڈیمو کے بعد وہ ڈائریکٹر کے آفس میں بیٹھی تھی۔

"پے منٹ پراجیکٹ در پراجیکٹ ہوتی ہے۔ آپ پورا پراجیکٹ ریکارڈ کرائیں گی تو آپ کو تین لاکھ روپے ملیں گے۔ چوں کہ اس کی کچھ اقساط ہم کرا چکے ہیں تو آپ کو ڈھائی لاکھ ملیں گے۔ ریکارڈنگ کا وقت صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک ہے۔ اس میں جتنی ریکارڈنگ ہو سکتی ہے ہم کرتے ہیں۔ چوں کہ آپ ہیروئن ہیں، اس لیے آپ کے سین زیادہ ہیں اور پے منٹ بھی۔ یہ رہا کانٹریکٹ، اسے سائن کر دیں میں آپ کو ایڈوانس پے منٹ کا چیک دیتا ہوں۔"

ایڈوانس پے منٹ کا سُن کے اُس کی باچھیں کھل گئیں۔

اسے بالکل اُمید نہیں تھی کہ اتنی جلدی یہ کام ہو جائے گا۔ واقعی انسان میں قابلیت اور ہنر یکجا ہو جائیں تو تقدیر اُس کے لیے ہر راستہ صاف کر دیتی ہے۔ اُس دن شام کو جب وہ لوٹی تو اِس کے ہاتھ میں ایک لاکھ کا چیک تھا۔ بینک بند نہ ہو چکے ہوتے تو وہ اِسے جمع بھی کروا چکی ہوتی۔ dubbing اس کے لیے مشکل نہیں تھی۔ اس کے لیے تو اب کچھ بھی مشکل نہیں تھا جب تک کہ وہ بابا کی رہائی کا عزم لیے ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

قریباً آٹھ بجے وہ حویلی پہنچی تھی۔ بیگ کی اسٹریپس کو سہلاتی، وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ وہاں کئی لوگوں کو بیٹھے دیکھا۔ حلیمہ، ماموں، ممانیاں کزنز بچے سب ہی تھے۔ اِس کے آتے ہی سیدھے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

وہ جو تیز تیز قدم لے رہی تھی، خود بخود رُک گئی۔ سب کی پرتپش نظریں اُسے کنفیوز کر رہی

تھیں۔ کیا ہوا تھا۔ سب ٹھیک تھا۔ دل میں کئی خدشے اٹھے۔

اسے آتا دیکھ کے حلیمہ فٹافٹ اُٹھ کے اُس کے پاس گئی۔ ''آپ ٹھیک ہیں؟''

''ہاں کیوں؟'' وہ متوحش ہوئی۔

''آپ کہاں گئی تھیں اور آپ نے کسی کو بتایا کیوں نہیں؟''

''کیا یہاں کسی کو بتا کر گھر سے باہر جاتے ہیں؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں.....'' یہ شاہ جہاں کی آواز تھی جو تیز تیز سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ ''بتا کر بھی جاتے ہیں اور لیٹ ہو جانے پر دوبارہ کال کرتے ہیں لیکن آپ تو ایسی زحمت کریں گی نہیں۔''

وہ آخری سیڑھی پھلانگتا، اگلے لمحے اُس کے سامنے آ رُکا۔

''مسن کھنی الیا.....؟'' اس نے کوفت سے ہاتھ جھلایا۔

''اُردو بولو۔''

''کیا ہو گیا ایسا؟ باہر ہی تو گئی تھی۔''

''بتا کر نہیں جا سکتی تھیں۔ ہم کتنا پریشان ہو گئے تھے تمہارے لیے۔ صبح کی نکلی ہو تم اور اب لوٹ رہی ہو۔ اکیلی تھیں۔ کچھ ہو جاتا تو۔ نیا شہر ہے۔ نیا ملک ہے۔ کوئی اتنا لاپرواہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''نیا شہر؟ نیا شہر تو نہیں ہے۔ میں یہاں رہ چکی ہوں اور مجھے اُردو بھی آتی ہے۔ کرانی سنگون یوب سو۔'' وہ بری بری نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''لیکن آپ گئی کہاں تھیں؟'' عالم شاہ نے تجسس سے پوچھا۔

''فون رجسٹر کرانے اور سم لینے.....''

''تو یہ مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھیں؟'' شاہ جہاں نے لتاڑا۔

''کب کہتی؟ رات کو تو یوں ٹھاہ کر کے دروازہ بند کیا تھا آپ نے اور صبح یونہی چلے گئے۔ مجھے فوری طور پر چاہیے تھا یہ سب۔ اس لیے خود ہی جانا پڑا۔'' وہ پیشانی پر بل ڈالے، خفگی سے بولی۔

شاہ جہاں نے کچھ دیر اُسے دیکھا پھر گہرا سانس چھوڑ دیا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن آئندہ تم بغیر بتائے نہیں جاؤ گی۔ سمجھ گئیں؟''

''سمجھ گئی۔'' اس نے اترا کے کہا۔ سب اُسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بہت شرمندہ ہو رہی تھی۔

''اب فون دو اپنا.....''

اس نے سیدھے طریقے سے فون اُسے پکڑا دیا۔ شاہجہاں نے جلدی سے اپنا فون نمبر وہاں لکھا پھر خود کو مسڈ کال دی۔ ''میرا نمبر سیو کرو اور دوبارہ جب بھی جانا ہو تو مجھے بتا کر جانا۔ حلیمہ اسے کھانا دو اور تم (غزارا کو غصے سے دیکھا) کھانا کھانے کے بعد مجھ سے کمرے میں آ کر ملو۔ تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

اس تحکم پر لاؤنج میں سب نے پہلو بدلے تھے لیکن وہ کسی کی پرواہ کیے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ اُس کی پشت کو دیکھنے لگی۔ (کھڑوس کہیں کا، پتا نہیں آج جلدی کیسے آ گیا۔)

جلدی جلدی دھودھا کر اِس نے کھانا کھایا اور پھر وہ شاہجہاں کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے درز سے طاہرہ بیگم اُسے شاہجہاں کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

کریم رنگ کے ڈھیلے سے ٹروذر پر ڈھیلی ہی ٹی شرٹ پہنے، بغیر دوپٹے کے، وہ بالوں کو سہلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ چال سے ہی بے زاری نظر آ رہی تھی۔ یکدم اُن کی کن پٹیاں جلنے

لگیں۔ یہ لڑکی، یہ لڑکی اُن کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔

شاہجہاں کے کمرے کے آگے پہنچ کر اُس کی بیزاری، غصے میں بدل گئی۔ ناک کر کے وہ یونہی اندر آ گئی۔ شاہ جہاں صوفے پر بیٹھا، کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ آنکھوں پر فریم لیس چشمہ تھا

''دروازہ بند مت کرو۔'' شاہجہاں نے اُسے دروازہ بند کرتے دیکھا تو تیزی سے کہا لیکن اُس نے پھر بھی بند کر دیا۔ ضدی تو وہ ازل سے تھی۔ شاہجہاں نے گہرا سانس لے کر کتاب میز پر رکھی، پھر دروازے تک خود گیا اور اِسے پورا کھول دیا۔ غزارا نے جل کر منہ جھٹکا تھا۔

''بیٹھو.....'' وہ پلٹ کر صوفے کی طرف آیا تو اسے بدستور کھڑا دیکھ کے بولا۔ وہ اُس کے سامنے والے صوفے میں دھنس گئی۔ چہرہ بری طرح اُترا ہوا تھا۔

''موڈ ٹھیک کرو اپنا۔ غلطی تمہاری تھی۔'' شاہ جہاں نے ایک نظر اِسے دیکھا۔

''اور آپ نے جو مجھے سب کے سامنے ڈانٹا وہ کیا تھا؟''

''میں نے ڈانٹا نہیں تھا..... میں نے.....''

''آپ نے میری نظر اُتاری تھی۔ ہونہہ!'' وہ تیزی سے بولی۔

''بے وقوف لڑکی مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔''

''اچھا۔ فکر ہو تو سب کے سامنے ڈانٹتے ہیں؟'' اس نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''شکر کرو میں نے تمہیں ایک ہاتھ جڑ نہیں دیا۔ ورنہ لائق تم اِسی کی تھیں۔''

''تم مجھ پہ ہاتھ اٹھانے کی بات کر رہے ہو؟'' وہ صدمے سے اُسے دیکھنے لگی۔

''اب بغیر بتائے لور لور پھرو گی تو ہاتھ ہی اٹھاؤں گا ناں؟''

''لور لور نہیں پھر رہی تھی، ما کی قبر پہ گئی تھی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ شاہ جہاں جو میز پر پڑی ڈیکوریشن پیس کو درست کر رہا تھا، ایک لمحے کو جیسے سکتے میں آ گیا۔ ساری تیوری

بھک سے اُڑ گئی۔ اس نے کمزور اعصاب کے ساتھ غزارا کو دیکھا جو نم آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری۔'' وہ ملامت سے سیدھا ہوا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔ تم بتاؤ تم نے کیوں بلایا ہے مجھے؟ کیا بات کرنی تھی؟'' وہ فوراً سے بیشتر سنبھل گئی۔ شاہ جہاں نے گہرا سانس لیا۔

''تمہاری جاب کے سلسلے میں بات کرنی تھی۔''

''بولیں۔ سن رہی ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''میرا ایک دوست ہے اُس کے بھائی نے حال ہی میں، یہاں ایف سیکٹر میں کورین ریستوران کھولا ہے۔ ابھی چھ مہینے ہوئے ہیں۔ اُس کے ساتھ ایک کورین شیف بھی ہے جو نیم پاکستانی، نیم کورین ہے۔ ریستوران اچھا ہے۔ میں گیا ہوں وہاں لیکن بدقسمتی سے اتنا acclaimed نہیں ہو رہا۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے۔''

غزارا اُسے توجہ سے سُن رہی تھی۔

''ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے وہ کہہ رہا تھا کہ ریستوران بند کر دے گا لیکن میں نے تمہاری بات کی کہ تم اُس کو سروس دے سکتی ہو۔ ایک کورین لڑکی کا ریستوران میں کام کرنا، ایک hype بنا سکتا ہے اور پھر لوگوں کا confidence بھی بوسٹ ہوگا اس سے۔''

''یعنی مجھے وہاں ویٹر رنگ کرنی ہے؟'' وہ سر ہلا کر بولی۔

''ویٹرنگ.....نن.....''

''گڈ۔ میں اس میں بہت اچھی ہوں۔ کوریہ میں، میں نے ان گنت ریستوران میں ویٹرس کی جاب کی ہے۔ ایک تو بہت بڑا ہوٹل تھا، بوسان میں لیکن یانگ منی وہاں اکیلا رہنے

نہیں دے رہی تھی، اس لیے چھوڑنی پڑی لیکن تمہیں پتا ہے.....'' وہ اٹھ کر اُس کے پاس آئی اور ذرا سا فاصلہ چھوڑ کر بیٹھ گئی۔ ''یہ ایک فن جاب ہے۔ لوگوں کر سرو کرو، اُن سے ٹپس لو۔ نئے نئے لوگوں سے ملو۔ چلتے چلتے اُن کی باتیں سنو۔ مجھے یہ جاب پسند ہے۔''

شاہ جہاں اُن کی چھوٹی آنکھوں میں وہ چمک دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے ایک اُداس کر دینے والا تاثر تھا۔ اگر وہ کوریا سے ایک چیز میں خاص تجربہ لائی تھی تو وہ جذبات کو ''چھپانا'' تھا۔

''تم وہاں ویٹرس کی جاب کیوں کرو گی یانگ شی؟'' اس نے مایوس کن لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم خود کو اس جاب کے علاوہ کسی اور کے لیے suitable نہیں سمجھتی ہو؟''

''سوتبل مطلب؟''

''مطلب لائق۔ کیا تم صرف ویٹرنگ کے لائق ہو؟'' اس نے توضیحی انداز میں کہا۔

وہ زخمی سے انداز میں مسکرائی۔ ''تم نے ہی تو کہا تھا کہ یہاں مزدوروں والی نوکری کے لیے بھی ڈگری چاہیے تو پھر..... میں سی ای او والی نوکری کی اُمید تو نہیں کر سکتی تھی نا۔''

''تم سی ای او نہیں ہو سکتی ہو لیکن ہم، ہم جو اتنا بڑا نام ہیں۔ برانڈ بن چکے ہیں، کیا ہمارے گھر کی لڑکی یہ جاب کرے گی؟ اتنی معمولی نوکری؟'' اس نے خود پہ جیسے لعنت بھیجی۔

''کوئی بھی نوکری چھوٹی بڑی نہیں ہوتی شاہ۔ کوریا میں ہر پیشے کی عزت ہوتی ہے۔ کم از کم کام سے کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔''

''لیکن یہاں ایسا نہیں ہوتا گڑیا۔ یہاں پیشہ، ذات بن جاتی ہے۔ نائی، موچی، کمہاری، وکیل، ڈاکٹر اور باورچی وغیرہ۔ یہاں تم تمہاری نوکری سے پہنچانے جاؤ گی۔''

''مجھے مسئلہ نہیں ہے۔ میں ویٹر بھی خود کو بلند دیکھتی ہوں۔'' اس نے بے نیازی سے

شانے جھٹکے۔

شاہ جہاں نے گہرا سانس لیا۔

''او کے۔ ٹھیک ہے لیکن تم یہ جاب نہیں کر رہیں وہاں۔ تم نے مجھے کہا تھا کہ تم کورین کزین اچھی بنا لیتی ہو تو میں نے اُن سے کہا کہ تم اُن کے یہاں شیف کے طور پر کام کرو گی۔''

''شیف؟؟'' وہ متوحش ہوئی۔

''ہاں۔ شیف۔''

''لیکن مجھے ساری کزین بھی نہیں آتی شاہ۔ مخصوص پندرہ بیس کھانے بنانے آتے ہیں جو ہم روزمرہ میں کھاتے ہیں۔'' اس نے تشویش سے بتایا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انھوں نے ویسے بھی سائن ڈشز رکھی ہیں۔ کچھ دس بارہ مخصوص کھانے پھر وہ دوسرا شیف بھی تو ہے تمہارے ساتھ۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔'' اس نے رسان سے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے۔ مسئلہ نہیں مجھے۔ کب سے کب تک کام کرنا ہوگا؟''

''صبح گیارہ بجے ریستوران کھلتا ہے اُن کا۔ رات گیارہ بجے تک لیکن تمہیں اتنی دیر کام نہیں کرو گی۔ میں نے اُن سے کہا ہے کہ تم دوپہر میں جاؤ گی۔ دو، تین بجے۔''

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

یہی ٹائمنگ وہ چاہتی تھی۔ صبح آٹھ سے دوپہر دو بجے تک چینل میں پھر وہاں سے ریستوران۔ وہ کچھ ہی وقت میں اچھا خاصا پیسہ کما سکتی تھی۔ ہا..... اسے سوچ کے مزہ آنے لگا۔ جلدی جلدی رقم جمع ہو جائے، بابا باہر آ جائیں۔

''کیا ہوا، کیا سوچ رہی ہو؟'' شاہ جہاں نے اسے خیالوں میں ڈوبا ہوا دیکھا۔

''کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔'' وہ اپنے انگوٹھوں کو حسب عادت پھر لڑا رہی تھی۔

''ہوں۔'' اس نے سر جھٹک دیا۔

''میں کچھ دنوں کے لیے دبئی جا رہا ہوں۔ صبح چار بجے کی فلائٹ ہے میری۔ میں چاہ رہا تھا کہ خود تمہیں ریستوران لے جاؤں لیکن ایک ضروری پراجیکٹ کے لیے دبئی جانا ہوگا۔ اس لیے میری ایک کولیگ، سائرہ۔ وہ کل آئے گی تمہیں لینے۔ اُس کے ساتھ ریستوران چلی جانا۔ میں اُن سے بات کر چکا ہوں۔ باقی کا کام وہ تمہیں سمجھا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ انگوٹھے تا حال لڑ رہے تھے۔ شاہ کو اس اشارے کے معنی سمجھ نہیں آتے تھے۔ آخر یہ کیا سیکھ کر آئی تھی اور اِس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔

''تم نے نیل پالش نہیں اُتاری۔ اُس دن بھی یہی لگی تھی۔'' اس نے پہلی ملاقات کی طرف اِشارہ کیا۔

وہ ٹھٹکی پھر مسکرائی۔

''یہ..... دوبارہ لگائی ہے۔ یہ شیڈ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' اس نے ہاتھ پلٹ کر دیکھے۔ پتلی پتلی لمبی سفید انگلیوں کے گول ناخن، گوشت سے ذرا آگے تھے اور اِن پر ریڈ وائن کی طرح نیل پالش لگی تھی جو سطح سے گہری اور سروں پر دھیمی ہو رہی تھی۔ ایک کن ٹراسٹ سا بنایا گیا تھا جو اس کے ہاتھوں کو بے پناہ خوبصورت بنا رہا تھا۔

شاہجہاں نے بے اختیار نظریں ہٹائیں۔

''میں نے ڈرائیور فیض کو تمہارے پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری سونپی ہے۔ وہی تمہیں لے کر جائے گا اور لے کر آئے گا۔ وہ ہمارا پرانا ملازم ہے۔ قابل اعتبار ہے۔'' وہ اب اپنی کتاب پھر اٹھا رہا تھا۔ غزالہ نے دیکھا کہ شاید وہ اب بات ختم کرنا چاہتا ہے لیکن وہ یہ بھی

جانتی تھی کہ وہ کبھی اُسے وہاں سے اٹھنے کا نہیں کہے گا۔

شاہجہاں نے ذرا پیچھے ہو کر ٹیک لگا لی، پھر ٹانگیں پھیلا کر میز پر کراس میں رکھ دیں۔ اب وہ مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ اُس کی عادت تھی۔ ٹانگیں پھیلا کر پڑھنے کی، چاہے وہ صوفے پر بیٹھتا یا کرسی پر یا پھر کسی ریکلائنر پر یہاں تک کے اسٹڈی میں موجود اس کی ریوالونگ چیئر تک پر بھی مطالعے کے لیے وہ ایسی ہی بیٹھتا تھا۔

''شاہ.....'' کچھ دیر بعد اُس نے مخاطب کیا۔

''ہوں.....'' وہ صفحہ پلٹتے ہوئے بولا۔ (دل دھڑکا تھا اس تخاطب پہ)

''قبرستان کتنا بدل گیا ہے ناں۔ کتنے سارے لوگ مر گئے ہیں۔''

''ہوں۔'' اس نے تائیدی انداز میں ہنکارا لیا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' وہ اب گردن گھما کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''پوچھو۔'' وہ کتاب کو دیکھ رہا تھا۔

''مرے ہوئے لوگوں کو دفناتے کیوں ہیں؟'' وہی بچگانہ و معصومانہ سے سوال جو وہ بچپن میں کرتی تھی۔

''کیوں کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اس لیے۔''

''نائٹروجن اور ڈی کمپوزنگ کیا ہے پھر؟''

''وہ دفنانے کے بعد کا پراسس ہے۔ سائنسی لحاظ سے.....''

''اور اسلامی لحاظ سے؟''

''اسلام میں جسم کی اہمیت نہیں۔ روح کی ہے۔ جسم تو برتن ہے روح کا.....'' وہ فصاحت سے بولا پھر قدرے ٹھٹکا۔ ''لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟''

وہ لاجواب ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر۔ بس کچھ دیر پھر اُس کی آنکھیں بھریں، لب بھینچے۔

''یانگ شی.....'' شاہ جہاں نے مضطرب ہو کر ٹانگیں کھینچ لیں.....اور اُسی لمحے یانگ شی کی آنکھیں چھلک گئیں۔

''کیا ہوا۔ سب ٹھیک ہے؟'' وہ تڑپ کے آگے ہوا۔

''میں ما کی قبر پہ گئی تھی.....'' وہ نم آواز میں بولتے ہوئے سسکی۔ ''مگر.....مگر میں نے دعا نہیں کی۔ نانی کے لیے بھی نہیں۔ میں۔ میں بہت گھبرا گئی تھی۔ بہت زیادہ۔ پتا نہیں کیوں مجھے وحشت ہونے لگی۔'' وہ تکلیف سے کہہ رہی تھی۔

''وہاں کوئی نہیں تھا شاید اس لیے یا پھر..... یا پھر وہ جگہ بھر گئی ہے یا پھر، یا پھر کوریا میں ایسا قبرستان نہیں ہوتا۔ شاید۔ اس لیے۔ میں بہت ڈر گئی تھی۔ بہت زیادہ۔''

''تو تم اکیلی کیوں گئیں وہاں۔ میرے ساتھ جانا چاہیے تھا۔'' شاہجہاں فکرمند ہوا۔

''دن کا وقت تھا شاہ۔ وہاں گورکن بھی تھا۔ پھر بھی..... پتا ہے۔'' اس نے آستین سے گیلا منہ پونچھا۔ آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں اور گال سرخ۔

''اپا نے مجھے کہا تھا کہ جب میں ما کی قبر پہ جاؤں تو گلابی گلاب لے کر جاؤں۔ ایک گلابی بکے میں اور وہاں رکھ دوں۔ ما کو پسند تھے گلابی گلاب پھر انھوں نے مجھے ایک خط دیا تھا۔ کہا کہ وہ ما کی قبر کی مٹی میں دفنا دوں لیکن.....شاہ.....'' اس نے ہچکی کھینچی۔

''میں پھول نہیں لے کر گئی، خط بھی نہیں رکھ سکی۔ پھول مجھے ملے نہیں اور خط، وہ میں رکھ نہیں پائی۔'' اب وہ پچھتاوے کی زد میں مزید آنسو بہا رہی تھی۔ شاہ جہاں نے میز سے ٹشو اٹھا کر اُسے دیا۔

''جب میں دبئی سے واپس آؤں گا۔ پھر میرے ساتھ چلی جانا۔ ہم یہ دونوں کام کر لیں گے۔''

''کب آئیں گے آپ؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

''جمعے کو شاید یا، ہفتے کو۔'' اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے رضامندی سے سر ہلایا۔

''اب آنسو پونچھو اپنے۔ رو رو کر گال خراب کر لو گی اپنے۔'' وہ ذرا ڈپٹا ہوا بولا۔ اس نے جلدی جلدی آنکھیں رگڑیں اور نم سانس لے کر خود کو کمپوز کیا۔

''شاہ.....'' کچھ دیر بعد اس نے پکارا۔

''ہوں۔''

''کیا آپ مجھے سلا دیں گے۔'' اُس نے یکدم پوچھا۔

''سلا؟؟''

''ہاں۔ میں آپ کی گود میں سر رکھوں گی، آپ مجھے سلا دینا۔ جیسے بچپن میں سلاتے تھے۔'' اس نے فوراً سے یاد دلایا۔ ایک لمحے کو شاہ جہاں کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ منع کرے گا تو کیا وجہ دے گا؟ اُس نے خاموشی سے کشن اٹھا کر گود میں رکھ دیا جس پر غزارا نے سر رکھا اور سمٹ کر لیٹ گئی۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ بائیس سال کی بے شک ہو چکی تھی لیکن ابھی تک وہی چھ سالہ یانگ شی تھی جو اس سے کھیلتی تھی، اس کی گود میں سوتی تھی۔ تب حالات اور جذبات الگ تھے اور اب۔

کتاب پڑھتے ہوئے، جانے کتنی دیر ہو گئی جب اِسے غزارا کے گہرے سانس سُنائی

دیے۔ وہ یقیناً سو چکی تھی۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھی اور اُس کا سر آہستہ سے ہتھیلی میں بھرا۔ بڑے دھیان سے، اُس کی نیند میں بغیر خلل ڈالے وہ باہر نکلا اور اُتنی ہی نرمی سے اُس کا سر کشن پر رکھ دیا۔ وہ ہلکی سی کسمسائی لیکن پھر پرسکون ہو گئی۔

وہ بیڈ سے کمفرٹر لایا، اس پر ڈالا یوں کہ وہ گردن تک چھپ گئی پھر وہ پنجوں کے بل اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ مٹھی میں پکڑا ہوا ٹشو اُس کی انگلیوں سے آزاد کیا پھر اس کا لٹکا ہاتھ اٹھا کر پہلو میں برابر رکھ دیا۔

اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور ناک بدستور سرخ۔ بال چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے بے اختیار انگلیوں سے اُس کے بال پیچھے کیے پھر کھڑا ہو گیا اور تب ہی اس کی نگاہ صوفے کے عین پیچھے، پیشانی پر بل ڈالے کھڑی طاہرہ بیگم تک گئی۔ وہ تیزی سے پیچھے ہوا۔

''امی آپ.....؟''

''کیا ہوا، ڈر کیوں گئے؟'' وہ اسی پتھریلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

''ڈر.....'' وہ احمقانہ انداز میں ہنسا۔ ''نہیں تو۔ بالکل بھی نہیں۔''

طاہرہ بیگم نے اسکین کرتی نگاہوں سے اُس کا چہرہ ٹٹولا۔ وہ حتی الامکان خود کو پرسکون کر رہا تھا پھر انھوں نے ایک چبھتی نظر غزالا پہ ڈالی۔

''اسے کیا ہو؟''

''اسے..... اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میرے پاس آ گئی۔'' اس نے جلدی سے بہانہ بنایا۔

طاہرہ بیگم نے کچھ نہیں کہا۔ آنکھوں میں ہنوز عجیب پراسراریت تھی۔

''میں پیکنگ کر لوں۔ میری فلائٹ ہے۔'' وہ بغیر ماں کو دیکھے ڈریسنگ میں چلا گیا۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ باہر آیا تو اُس نے اپنے بستر پر طاہرہ بیگم کو سوتے ہوئے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ وہاں کیوں لیٹی ہیں۔ وہ ممونیت سے اُنھیں دیکھتا بیڈ کی دوسری طرف، الارم سیٹ کرنے کے بعد سو گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن دوپہر جب وہ اٹھی تو جسم میں عجیب سا درد ہو رہا تھا۔ شاید کل کی تھکاوٹ اور گہری نیند کے سبب تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ پردے سرکے ہوئے تھے۔ بستر ترتیب سے تھا، کشن، کمبل اور باقی سامان اپنی جگہوں پر پڑے تھے۔ یعنی صفائی ستھرائی سب کچھ ہو چکا تھا۔ وہ حیران ہوئی کہ اِسے کسی آہٹ یا چاپ کی آواز کیوں نہیں آئی۔

اس نے خود سے کمفرٹر ہٹایا اور جوتے پہن کر باہر آئی۔

راہداریوں میں ملازمائیں آتی جاتی دکھائی دیں، حسبِ معمول کسی حویلی کی کنیزوں اور لونڈیوں کی طرح۔

وہ یونہی بھاری بھاری قدم گھسیٹتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ جب وہ فریش ہو کر نیچے آ رہی تھی تو اِسے لاؤنج میں ایک لڑکی بیٹھی ملی۔ طاہرہ بیگم نے بٹھا رکھا تھا۔ وہ چائے پی رہی تھی۔ غزارا کو آتا دیکھ کے جلدی جلدی کپ نیچے رکھا، طاہرہ بیگم سے معذرت کی اور کھڑی ہو گئی۔ تب تک غزارا آ چکی تھی۔ اس نے ہڈ کی جیب میں ہاتھ ڈال رکھے تھے۔

''اسلام علیکم۔ میں سائرہ فراز۔'' لڑکی نے ہاتھ آگے کیا جسے غزارا نے مسکراتے ہوئے تھام لیا۔ ''سر شاہجہاں نے کہا تھا آپ کو کورین ریستوران لے چلوں۔''

''جانتی ہوں۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر چلیں۔'' سائرہ نے صوفے پر سے بیگ اٹھایا۔

"چلو۔" اُس نے ہڈ کی جیب میں واپس ہاتھ ڈال لیے۔ طاہرہ بیگم نے اپنی پیالی سے چسکی لیتے ہوئے دور تک اِسے جاتے دیکھا تھا۔ کل رات والا منظر بار بار آنکھ میں چبھ رہا تھا۔

آج اُس نے نیلی جینز پر گہرے سبز رنگ کی ہڈ پہن رکھی تھی۔ سبز پٹی والے جوگرز پہنے تھے۔ بال اونچی پونی میں مقید تھے اور حسبِ معمول پرس سینے پر کراس میں لٹک رہا تھا۔

کورین ریستوران ایف سیکٹر میں تھا۔ جو ڈرائیور شاہجہاں نے تعینات کیا تھا۔ دونوں اُسی کے ساتھ آئی تھیں۔

ریستوارن کورین interior پہ ہی بنایا گیا تھا۔ چھوٹی کرسیاں، چھوٹی میزیں جن پر درمیان میں ہاٹ پاٹ اور میٹ فلپ جیسی ڈشز کے لیے سٹین لیس سٹیل سے بنے چولہے نصب تھے۔ صاف بے حد صاف۔ دیورایں گہرے رنگوں کی تھیں جن پر جگہ جگہ کے پاپ سنگرز اور ایکٹرسز کی تصویریں پینٹ کی گئی تھیں۔ سیلنگ بھی aesthetic تھی اور فرش سفید و سیاہ ڈبوں والے ٹائلوں سے بنایا گیا تھا۔ لکڑی کا استعمال بے دریغ کیا گیا تھا۔

وہ انٹیریئر کو دیکھ کے متاثر ہوئی تھی۔

ریستوران خالی تھا۔ دور کسی کونے میں کوئی پاکستانی لڑکا بیٹھا، سوشی کھا رہا تھا۔ وہ فرش پہ پیروں کے بل گھومتی اطراف کا جائزہ لے رہی تھی جب کچن کاؤنٹر کے عین پیچھے سے دو سر نمودار ہوئے۔

ایک پاکستانی شکل اور دوسری نیم پاکستانی.....

دونوں نے سر پہ شیف کی ٹوپیاں اور سینوں پر سفید ایپرن پہنے تھے جن پر جی من اور آر ایم کی تصویریں چسپاں تھیں۔ نئے گاہکوں کو دیکھ کے دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

"ہیلو لیڈیز....." پاکستانی شکل والا آدمی باہر آیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی چیچک زدہ

کھڈے بنے ہوئے تھے جیسے کسی نے سوئیاں گھسا گھسا کر سوراخ کیے ہوں۔ غزارا ایک لخت جھرجھرا سی گئی۔

''کورین ریستوران میں خوش آمدید.....'' خوشامدی انداز میں کہتے وہ دونوں غزارا کے سامنے آ کر رُک گئے پھر رکوع تک جھک گئے۔ غزارا نے گاگلز لگا رکھے تھے۔ اس نے ہلکا سا سر نیہوڑا لیکن سائرہ اُنھیں دیکھ کر مُسکرائی۔

''شکریہ.....'' اس نے رسماً کہا۔

''آنے یانگ ہسے یو.....نوئیودوین المدبگو.....جسنگ یسو.....'' نیم پاکستانی نے تیزی سے شوخیہ انداز میں کہا جس پر غزارا کا منھ کھل گیا۔

''کیا کہا آپ نے؟''

''نوئیودوین المدبگو.....جسنگ یسو.....'' اس نے دوبارہ دانت نکوسے۔

''جسنگ این.....'' اِس نے آنکھوں سے گاگلز ہٹا کر بیگ اسٹریپ میں اٹکائے۔

دوہرے پپوٹوں کو دیکھ کر اُن کی ساری شوخی بھک سے اُڑ گئی۔ دونوں نے گڑبڑا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''لڑکی کو جسنگ این (ہینڈسم) بول رہے ہو دونوں؟''

''آ.....آپ کورین ہیں؟'' پاکستانی آدمی ہکلایا۔

''کیوں کوئی شک ہے؟'' اِس نے روانی سے اُردو فقرہ بولا جس پر دونوں کی بوکھلاہٹ کم ہوئی پھر وہ قدرے کارٹونی شکل بنا کر آگے آئے اور غزارا کو ٹٹولا۔

''ناک، ہونٹ، ٹھوڑی سب پاکستانی ہے.....''

''سر.....سر آنکھیں.....'' نیم پاکستانی نے اِشارہ کیا۔

پاکستانی نے دوبارہ دیکھا۔اس بار غزارا نے تیز تیز پلکیں جھپکیں۔اس نے منہ میں مٹھی پکڑ لی اور قدرے دل گیر انداز میں پیچھے ہوا۔

''سوری میڈم..... ریلی سوری..... ہمیں پتا نہیں یہ آپ ہیں۔ ہم سمجھے کہ کوئی گاہک ہوگا۔''

''جسے تم لوگ الٹی سیدھی کورین بول کر متاثر کرلوگے۔''

''نہیں میڈم۔ یہ اس کی غلطی ہے۔ اِس نے کہا تھا اس کو کورین آتی ہے۔'' پاکستانی نے نیم پاکستانی کو جھانپڑ مارا جس پر وہ کھسیانا سا مسکرایا۔

''سوری میڈم.....'' وہ گردن ڈال کے بولا۔غزارا نے سر جھٹکا اور گھوم کر میزوں کے درمیان سے نکلی اور چاروں اوور فہمائشی انداز میں نگاہ دوڑائی۔

''یہ ریستوران تم دونوں مان وے چلاتے ہو؟''

دونوں نے تیزی سے فخریہ انداز میں سر ہلائے۔''جی جی.....الحمدللہ.....''

''انٹیریر اچھا ہے۔'' اس نے سراہا۔

''شکریہ شکریہ.....'' جوش سے دانت نکوسے۔

''مگر.....'' وہ تعجب سے مڑی۔''لوگ کیوں نہیں ہیں؟''

''لوگ.....؟'' پاکستانی نے نیم پاکستانی کو دیکھا پھر سرد سانس لیا۔'' کیسے ہوں گے میڈم.....ہمارے اغل بغل جو اتنے اچھے اور بہترین ریستوران ہیں۔لوگ وہاں چلے جاتے ہیں۔''

غزارا کے ابرو تعجب سے قریب ہوگئے۔''تو.....لوگ.....اس لیے نہیں آتے کہ تمہارے آس پاس کے ریستوران اچھے ہیں؟''

''جی میڈم.....'' دونوں نے مسکینی سے سر ہلائے۔

''اور تم لوگ کا ریستوران اچھا نہیں ہے؟''

تیزی سے سر اٹھے۔ ''ہم نے ایسا تو نہیں کہا۔''

''پھر.....؟''

''یعنی.....لوگوں کو.....لوگوں شاید ہم پسند نہیں.....''

''ہمم.....'' غزارا نے مستحکم سا ہنکار لیا پھر وہ پرسوچ انداز میں قدم لیتی دروازے کی طرف گئی اور دروازہ پورا کھول دیا۔ سورج کی تیز روشنی چندھیائے بغیر اندر گری اور فرش پر ایک گہرا عکس بنا دیا۔ اس عکس میں ذرے اُڑ رہے تھے۔

''یہ دیکھو۔ یہ ایک عرشہ ہے۔'' اُس نے اس حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں ذرے اُڑ رہے تھے۔ ''سارے ذرے اس حصے میں اڑ رہے ہیں۔ کچھ اوپر ہیں کچھ نیچے۔ جو نیچے ہیں وہ آہستہ آہستہ اوپر آ رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے اپنے وقت پہ۔ لیکن وہ یہ شکایت نہیں کر رہے کہ وہ خود سے آگے ذروں کی وجہ سے اوپر نہیں آ پا رہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اپنے وقت پر وہ بھی ایک اونچا مقام حاصل کر لیں گے۔ ایک ہی دوڑ میں بھاگنے والے کھلاڑی اپنی محنت پر دھیان دیتے ہیں، دوسروں کی اسپیڈ کی شکایت نہیں کرتے۔''

وہ فہم دیدہ انداز میں مسکرا کے بولی۔ سائرہ نے اس کی ذہانت کو سر کی جنبش سے سراہا مگر دونوں آدمی گومگو کھڑے تھے۔ جیسے حیاتیات کی کلاس میں حساب کا سوال آ گیا ہو۔

''کچھ سمجھ آئی؟'' غزارا نے دونوں کو ہکا بکا دیکھا تو پوچھا۔

''نہیں.....''

''نہیں.....'' وہ بیک وقت بولے۔

سائرہ ہنسنے لگی۔ غزارا نے ضبط آمیز سانس لیا۔ ریستوران میں بیٹھا واحد گاہک بمشکل سوشی کو نگل رہا تھا۔ بار بار وہ ایسی شکل بناتا جیسے اُلٹی آرہی ہو پھر وہ پانی کا بڑا سا گھونٹ لے کر آنکھیں بند کر کے نگل لیتا۔ اگر اس نے پیسے نہ لگائے ہوتے تو یقیناً اب تک باہر جا چکا ہوتا۔

''غزارا کا مطلب ہے تم دونوں کا ریستوران بھی بہت جلد اوپر چلا جائے گا فکر مت کرو۔ چیزیں آہستہ آہستہ کام کرتی ہیں۔'' سائرہ نے دوستانہ انداز میں توضیح کی۔ پاکستانی نے مڑ کر اُسے دیکھا۔

''مگر ہم نے تو اوپر والا فلور بنایا ہی نہیں ہے۔''

غزارا نے سر پیٹ لیا۔ یہ کیسے گدھے متھے چڑھ گئے تھے۔ سائرہ نے مکمل مایوس کن انداز میں ہاتھ جھاڑ لیے۔ ان کا کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ دونوں یوں احمقوں کی طرح کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جیسے کوئی کامیڈی شو کر رہے ہوں۔

''ایک بات بتاؤ۔'' غزارا نے تنگ کر دونوں کو دیکھا۔ ''تم لوگوں کو یہ پتا ہے کہ ریستوان میں سب سے اہم چیز کیا ہوتی ہے؟''

''جی میڈم.....'' دونوں نے سپاہیوں کی طرح سر ہلائے۔

''اچھا.....'' اس نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے۔ ''تو بتاؤ کیا اہم ہوتا ہے؟''

''روشنی.....'' پاکستانی جھٹ سے بولا۔

''روشنی؟'' غزارا نے سٹپٹا کر سے اُسے دیکھا۔

''روشنی نہیں پاگل آدمی۔ ریستوران میں سب سے ضروری چیز ہوتی ہے ٹوائلٹ..... ٹوائلٹ ہو تو لوگ کھینچے چلے آتے ہیں، اوپر سے اُس کی سجاوٹ.....''

''تم چپ رہو۔ میڈم! کراکری اہم ہوتی ہے۔ آئیڈیل کراکری جو اپ ٹو ڈیٹ ہو اور جس پر

ریستوران کے لوگو بنے ہوں۔آہ..... کتنا aesthetic لگتا ہے۔" پاکستانی نے تالی پہ تالی بجاتے ہوئے چمکتی آنکھوں سے کہا۔

غزارا نے کڑوا منھ بنایا۔"کراکری؟ سریسلی؟"

"میڈم، اس کو چھوڑیں میں نے دیکھے ہیں کورین ریستوران۔اسٹاف اہم ہوتا ہے۔"

"تم چپ کرو۔تم کچھ بھی نہیں پتا۔میڈم ریستوان میں سب سے اہم چیز ہوتی ہے space.....اسپیس ہوگی تو لوگ کھل کر کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے بات کریں گے۔انھیں یہ ڈر نہیں ہوگا کہ کوئی سُن لے گا۔" پاکستانی نے اپنی عقل پر فخر کیا۔

"سپیس ملتا ہے ناسا کے پاس۔" نیم پاکستانی نے جھپٹ پڑا۔"ریستوران میں اہم چیز ہوتی ہے سروس۔سروس سے دیکھا جاتا ہے کہ ریستوران کیسا ہے۔"

"سپیس سے دیکھا جاتا ہے۔" پاکستانی نے نیم پاکستانی کو آنکھیں دکھائیں۔

"سروس....."

"سپیس....."

"سروس....."

"چپ کرو تم دونوں.....!" غزارا یکدم چیخ اٹھی۔دور بیٹھے گاہک کے ہاتھ سے پانی کا گلاس دھڑام سے گر گیا۔وہ دونوں فوراً سے بیشتر چپ ہو گئے تھے جیسے اُستاد کے چیخنے پر شاگرد ہو جایا کرتے ہیں۔

غزارا نے آنکھیں کھول کر دونوں کو خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

"ریستوران میں سب سے اہم چیز ہوتی ہے "کھانا....." کیا.....ہوتی..... ہے؟"

"کھانا....." دونوں رٹ کے بولے۔

''تو کیا مجھے تم دونوں من وے اپنا کھانا چیک کروانے کی زحمت فرماؤ گے؟'' اُس نے چبا چبا کر پوچھا۔

''جی جی میڈم۔آپ بیٹھیں۔ہم لاتے ہیں۔'' پاکستانی نے جھٹ سے کہا اور دونوں کچن کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گئے۔

''کیا لوگ ہیں۔توبہ۔'' سائرہ لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

اس نے غصے بھرا سانس نکالا اور کرسی سختی سے کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''اسی لیے ان کا ریستوران نہیں چلتا۔عقل تو جیسے ماں باپ سے لینا بھول ہی گئے ہیں۔ من وے.....''

کچھ دیر گزری تھی جب وہ دونوں ایک ایک کر کے ساری ڈشز سے میز سجا گئے۔چھوٹی کھولیوں سے لے کر بڑی بڑی ٹرے تک، ہر طرح کی پرزنٹیشن تھی۔غزالا اتنے دنوں بعد کورین کھانا دیکھ رہی تھی۔اُس کی ساری جھلاہٹ ہوا ہو گئی۔اس نے ہاتھ آپس میں رگڑے اور چاپ سٹک اٹھالی۔سب سے پہلے اِس نے کم چی اٹھائی۔

منہ میں رکھتے ہی جیسے ہی اُس نے چبائی۔بڑا خراب ذائقہ محسوس ہوا۔منہ بند کیے اُس نے قریباً قے کرنے والے تاثرات بنائے۔وہ دونوں اُس کو بہت پیار سے دیکھ رہے تھے۔اس نے بمشکل نوالہ نگلا، اس کے بعد اُس نے تیوک بوکی، گیم پا، رامین، کانگ نمول، اسپائسی نوڈلز وغیرہ ٹرائے کیے۔اِسے کسی سے بھی کورین ذائقہ نہیں آیا۔بے شک کورین کھانے تھے لیکن ذائقہ بے حد خراب تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ جو اس کو ایک بار کھا کے گیا ہوگا، دوبارہ نہیں آیا ہوگا۔اس نیم پاکستانی نیم کورین نے کھانوں کا ذائقہ نہیں بدلا تھا، بیڑا غرق کیا تھا۔اس نے ایک ایک نوالہ بھی یوں

لیا جیسے زہر کی ساس میں ڈبو رہی ہو۔ چند ہی منٹوں میں اُس نے نیپکن اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

''کیسا لگا میڈم کھانا؟'' نیم پاکستانی نے چمک کے پوچھا۔

''میں نے اس سے زیادہ خراب کورین کھانا کبھی نہیں کھایا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ نیم پاکستانی کی مسکراہٹ اوجھل ہوگئی۔

''سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ کھانا نہیں ہے، کھانے کی بدنامی ہے۔ تم کونسے مسالے استعمال کرتے ہو اس سب کے لیے؟''

''مسالے..... جی وہ کوریا سے منگواتے ہیں۔'' پاکستانی نے کہا۔

''اچھا..... پیکٹ مسالہ لاتے ہو؟''

''جی میڈم.....''

''کس برانڈ کے؟'' اُس نے پوچھا۔ پاکستانی نے برانڈ بتایا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ وہ مسالے تھرڈ مارکیٹ مسالے تھے۔ پیسے بچانے اور زیادہ مقدار کے چکر میں انھوں نے بھوسا منگوایا تھا۔

''کیا ہوا میڈم۔ کیا ہم غلط مسالے منگواتے ہیں؟'' پاکستانی نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں۔ سستے مسالے منگواتے ہو۔'' وہ جل کر بولی پھر کھڑی ہوگئی۔

''معاف کرنا مگر یہ سارا کھانا تلف کرنا پڑے گا تم لوگوں کو۔ اس سے جلدی جان چھڑاؤ۔ میں کوریا سے کچھ کھانوں کے مسالے لائی ہوں۔ آج ہم وہی استعمال کرتے ہیں۔ میں ڈرائیور کو بھیج رہی ہوں، وہ لے آئے گا تب تک مہربانی کر کے اس مچھو کو کہیں پھینک آؤ۔''

وہ کرسی دھکیلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دونوں تیزی سے برتنوں کی طرف لپکے تھے۔

اس نے ڈرائیور سے مسالے منگوائے۔ جب تک کہ وہ لاتا، سب نے مل کر کھانا تلف

کرلیا۔ برتن دھلوائے گئے۔ کچھ دیر کے لیے ریستوران بند کردیا گیا۔ سائرہ کو اس نے ڈرائیور کے ساتھ واپس بھجوادیا تھا۔ اب اُسے غزارا کو متعارف کروانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود کو خود ہی متعارف کروا گئی تھی۔

برتن دھلوانے اور سبزیاں گوشت کاٹنے میں تینوں ساتھ ساتھ تھے پھر اس نے کھانوں کی لسٹ میں سے جن کو پھتنگِ فہرست رکھا جا سکتا تھا، اُن کو چُنا۔ سبزیاں کٹی تو اُس نے ایپرن پہن لیا، سر پہ کیپ رکھ لی۔ اب وہ چولہے پر دیگچے چڑھائے، مختلف انداز کے کھانے بنا رہی تھی جس میں دونوں اُس کی مدد کر رہے تھے۔

چار گھنٹے مسلسل کام کرنے کے بعد اِس نے سارے پانچ کھانے بنا ڈالے۔

''اب چیک کرو اور بتاؤ کیسے بنے ہیں۔'' اس نے نیم پاکستانی کو دعوت دی۔ اُس نے چمچ لے کر ہر کھانا چکھا۔ اس نے بے ساختہ اعتراف کیا کہ اب کھانے واقعتاً زبردست بنے تھے۔

''اب تم دونوں میری بات سنو۔'' وہ ایپرن اُتار کر کچن کے پیچھے بنے سٹنگ روم میں دونوں کو لے آئی اور سامنے والی کرسیوں پر بیٹھایا۔ خود چھوٹی سی کُرسی کھینچ کر اُن کے آگے بیٹھ گئی۔ ٹوپی تا حال سر پہ تھی۔

''جب تم لوگوں نے ریستوان شروع کیا تھا تب لوگ بہت زیادہ آتے ہوں گے ہے ناں؟''

''ہاں۔ بہت تھے۔ بیٹھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔'' پاکستانی نے آہ بھری۔

''اُس کے بعد لوگوں نے تم دونوں کا کھانا چکھا اور پھر وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے۔''

دونوں نے شرمندگی سے سر جھکا دیے۔

''دیکھو تم لوگ نادم مت ہوں۔ میں تم لوگوں کا مذاق نہیں اڑا رہی۔ میں کچھ سمجھا رہی

ہوں۔ بحیثیت کورین، میں سمجھتی ہوں کہ جب ہم کسی دوسرے ملک کے کھانے کو اپنے ملک میں پروموٹ کرتے ہیں تو ہمیں اصلی کھانے کے اصلی ذائقے کو متعارف کروانا چاہیے جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کھانے ہر مناسبت سے بنانا آتے ہوں۔ تم لوگوں نے نئے کھانوں کو نئے لوگوں کو کھلایا۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ شاید ان کھانوں کا ایسا ہی خراب ذائقہ ہوتا ہے اس لیے وہ مایوس ہو گئے جب حقیقتاً تم دونوں من ووں نے اُن کو غلط ریسی پی بنا کر دی تھی۔''

اُن کے سر اور جھک گئے یہاں تک کہ ٹھوڑیاں سینے سے لگ گئیں۔

''اب ہمیں اُن کا اعتماد بحال کرنا ہے۔ پوچھو کیسے؟''

نیم پاکستانی نے جوش سے سر اٹھایا۔ ''کیسے؟''

''ہم ..... یعنی میں اِس کی پروموشن کروں گی۔ ہم کھانوں کو باہر ڈسپلے کریں گے۔ اس ریستوران کے سامنے اور لوگوں کو فری میں ٹیسٹ کرائیں گے۔ چوں کہ شیف میں ہوں (نزاکت سے لٹ جھٹکی) تو لوگ کھانا ضرور کھانے آئیں گے۔ ٹیسٹ کے بعد، کھانا چوز کرنا آسان ہو جاتا ہے۔'' اس نے عقلمندی سے کہا۔

''یہ اچھا ہے۔ پہلے لوگوں کو چکھائیں پھر کھلائیں۔'' پاکستانی کی باچھیں کھل گئیں۔

''تو پھر آج سے شروع کریں؟'' نیم پاکستانی پر جوش ہوا۔

''کیوں نہیں ضرور۔'' اس نے سہولت سے کہا۔

کچھ ہی دیر میں تینوں نے لمبی مستطیل میز باہر نکالی اور ریستوران کے آگے نصب کر دی۔ اُس پر سفید پوش بچھایا اور کھانے ڈونگوں میں رکھ دیے کچھ اس طرح کہ پیشکش کا انداز دور سے دل لبھا رہا تھا۔ گرم گرم، بھاپ اُڑاتے۔ سلاد کے پتوں سے سجے، اشتہاء جگاتے کھانے۔

غزارا اپرن پہنے، سر پہ ٹوپی رکھے وہاں کھڑی ہو گئی۔ وہ آنے جانے والوں کو مسکرا کر خوش

آمدید کہتی اور اُنھیں اپنے بنائے کھانے چکھنے کی آفر کرتی پھر وہ ریستوران کی ویب سائٹ کا بتاتے کہ وہاں ریٹ کر دیں۔ لوگ بخوشی ریٹ کرنے لگے۔

اس رات انھوں نے اپنی گاڑی کے جامد پہیوں پر لبری کینٹ لگایا تھا۔

یانگ شی جانتی تھی کہ کسی بھی چیز کی مارکیٹنگ کی اسٹریٹیجز کیا ہیں۔ لوگوں کو محسوس کروانا کہ اُن کو اُس پراڈکٹ یا اُس شے کی ''ضرورت'' ہے۔ لوگوں کا ''تجسس'' اُبھارنا۔ پھر اُن کو اُس ضرورت کا حل دکھانا پھر اُس ضرورت کی شے پر اعتماد بحال کرنا۔

کورین کھانوں کے ساتھ کورین لڑکی کی موجودگی جو اچھی کورین بولتی تھی جس نے اپنے آٹوگراف اور تصاویر دیواروں پر ٹانگ دی تھیں اور جو ہر نئے مہمان سے کھانے کے بارے میں خود پوچھنے آتی تھی کیوں اس پر لوگوں کو بھروسہ نہیں ہوسکتا تھا۔ کام کی ذمہ داری لینے والا سامنے ہو تو خوف نہیں رہتا۔

وہ خوبصورت تھی، خوش اخلاق تھی، لوگوں کے ساتھ تصویریں اُتروانی تھی جس سے لوگ مزید اُس کے قائل ہونے لگے۔ ایسا رشتہ، ایسا تعلق اُس نے مہمانوں سے بنا لیا تھا کہ وہ سیلبرٹی شیف بن گئی تھی اپنے ریستوران کی۔

نیم پاکستانی اُس سے کھانا بنانا سیکھ رہا تھا۔ وہ طریقہ جو صرف کورین ذائقے کے کھانے بنوا سکتا تھا۔ دونوں کچن میں گھس کر اب ساتھ ساتھ کھانا بناتے تھے۔ منصوبہ سازی کے تحت اس نے دس ڈشز کی بجائے۔ سات ڈشز کو ترجیح دی۔ بڑی، مشہور اور ذائقہ دار ڈشیز تھیں اور فی الوقت وہ اتنے کم وقت میں یہی بنا سکتے تھے۔ پاکستانی نے فارغ کیا ہوا اسٹاف واپس بلا لیا اور یوں دو ماہ سے بالکل رُکا ہوا ریستوران راتوں رات چلنے لگا۔

ہر رُکی گاڑی چل سکتی ہے اگر اُسے ایسا مکینک ملے جو اس کی انجن سے واقف ہو۔ ہر

بیماری دور ہو سکتی ہے اگر اُسے ایسا طبیب ملے جو اُس کے علاج سے واقف ہو۔ ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے اگر آپ کو کوئی ایسا ملے جو درست مشورہ دے سکتا ہو۔ ہماری زندگی کے جامد پہیے بھی چل سکتے ہیں بس ایک ایسا mentor چاہیے ہوتا ہے کہ جو آپ کو push کرے۔ آپ کو دھکا دے۔

زندگی پھر اِسی ڈگر پر اُتر آئی۔

صبح سے دوپہر وہ چینل کے پاس ہوتی تھی اور پھر تین سے نو تک وہ ریستوران میں ہوتی۔ دس بجے قریباً وہ گھر پہنچتی اور پہنچتے ہی سو جاتی۔ گھر والوں سے اِس کی کم کم ملاقات ہو رہی تھی۔ اتنی کم کہ طاہرہ بیگم تو سمجھی تھیں کہ شاید وہ پھر غائب ہو گئی ہے لیکن پھر ملازمہ نے بتایا کہ وہ دیر سے آتی ہے۔ خیر دیر سے آئے یا سویر سے۔ اُن کو کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ تو بس اِسے بیٹے سے دور رکھنے کی منصوبہ سازی کر رہی تھیں۔

دن بھر کی مصروفیات کی وجہ سے اُسے وقت کی رفتار کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے پاکستان آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ گھر والے بھی اُس سے مانوس ہو گئے تھے اور چینل و ریستوران والے بھی البتہ طاہرہ بیگم کی زہریلی نشتر بھری نظریں اُس کا پیچھا کرتی رہتی تھیں۔ روشنا اُسے دیکھ کے ہمیشہ ناک چڑھا لیتی، بدمزگی سے پہلو بدلتی اور اس پہ ثابت کرتی کہ وہ کتنی چھوٹی اور سطحی ہے اور کاش وہ سب جانتے کہ غزارا کورین شہری ہے اور وہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔

شاہجہاں نے جمعے کو آنا تھا لیکن وہ نہیں آیا، وہ کچھ دن مزید لیٹ تھا۔ اس کی فون پر میسج کے ذریعے اُس سے بات ہو رہی تھی۔ اکثر و بیشتر وہ ریستوارن میں بنائے اپنے کھانوں کی تصاویر اُسے ای میل کرتی، پھر آگے سے وہ محض ''seems delicious'' جیسا مختصر تبصرہ لکھ دیتا۔ ہر کھانے کی تصویر پہ یہی پیغام آتا۔

رات کو گھر آ کر، بستر پر پڑنے سے قبل، وہ شاہجہاں کو شب بخیر اور صبح اٹھتے ہی صبح بخیر کہنا نہیں بھولتی تھی۔ یہی کام وہ یانگ منی کے ساتھ بھی کرتی تھی۔ یانگ منی جب جب اس کے کھانے دیکھتی، ویڈیو بھیج دیتی جس میں وہ بلاوجہ رو رہی ہوتی تھی۔ ساتھ ساتھ بولتی جاتی۔

''اوہ..... شی..... اوہ شی۔ تم کتنی زبردست ہو۔ کتنی سمجھدار ہو۔ شی مجھے یاد آ رہی ہے۔ یانگ شی، تمہارے ہاتھ کی بنائے ٹک بوکی (کورین کھانا) یاد آ رہی ہے۔''

اور پھر رونے لگ جاتی۔ اُسے روتا دیکھ کے غزارا مسکرانے لگتی۔ اُسے اچھی طرح پتا تھا کہ یانگ منی کتنی بڑی بزدل اور حساس ہے۔ اگر وہ حساس نہ ہوتی تو پہلے بوائے فرینڈ کے بریک اپ کو تاحال یاد کر رہی ہوتی؟

اس عرصے میں اُس کی جان پہچان چینل کی فنکار لڑکی زوبیا سے ہوگئی تھی۔ زوبیا ڈرامے میں ہیروئن کی دوست کی آواز ''ڈب'' کر رہی تھی۔ زوبیا نے پہلے بھی کئی ترکش، کورین ڈرامے، انگریزی فلمیں اور کارٹوں ڈب کیے تھے۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھی۔ غزارا اس کام میں کم از کم اُس سے کافی کچھ سیکھ رہی تھی۔ چوں کہ ڈرامے میں ہیروئن اور اُس کی دوست کے لاتعداد سین تھے، اس لیے اکثر و بیشتر یہ دونوں سٹوڈیو میں پائی جاتی تھیں۔ وہیں پر دونوں کی دوستی ہوئی تھی۔

زوبیا ایک مڈل کلاس لڑکی تھی جو محض ڈبنگ سے پیسہ کما رہی تھی۔ اُس کے پاس بی ایڈ کی معمولی سی ڈگری تھی۔ وہ گھر میں واحد کفیل تھی، اُس سے چھوٹے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف باپ تھا۔ باپ بھی پولیس سے حوالدار ریٹائر ہوا تھا۔ وہ زوبیا کی شادی کرانا چاہتے تھے لیکن زوبیا نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ جب تک دونوں بھائی، دونوں بہنوں کی نہیں ہو جاتی، وہ اپنے بارے میں نہیں سوچے گی حالانکہ اس کی منگنی اپنی پھوپھی زاد

سے ہو چکی تھی لیکن پھوپھی زاد نے منگنی توڑ دی، یہ کہہ کر وہ اتنا لمبا انتظار نہیں کر سکتا۔ نتیجہ زوبیا جیسے ٹوٹ کر رہ گئی۔ زندگی کی دوڑ میں جس شخص کی تھپکی ڈھارس دیتی ہے، وہ اِسی رشتے سے تو منسلک ہوتا ہے اور وہ بھی یوں رخ پھیر جائے تو پیچھے کیا ہی رہ جاتا ہے؟ اپنے خاندان کے لیے دی جانے والی اس حد تک کی قربانی کو دیکھ کر غزارا زوبیا کے لیے بہت اپنائیت اور احترام محسوس کرتی تھی۔

زوبیا کے بھائی کی شادی قریب تھی۔ لو میرج تھی جس کی وجہ سے زوبیا کو لڑکی والوں کی طرف سے بہت کچھ سہنا پڑا تھا۔ مطالبوں پہ مطالبے ماننے پڑے تھے۔ حق مہر، الگ گھر، خانساماں، گاڑی ڈرائیور کیا کچھ تھا جو لڑکی والوں نے بطور شرط نہیں رکھا تھا مگر چوں کہ اُس کی بھائی کی سچی لگن تھی، اس لیے ہر دریا پار ہوتا گیا اور اب یہ وقت تھا کہ شادی کی شاپنگ ہو رہی تھی۔ بڑی بہن ہونے کے ناطے وہ بہت متوحش نظر آتی تھی اور شاید یہی سبب تھا کہ وہ ریکارڈنگ کی ریہرسل پر توجہ نہیں دے پائی اور اُس دن وہ سب ہوا۔

وہ ڈبنگ کے دوران جانے کہاں کھو رہی تھی کہ ہیروئن کی دوست کہہ کچھ رہی تھی اور زوبیا کچھ..... ڈرامہ درمیان میں پہنچ چکا تھا۔ اس نہج پر آ کے ہیروئن کی دوست کا انداز، لہجہ اور تاثر بدل جانا، ناظرین میں اُکتاہٹ اور اجنبیت پیدا کر سکتا تھا۔ ایسی لاتعلقی اور بے رُخی بھرے تصادم سے بچنے کے لیے ڈائریکٹر نے زوبیا کو ڈانٹ پلا دی۔

وہ سٹنگ روم میں بیٹھ کے رو رہی تھی، تب غزارا اپنی ریکارڈنگ مکمل کر کے اُس کے پاس آئی۔

"چلو، تمہیں ایک جگہ لے کر چلتی ہوں۔" اس نے روتی زوبیا کی کلائی پکڑی اور اسے لیتے ہوئے اپنے ریستوران آ گئی۔ کچن میں اُسے لانے کے بعد، ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ زوبیا

تا حال رو رہی تھی۔

''تم نے یہ ڈرامہ دیکھا ہے زوبیا؟'' وہ فریزر سے سبزیاں نکال رہی تھی جب اس نے پوچھا۔

زوبیا نے نم سانس کھینچی۔ ''نہیں۔''

''تمہیں دیکھنا چاہیے تھا۔'' اس نے سبزیاں چُننا شروع کیں۔

''کیسے دیکھتی، کورین آتی نہیں، انگریزی پڑھی نہیں اور اُردو میں، میں ہی ڈب کر رہی ہوں۔'' وہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے آنکھیں رگڑنے لگی۔ غزارا اس کے بروقت جواب کو سن کر مسکرا دی۔ ہاتھوں میں سبزیاں لیے، وہ کاؤنٹر کے پاس آئی۔

''چلو پھر میں تمہیں اس کی کہانی سُناتی ہوں۔'' اس نے بورڈ پر بند گوبھی رکھی، پھر ایپرن پہنا اور تیز دھار چاقو نکال لیا اور ماہرانہ انداز میں گوبھی کاٹنے لگی۔ زوبیا نے کرسی موڑ لی تا کہ اُسے اچھے سے سُن سکے۔

''یہ کہانی ہے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی۔ لڑکی جو بیمار ہے اور اپنی بیماری لڑکے سے چھپاتی ہے کیوں کہ لڑکا ایک مشن پر ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے پیسے، پختہ ارادے اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لڑکی سوچتی ہے کہ اگر اُس نے لڑکے کو اپنی بیماری بتائی تو لڑکا اپنے مقصد سے پیچھے ہٹ جائے گا اور کبھی اتنا کامیاب بزنس مین نہیں بن سکے گا، جیسا کہ وہ اُسے بنتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اُس کے پاس کچھ سال ہیں۔ تین، چار یا شاید ساڑھے چار اور اُس لڑکے کے لیے اتنا وقت کافی ہوگا، اپنا مقصد پانے کے لیے۔ وہ ہیروئن کی بچپن کی دوست ہے۔ اُس کی انگ انگ سے واقف ہے لیکن وہ بھی نہیں جانتی کہ ہیروئن اس قدر جان لیوا بیماری کا شکار ہے۔''

کٹنگ بورڈ پر چاقو کی کٹ کٹ سے کچن میں عجیب موسیقی پیدا ہو رہی تھی۔ نیم پاکستانی

کبھی کبھی آ کر، ایک نظر دیکھ لیتا پھر چلا جاتا۔ ابھی کھانے کا وقت نہیں تھا، اس لیے ریستوران میں رش نہیں تھا۔

''یہ جو ہیروئن کی دوست ہے، یہ اس لڑکے کے سیکرٹری سے محبت کرتی ہے۔ اس کا کردار بہت اہم ہے زوبیا۔ وہ بہت چنچل، چالاک اور پرشور لڑکی ہوا کرتی تھی۔ کبھی نہ رونے والی، نہ گھبرانے والی لیکن سیکرٹری سے محبت کر کے وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ ابھی ہم جس قسط میں ہیں، وہ اسی فضا کی قسط ہے۔ دل ٹوٹ چکا ہے کیوں کہ سیکرٹری اسے dumb کرتا ہے۔ یہاں وہ محبت سے ہار کر، محبت کے خلاف ہو جاتی ہے اور ہر وہ شخص جو کسی کے لیے ذرا بھی جذبات رکھتا، اسے بے وقوف اور احمق سمجھتی ہے اور مانتی ہے کہ دنیا کا سب سے بکواس کام ''محبت'' ہے۔

ابھی تک تم نے ایک active لڑکی کا کردار ادا کیا تھا۔ اب اُس کا passive mode ادا کرنا پڑے گا۔ اس لیے آواز کا اُتار چڑھاؤ، اُس کے تاثرات میں کہیں سے بھی خوشی یا سرشاری کی جھلک نہیں آنی چاہیے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں؟'' اس نے ہلکا سا مڑ کر اُسے دیکھا۔

زوبیا نے فہم دیدہ انداز میں سر ہلایا۔ وہ اب فرائی پین نکال کر اس میں تیل ڈالے، سبزیاں فرائی کر رہی تھی۔ سبزیوں اور تیل کی مہک کچن میں پھیلنے لگی۔

''میں جانتی ہوں تم اپنے بھائی کی شادی کی وجہ سے خیالی طور پر بٹی ہوئی ہو لیکن ہمارے باہر والے یہ چیزیں نہیں سمجھتے۔ ہماری اندر کی اذیتیں، ہماری اپنی ہوتی ہیں۔ اُس میں کوئی ہمارا شریک نہیں ہوتا۔ جیسے اس ہیروئن کو دیکھ لو، یہ کتنی اذیت میں ہوتی ہے۔ مٹھی بھر مٹھی وہ دوائیں لیتی ہے۔ جگہ بے جگہ اُسے چکر آتے ہیں، خون کی الٹیاں ہوتی ہیں لیکن وہ سہہ جاتی ہے تاکہ دوسرے متاثر نہ ہوں۔''

اس نے اُبالا ہوا پاستا فرائی پین میں ڈال دیا اور سبزیوں، ساسز اور پاستا کو مکس کرنے لگی۔

''اس کی دوست اپنا رونا رو رہی ہے۔ محبت پر بکواس کیے جاتی ہے۔ بک بک لیکن وہ اپنی دوست کی مثالی محبت سے کچھ سیکھ نہیں پا رہی۔ وہ دیکھ نہیں پا رہی کہ کس طرح اُس کی اپنی دوست، اپنے محبوب کے لیے اپنا جسم مٹی کر رہی ہے۔ وہ سمجھتی ہے محبت فریب ہے۔ دھوکہ ہے۔ یہ ایک جال ہے جو انسانوں کو قید کر لیتا ہے اور پھر چیخ سے پھٹ جاتا ہے لیکن اُس کی دوست۔ وہ اپنے محبوب کے راستے کا کانٹا نہ بننے کے لیے پل پل مرتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ میری دوست کتنی بدذوق ہے۔ ابھی تک محبت کی منزل تک پہنچی ہی نہیں، صرف دل لگی سے پلٹ آئی ہے اور یوں بکواس کر رہی ہے جیسے خود کو فنا کر دیا ہو۔'' روانی سے کہتے ہوئے اُس نے پلٹ کر زویا کو دیکھا جو سنجیدگی سے اُسے سُن رہی تھی۔ ''تم بتاؤ، کیا کسی کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ محبت کا مزہ چکھے بغیر، اُس کے خلاف ہو جائے؟''

زویا نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں، میں نہ رہا، تو ہو گیا۔ یہ ہوتی ہے محبت زویا۔ اس میں ''میں'' نہیں رہتی۔ ''تم'' بن جاتی ہے۔ محبوب بولے تو سر خم کرو۔ نظریں جھکاؤ۔ وہاں گردنوں میں سریے نہیں ہوتے۔ وہاں آگ میں کودنے سے پہلے سوچا نہیں جاتا۔ وہاں من مٹی، تن مٹی کرنا پڑتا ہے۔'' وہ خوفناک سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''محبت میں انائیں نہیں ہوتیں۔ شکوے نہیں ہوتے، شکایتیں نہیں ہوتیں۔ وہاں رضا۔ صرف رضا ہوتی ہے۔ وہاں اپنی پرواہ نہیں ہوتی، وہاں کسی کی پرواہ نہیں ہوتی سوائے .....(وہ ٹھہری)..... محبوب کے۔''

زویا اسے ہکا بکا سن رہی تھی۔

''یہی اس ڈرامے کا مقصد ہے۔ کس طرح محبوب اپنا آپ مٹی کر دیتا ہے صرف عاشق کی

ہستی کو دوام دینے کے لیے اور کس طرح عاشق بے بہرہ ہی رہ جاتا ہے کچھ نہیں سمجھتا۔ کچھ نہیں جان پاتا۔"

زوبیا دھواں دھواں بیٹھی تھی۔ کچھ دیر تو اسے لفظوں کی بوچھاڑ سمجھ نہیں آئی پھر اس کے دماغ نے ان کو جذب کرنا شروع کیا۔ غزارا اب پین سے پاستا پلیٹ میں ڈال رہی تھی۔

زوبیا کھڑی ہوگئی اور ذرا کھل کر سانس لیا۔

"اب میں محبت کے خلاف بولنے والی، ایک ٹوٹے دل کی لڑکی بنوں گی جس نے محبت کا ذائقہ نہیں چکھا، جس نے صرف دلکشی و آمادگی پر جان واری تھی۔ جو محبت کے درجے تک پہنچی ہی نہیں، وہ ایک ایسی لڑکی جو محبت کے ہر درجے کو پار کر چکی ہے، کے سامنے محبت کے خلاف بک بک کرتی ہے؟ ہے ناں؟" اس نے رُک کر غزارا کو دیکھا۔

"بالکل....." اس نے پلیٹ نمائشی انداز میں اُس کے سامنے پیش کی۔

"تو مس غزارا، تم کبھی محبت جیسی غلیظ شے میں مت پڑنا۔ کبھی کسی مرد سے محبت مت کرنا، یہ دھوکے باز ہوتے ہیں۔ فریبی۔ ایک ساتھ کئی لڑکیوں کو دل میں پالتے ہیں۔ محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی۔ صرف دل لگی ہے۔ صرف دل لگی۔" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے بزرگانہ انداز میں بولی تو غزارا ہنس پڑی۔

"کافی جلدی سیکھ گئیں تم....."

اور پھر زوبیا بھی ہنسنے لگی۔ ایسے جیسے وہ ہیروئن کی دوست کا کردار جان بوجھ کر بنائی گئی تھی۔

✿ ..... ✿ ..... ✿

(قسط نمبر: 4)

وہ اس وقت اسلام آباد کے مشہور ریستوران میں، کونے والی میز پر بیٹھی تھی۔ اس کے بلمقابل ایک خوش شکل نوجوان تھا جس کی عمر اٹھائیس انتیس سال لگ رہی تھی۔

حمنہ بہت بے زاری سے اپنی گلابی ڈرنک میں سٹرا چلا رہی تھی۔ اس نے بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اِس کے بال سنہری تھے جو نیچے تک آتے آتے بھورے ہو جاتے تھے بالکل لکڑی کی طرح۔ چہرہ بالکل شفاف تھا البتہ آنکھوں کے نیچے مدھم مدھم کملاہٹ تھی جو بتا رہی تھی کہ وہ کسی چیز کو لے کر پریشان ہے۔

حامد بہت دل جمعی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا وہ اتنا اڑ جائے گا۔'' سٹرا چلاتے ہوئے وہ خلاؤں کو گھور رہی تھی۔

حامد اسے غور سے سن رہا تھا۔ ''اُس کے اور میرے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں جس میں کوئی مفہوم دے سکوں۔ دو جسم، دو اجنبی جسم ہیں جو ایک چھت تلے، کوئی ان دیکھا بوجھ لیے رہ رہے ہیں۔ پھر بھی وہ بضد ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟''

''انا میری جان.....'' حامد نے تلخی سے کہا۔''The mesculine Ego.....''

''اونہوں.....'' وہ تیزی سے ہنکاری۔ ''اُس میں ایگو نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ صلاح جو آدمی ہے۔ انتشار پہ امن کو فوقیت دیتا ہے لیکن یہاں پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا ہے۔''

''تم کیوں سوچ رہی ہو اس کے بارے میں؟'' حامد نے جھلاہٹ سے سر جھٹکا۔ ''کبھی تو وہ تمہیں چھوڑے گا ناں؟ ہمیشہ تو پلو سے نہیں باندھ سکتا پھر جب کہ تم اس سوکال ہز ہائی نیس

شاہجہاں سے طلاق لے لوگی پھر میں ہوں ناں، تمہارے لیے۔ کیا تمہیں، ایک کے بدلے ایک اچھا نہیں مل رہا؟"

حمنہ نے خلاؤں سے نگاہ ہٹا کر اِسے دیکھا۔ "تم خود کو شاہجہاں سے بہتر سمجھتے ہو؟"

"ہاں بالکل۔" اس نے کالر درست کیے۔

حمنہ کچھ دیر اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ خوش شکل ہی نہیں، خوش عقل بھی تھا۔ شہر کا ڈی سی تھا۔ یہ سارا مقام اُس نے اپنے دم پر حاصل کیا تھا۔ نام، دولت، رتبہ اور عزت۔ شاہجہاں کے پاس کیا تھا؟ صرف شکل؟ ہا..... شکل کا کون کیا کرے گا۔ اس میں انسان کا اپنا کمال کہاں ہوتا ہے۔

"واقعی۔ وہ تمہارے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ تائیدی انداز میں مسکرائی۔ حامد کا رنگ یکدم کھل اٹھا۔ حمنہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھا۔

"تم نے مجھے زندگی لوٹائی ہے حامد۔ میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی۔ بس ایک دفعہ یہ طلاق ہو جائے اُس کے بعد میں تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔" وہ یقین دہانے کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے برے موڈ کے لیے معافی بھی مانگ رہی تھی۔

"مجھے یقین ہے۔" حامد نے دھیرے سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆.....☆.....☆

حامد اور حمنہ کا یہ افیئر کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ خصوصاً حمنہ کے ماں باپ اور شاہجہاں سے۔ وہ شادی کے پانچویں سال ہی اس افیئر میں پھنس گئی تھی۔ شاہجہاں نے جان بوجھ کر اِس طرف دھیان نہیں دیا۔ حمنہ کا خیال تھا کہ شوہر ہونے کی حیثیت سے وہ یقیناً جلن محسوس کرے گا، اُس کی غیرت جاگے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا پھر حمنہ ضد میں آ گئی۔

اگر اِس شخص کو اس کے وجود سے فرق نہیں پڑ رہا تھا تو وہ کیوں اِس کی پرواہ کرے۔ اپنی ماں اور چچی کی چالوں میں پھنس کر اور کچھ اپنی کم عمری کے باعث وہ ایک خوش شکل آدمی کو حاصل تو کر پائی تھی لیکن انسان حاصل نہیں، پائے جاتے ہیں، کمائے جاتے ہیں اور جو چیز کمائی نہ جائے، وہ پاس کبھی نہیں رہتی۔ اس کے پاس بھی نہیں رہی تھی۔

حامد کنوارا تھا۔ ابھی تک کسی لڑکی سے افیئر میں نہیں رہا تھا مگر اسے حمنہ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور نہ ہی اُس کے نو سالہ بیٹے سے۔ ویسے بھی زید حمنہ کے لیے ایک ایسی کڑی تھی جس پر وہ شاہجہاں کو محض جلا سکتی تھی، اذیت دے سکتی تھی ورنہ اتنے عرصے اُس کی ماما کا حال حویلی کے ہر فرد نے دیکھا تھا۔ شاہجہاں نہ ہوتا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ زید پل جاتا۔

☆.....☆.....☆

طاہرہ بیگم پل پل مر رہی تھیں حمنہ کو گھر لانے کے لیے۔ وہ کسی بھی طور پر غزارا کو شاہجہاں کی زندگی میں شامل ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ شاہجہاں کے جانے کے ٹھیک دو دن بعد، اُس نے غزارا کو جا لیا۔ وہ صبح ہی صبح چینل کے لیے نکل رہی تھی۔ جب وہ گاڑی کے پاس آئی اور پچھلا دروازہ کھولنا چاہا تو نہیں کھلا۔

اس نے کئی بار کھینچا پھر اس نے پلٹ کر ڈرائیونگ ڈور کے ساتھ کھڑے، نظریں جھکائے ڈرائیور کو دیکھا۔

''دروازہ کھولیں انکل.....'' وہ بولی۔

''یہ اب نہیں کھلے گا۔'' طاہرہ بیگم کی گھمبیر آواز آئی۔ غزارا چونک کر مڑی۔ وہ مرکزی دروازے کی سیڑھیوں میں کھڑی تھیں۔ نفیس شلوار قمیص اور پھولدار کڑھائی والی شال میں ملبوس، گردن میں موتیوں والی مالا پہنے اور آنکھوں میں تپش لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''بہت جلد عیش پسند نہیں ہوں گئیں تم لڑکی؟'' انھوں نے طنزیہ نظر اس کے وجود پہ ڈالی۔
''ہم تو کبھی پیروں کی دھول سے قشقہ نہیں کھینچتے۔ پھر کیا ہوا کہ تم جیسی لڑکی اتنی بڑی گاڑی میں جا رہی ہے۔''
''شاہ نے گاڑی دی ہے مجھے ممانی۔'' اس نے اترا کے کہا۔
''اور میں شاہجہاں کی ماں ہوں۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ عیاشیوں کی عادت نہ ڈالو خود کو۔ چھوٹی ذات کی ہو، چھوٹی رہو۔ میرا بیٹا تم سے ہمدردی رکھتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنا مقام بھول جاؤ۔''
''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ممانی؟ میں بھی اس گھر کی فرد ہوں۔'' اس نے احتجاج کیا۔
''فرد؟'' طاہرہ بیگم نے تمسخر سے سر جھٹکا۔ ''ایک چھنال کی بیٹی، اس گھر کی فرد کبھی نہیں ہو سکتی۔ سمجھیں۔''
''چھنال؟'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
''ہاں چھنال۔ گھٹیا عورت کا گھٹیا خون۔ اس لیے محترمہ اپنی حیثیت پہچان کے یہاں رہو۔ تمہیں داخلے کی رسائی دی ہے۔ قبضے کی نہیں۔ آئی بات سمجھ میں؟'' وہ اسے کاٹتی نظروں سے دیکھ کے بولیں۔ غزارا کی آنکھیں بری طرح چھلک گئیں۔ کئی آنسو قطروں کی طرح گرے۔
طاہرہ بیگم اپنا غبار نکال کر پلٹ گئیں مگر جانے سے قبل انھوں نے بے سدھ کھڑے ڈرائیور کو غیض سے دیکھا۔
''گاڑی لے جاؤ یہاں سے فیض۔ یہ جس کی حیثیت کی ہے، اس کے سامنے لگایا کرو۔''
فیض نے ہلکا سا سر ہلا دیا۔ ''جی بیگم صاحبہ۔''
لفظ چھنال کی جھنکار ماضی کے اُدھڑے ہوئے بابوں میں، ایک سے جا ملی.....

ایک دن سارے کزنز نوڈلز کھا رہے تھے۔ پاکستانی نوڈلز کتنے پھیکے ہوتے ہیں، یہ تو اِسے تب پتا چلا جب اِس نے پہلا چمچ لیا۔ تب اِس نے ذائقہ بنانے کے لیے میز پر پڑی ساس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا جسے عاطف نے جھٹک دیا۔ ساس اِس کے بازو کے جھٹکے سے میز سے نیچے گر گیا اور شیشے کی بوتل ٹوٹ گئی تب عاطف نے چنگھاڑ کر اپنی ماں یعنی چھوٹی ممانی کو آواز لگائی جو بجلی کی رفتار سے اندر آئی تھی۔ تب عاطف نے جانے اُردو میں کیا کیا بولا کہ چھوٹی ممانی نے اسے کرسی سے کھینچ کر اتارا اور پندرہ منٹ تک اِس کا بازو دبائے رکھا۔ وہ تندہی سے کیا کہہ رہی تھی، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک لفظ جو اِسے سمجھ آیا، وہ تھا۔

''چھنال کی بیٹی.....''

بیٹی کا لفظ وہ کئی بار سن چکی تھی لیکن چھوٹی ممانی نے یہ لفظ ''چھنال'' اتنی بار دہرایا کہ اُسے ان پندرہ منٹ میں یاد ہو گیا۔ اگلے دن وہ اسی کا مفہوم جاننے کے لیے اسکول میں اپنی اُردو کی ٹیچر کے پاس گئی اور یہ لفظ بتایا۔ ٹیچر کئی لمحوں تک سمجھ نہیں پائی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے کیوں کہ کوریا میں ''ٹ، ط، ڑ'' جیسے الفاظ نہیں ہوتے۔ غزارا جب بھی ایسے کوئی لفظ بولتی تو تلا جاتی۔ اس تو تلے پن کی سمجھ ٹیچر کو نہیں آ رہی تھی۔ کئی ساعتوں کے بعد ٹیچر کو سمجھ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کئی لمحوں تک وہ اسے دم بخود دیکھتی رہی۔

چھنال کوئی اچھا لفظ نہیں تھا اور وہ لڑکی ابھی ابھی کوریا سے آئی تھی۔ وہ اردو سیکھ رہی تھی۔ اسے آسان اور اچھے لفظ سیکھنے تھے۔ یہ کونسے لفظ تھے جو وہ سیکھ رہی تھی اور کون سکھا رہا تھا؟

ٹیچر کو تشویش ہوئی تو اُس نے یانگ شی سے کسی گھر والے کو بلانے کا کہا۔ یانگ شی صرف شاہ جہاں کو جانتی تھی۔ ایک وہی تو تھا جو اِس کی فکر کرتا تھا۔ اس کا خیال رکھتا تھا۔ اسے پڑھاتا تھا، اسے اسکول چھوڑتا تھا۔ لینے آتا تھا۔ رات کو اس کو اضافی اُردو کی مشق کراتا تھا۔ کہانیاں

پڑھاتا تھا تاکہ وہ جلد از جلد اُردو سیکھ لے۔

اُردو کی ٹیچر نے ڈائری پر ایک نوٹ لکھا تھا۔ جب رات شاہ جہاں اسے پڑھانے بیٹھا اور ڈائری کھولنے کو کہا تو اس کی ڈائری پر لکھا وہ نوٹ پڑھ کر اُس نے یانگ شی کو تشویش سے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے۔ میم کیوں بلا رہی ہیں؟'' اُس نے کوریا میں ترجمہ کر کے پوچھا۔

''ایک لفظ پوچھا میم سے۔ اُنھوں نے کہا کسی کو بلاؤ۔ یہ غلط لفظ کون سکھا رہا ہے۔ میں نے کہا شاہ پڑھاتے ہیں تو اُنھوں نے آپ کو بلا لیا۔'' چھوٹے چھوٹے فقروں کی کچھ کچھ سمجھ شاہ جہاں کو آ گئی۔ اگلے روز وہ اسے لیے اُسی ٹیچر کے آفس میں تھا۔ غزارا، اس کی ران پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹیچر جو میز کی دوسرے پار تھی، فکر مندی سے شاہجہاں کو دیکھ رہی تھی۔

''اب آپ خود بتائیں کیا چھوٹی سی بچی کو یہ لفظ سکھایا جا سکتا ہے؟ زبان سکھانے کا آغاز گالیاں یا خراب لفظ سکھانے سے کرتے ہیں؟ وہ مجھ سے معنی پوچھ رہی ہے میں کیا بتاؤں، چھنال کسے کہتے ہیں کس کے لیے استعمال ہوتا ہے یہ؟'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

شاہ جہاں دم بخود تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ غزارا کو کوریہ میں وافر مقدار میں گالیاں آتی تھیں۔ اُردو میں بھی وہ گالیاں ہی سیکھ رہی تھی تو کیا وہ زبانوں میں ہمیشہ گالیاں ہی سیکھے گی۔

''بچی ابھی نئی زبان سے نئی نئی متعارف ہوئی ہے۔ وہ جو بھی لفظ سُنے گی، بولے گی۔ چاہے اُسے مفہوم آتا ہو یا نہیں، وہ دہرائے گی وہ لفظ۔ بیٹا (اب وہ غزارا کو دیکھ رہی تھیں) کس نے سکھایا آپ کو یہ لفظ؟ کیا لائبہ، ماریہ یا عصمت نے؟ بتائیں مجھے؟''

ٹیچر نے اس کی کلاس فیلوز کے نام لیے جو اس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تھیں۔ شاہ جہاں نے دیکھا کہ غزارا بہت خوفزدہ ہے۔ بار بار مٹھیاں مروڑ رہی ہے۔ اس نے اُس کے ننھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھرے اور اس کا رُخ اپنی جانب موڑ دیا۔

''کس نے سکھایا یہ لفظ یانگ شی؟'' وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

''طف اوو ما (عاطف کی ماما)'' اس نے پلکیں اٹھا کر سادگی سے کہا۔ شاہ جہاں نے گہرا سانس لیا۔

''معاف کیجیے گا میڈم۔ بچی ہے جو بھی سُن رہی ہے بول رہی ہے۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ آئندہ وہ ایسا کوئی لفظ نہ سیکھے۔'' اس نے یقین دہانی کرائی۔

''ایسا ہی کریں شاہ جہاں بیٹا۔ میں اسے تو غلط لفظ کا اچھا معنی بتا کر اسے بہلا دوں گی لیکن آگے سے وہ اس لفظ کا استعمال کرے گی اور باقی لوگ واقف ہیں کہ کس لفظ کا اصلی معنی کونسا ہے۔'' ٹیچر ہمدردی اور فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔

''جی میم۔ میں سمجھ گیا۔ میں یانگ شی کو بھی سمجھا دوں گا۔ وہ ایسا کچھ نہیں بولے گی۔'' شاہ جہاں نے مستحکم لہجے میں کہا اور غزارا کو لیے باہر آ گیا۔

اُس رات کو وہ چھوٹی چچی کے کمرے میں تھا۔ چچا بھی تھے اور دادی بھی۔ چچی بری طرح مشتعل تھیں۔ بار بار نتھنے پھلاتے ہوئے پہلو بدل رہی تھیں۔ وہ ادب سے، مدھم اور شائستہ الفاظ میں کہہ رہا تھا۔

''چچی جان۔ وہ بچی ہے ابھی۔ اُسے کچھ نہیں پتا۔ دوسرا وہ زبان سیکھ رہی ہے، ایسے بھیانک لفظ اُسے اُلجھا سکتے ہیں۔ آپ کو اُسے ڈانٹنا ہے ڈانٹیں مگر پلیز ایسے غلط الفاظ استعمال نہ کریں جن کے مفہوم آپ کے بچوں کو بھی نہ آتے ہوں۔''

''جو سچ ہے میں نے وہی کہا۔ ہے وہ چھنال کی بیٹی۔ اب اس سے زیادہ کیا کہوں؟ بھلے سے وہ میری بات سمجھے نہ سمجھے۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔'' روشنا نے بے رحمی سے سر جھٹکا۔

''دیکھیں، جو بھی ہوا، جیسے بھی ہوا۔ پھوپھو کا قصور تھا۔ غزارا کا نہیں۔ غزارا کو تو یہ سب

معلوم بھی نہیں ہے۔اس لیے کیا ہم اُسے معاف کر سکتے ہیں؟''

''دیکھو لڑکے۔ پورے خاندان میں صرف تمہیں اُس سے ہمدردی ہے اور کیوں ہے کوئی نہیں جانتا۔ جتنی جان تم اس لڑکی پر لٹاتے ہو، اپنی سگی بہنوں پر بھی نہیں لُٹاتے۔ خیر۔اب میں بولوں گی تو سب کہیں کہ روشنا تو بول اگلتی ہے۔اس لیے یہاں سے جاؤ، وہ غلطی کرے گی تو کوسنے بھی سُنے گی۔ جب اس کی ماں نے ہماری عزتوں کا لحاظ نہیں کیا تو بھئی میں کسی کا لحاظ کیوں کروں؟''

''دادی.....آپ کچھ کہیں ناں.....'' شاہ جہاں نے گم صم بیٹھی دادی کو دیکھا۔

''روشنا کم از کم ایسے لفظ بولنے سے گریز کرو جو معنی سے خراب ہوں۔''

''اور اگر کسی پہ فٹ بیٹھتے ہوں تو؟'' روشنا نے تیزی سے پوچھا۔دادی لاجواب ہوگئی۔

چچا اکڑوں بیٹھے، آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ جبڑے کسے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا جیسے گھر سے بھاگی ہوئی بہن کا ذکر ہی اُن کے رگ وپے میں کڑواہٹ بھر رہا ہو۔

''تم جاؤ لڑکے۔ابھی تمہارے بڑے زندہ ہیں۔ ہمیں پتا ہے ہمیں کیا کرنا ہے۔آگئے موصوف منہ اٹھا کر مجھے سمجھانے۔اب کل کے پیدا مجھے سمجھائیں گے۔اپنا کام کرو جاؤ۔'' وہ نخوت سے کہتی، اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

شاہ جہاں مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔

یہ سب یاد کر کے غزالہ گھٹ گھٹ روتی رہی پھر جلدی سے آنسو پونچھے اور گیٹ کی طرف بڑھ گئی جہاں سے ڈرائیور کچھ لمحے پہلے گاڑی لے کر گیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ شاہجہاں کی غیر موجودگی میں اس کا سانس لینا، اس حویلی میں دشوار تھا۔

☆.....☆.....☆

عرفان صاحب نے چار دن کا کہہ کر پورا ہفتہ لگایا تھا۔ جب وہ ایک ہفتے بعد آئے تو نہا دھونے کے بعد جیسے ہی باہر نکلے ٹھٹک گئے۔ عفت بیگم جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ بے چینی سے ناخن بھی چبا رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے؟ جلدی جلدی بتائیں تاکہ آپ کا اضطراب کم ہو جائے۔'' وہ خوشگوار لہجے میں کہتے ہوئے سنگھار میز کی طرف بڑھ گئے اور برش اٹھا لیا۔ عفت بیگم ناک چڑھاتی ہوئیں اُن کے پاس آئیں۔

''آپ کی بیٹی نے دماغ خراب کر رکھا ہے میرا۔ اڑی ہوئی ہے ابھی تک اپنے مطالبے پر کہ شاہجہاں سے طلاق چاہیے۔ شاہجہاں سے طلاق چاہیے۔''

''تو تم نے سمجھایا نہیں؟'' وہ بالوں میں برش چلا رہے تھے۔

''کتنی بار سمجھاؤں۔ میں تھک گئی ہوں۔ اب آپ سمجھائیں اُسے۔'' وہ بے زاری سے بولیں۔

''شاہجہاں کیا کہتا ہے؟'' انھوں نے برش رکھا اور ان کی طرف پلٹے۔

''وہ تو کچھ بھی نہیں کہتا مگر.....'' کہتے کہتے وہ رُکیں، اب چہرے پر ایک گھبراہٹ بھرا تاثر تھا۔ عرفان صاحب نے بھنویں یکجا کیں۔

''مگر؟''

''اب وہ بولے گا عرفان صاحب۔ اب وہ، آپ کی بہن کی بیٹی جو آ گئی ہے۔ اب وہ بولے گا آپ دیکھ لیجیے گا۔''

''لیکن تم نے تو کہا تھا کہ وہ باپ کی رہائی کے لیے پیسے کمانے آئی ہے۔'' انھوں نے یاد دلایا۔

''ہاں۔ میں اس وجہ پر اُمید باندھ سکتی تھی لیکن عرفان صاحب آپ کی بیٹی اور داماد کا جو تعلق ہے، وہ اتنا بے بنیاد اور ڈھیلا ہے کہ وہ لڑکی، جو باپ کی رہائی کے لیے آئی ہے۔ شاہجہاں

صاحب کو اُمید دے سکتی ہے کہ اب وہ بولے۔'' انھوں نے خوفزدہ لہجے میں آگاہ کیا۔

عرفان صاحب کی تیوری چڑھی۔

''یہ سب وہ اُس کمینے حامد کے لیے کر رہی ہے۔ یہ لڑکا۔ میں بتا رہا ہوں عفت بیگم، یہ بہت بڑا زخمی ہوگا مجھ سے کسی دن۔'' انھوں نے جارحیتی انداز میں مٹھی بھینچی۔

''میں تو کہتی ہوں آپ زخمی کر ہی دیں اُسے اگر وہ.....''

''اگر اسے آپ نے ہاتھ بھی لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا.....'' حمنہ کھڑکھڑا کے کہتی کھٹاک سے دروازہ کھول کر اندر آئی۔ یقیناً وہ باہر کھڑی یہی سُن رہی تھی۔ دونوں نے تیزی سے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''بس کریں بابا۔ ابھی تک وہ ناپختہ رشتہ نبھا رہی ہوں مگر اور نہیں۔ اب مجھے آزادی چاہیے۔ میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''شرم نہیں آتی تمہیں؟'' عفت بیگم نے درشتی سے اُس کا بازو پکڑا۔ ''شوہر کے ہوتے ہوئے دوسروں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہو۔ ہم اِدھر تمہارا رشتہ بچا رہے ہیں اور اُدھر تم اُس نامحرم، کمینے آدمی کے لیے باپ کے سامنے چلا رہی ہو؟''

''میرا منھ مت کھولیں ماما۔ ورنہ وہ سب سامنے آجائے گا جو اب تک نہیں آیا۔'' حمنہ نے خبردار یہ انداز میں ماں کو دیکھا۔ عفت بیگم کی ساری خفت ہوا ہوگئی۔ شاہجہاں کے کمرے میں جانے، اسے بہکانے کی ساری چال عفت اور طاہرہ بیگم نے کی تھی۔ گھر والے سب اس معاملے سے بے خبر تھے۔ حمنہ کی زندگی کی بربادی کی ذمہ دار وہ خود تھیں۔

انھوں نے گرفت ڈھیلی کی اور اسے ہلکا سا دھکا دیا۔

''جاؤ اپنے کمرے میں۔ دفع ہو جاؤ۔''

”جا رہی ہوں لیکن اگر حامد کو کچھ ہوا تو میں اس گھر کو تہس نہس کر دوں گی۔ جانتے نہیں ابھی آپ لوگ مجھے۔“ وہ لہو دیتی آنکھوں سے خبردار کرتی پیر مارتے ہوئے نکل گئی۔

عرفان صاحب پائنتی پر بے بس انداز میں گر گئے۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں آ کر حمنہ نے فوراً شاہ جہاں کو فون ملایا لیکن کال disconnect ہو جاتی۔ کئی کالز کرنے کے بعد وہ سخت جھنجھلاتے ہوئے زید کے کمرے میں آئی۔ وہ شہزادے کا کاسٹیوم پہنے آئینے کے سامنے اپنے play کی ریہرسل کر رہا تھا۔ حمنہ جا کے اُس کی پشت پہ کھڑی ہوئی۔

”call your dad,He is not answering me.“ وہ چلائی۔

”Dad isn't in country,He is in london,call him on whatsapp“ وہ بھی اسی انداز سے تیزی سے بولا۔

حمنہ نے کچھ دیر اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا پھر فون لیے باہر آ گئی۔ کمرے تک واپس جاتے جاتے وہ شاہجہاں کو فون ملا چکی تھی جو کچھ گھنٹیوں کے بعد اٹھا لیا گیا تھا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ ابھی اسی وقت۔“

”میں ائیر پورٹ جا رہا ہوں۔ بعد میں بات کریں گے۔“ اُس نے بھی خشک لہجے میں کہتے ہوئے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ وہ دانت چباتے ہوئے کلس کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ واپس آ رہا تھا۔ اس کی ہفتے بھر کی مصروفیت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے ڈائریکٹر کو فون کیا تھا ائیر پورٹ آنے کے لیے۔ وہ حسبِ عادت بیگ پکڑے یہاں وہاں دیکھ رہا تھا اور اسی لمحے

سامنے سے ایک روپہلے رنگ کی پرتعش گاڑی رینگتی ہوئی آئی۔ وہ اس کی گاڑی نہیں تھی، وہ حمنہ کی تھی جسے دیکھ کر وہ کچھ چونکا مگر اگلے ہی پل روپہلی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا اور عرفان صاحب باہر نکلے جن کو دیکھ کے شاہجہاں کی چونک غائب ہوگئی۔

''خوش آمدید.....'' عرفان صاحب اسی بارُعب انداز میں کہتے آگے آئے اور اس کے گلے لگے۔ جب تک کہ وہ پیچھے ہٹتے ان کا ڈرائیور باہر نکلا اور شاہجہاں کا سامان لینے لگا۔

''شکریہ.....آپ کیوں لینے آئے۔ میرا ڈرائیور آیا ہوگا۔'' وہ تکلف سے بولتے ہوئے پیچھے ہوا۔ ڈرائیور نے سامان کار کی ڈکی میں رکھ دیا۔

''مجھے کچھ بات کرنی تھی تم سے.....'' عرفان صاحب نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ''اگر تم میری گاڑی میں چلو تو، بس کچھ آگے تک، اس کے بعد حویلی چلے جانا۔''

''ایسی بھی کیا بات ہے چچا جان؟'' وہ پریشان ہوگیا۔

''کچھ خاص نہیں۔ بس کچھ گزارش کرنی ہے۔ آؤ، بیٹھو۔'' انھوں نے خود گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

''مگر میرا ڈرائیور.....''

''ارے بھئی میں نے اسے واپس بھجوایا ہے۔ تم دوبارہ بلا لینا۔ اب آؤ۔''

وہ خاموشی مگر قدرے تعجب سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ ایک شیشے کی سمت تھا اور عرفان دوسرے۔ درمیان میں ایک شعوری فاصلہ تھا۔ گاڑی چل پڑی تو کچھ دیر خاموشی رہی، عرفان صاحب شاید الفاظ تول رہے تھے۔ شاہ جہاں نے شیشے چڑھایا کہ آواز ختم ہوجائے پھر اُن کی سمت مڑا۔

''کہیے چچا جان۔ کیا بات کرنی تھی۔'' وہ توجہ سے انھیں دیکھنے لگا۔

عرفان صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔

''شاہجہاں بیٹے۔ جو بات میں کرنے جا رہا ہوں۔ اُسے ایک باپ کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرنا۔'' انھوں نے التجائیہ انداز میں تمہید باندھی جس پر شاہ جہاں نے محض سر ہلا کر یقین دلایا۔

''دیکھو بیٹا ماضی میں جو کچھ ہوا میں اسے بھولنے کو تیار ہوں۔ میں کیا، تمہاری چچی، حمنہ تمہارے بڑے سب تمہارا گناہ معاف کرنے کو تیار ہیں۔ وہ ایک حادثہ تھا، ایک گھٹیا وقت تھا جس کا نشانہ میری بیٹی بنی۔ جو کچھ بھی ہوا، وہ سب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم نے اُس پر لعنت بھیجی اور گھر کا معاملہ گھر رکھا۔ حمنہ جو بھی ہے، تمہاری بیوی ہے اور تمہارے بچے کی ماں ہے۔ میں جانتا ہوں وہ خودسر ہے۔ ضدی ہے، جذبات میں غلط فیصلے کر جاتی ہے لیکن تم تو سمجھ دار ہو۔ بڑے ہو اُس سے۔ تم اُس جیسی کم عقلی تو نہیں کرو گے۔ مجھے یقین ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ میں ڈر رہا ہوں۔ وہ لڑکی اڑ گئی ہے اپنا گھر برباد کرنے پر اور بالکل نہیں سُن رہی ہماری۔ بیٹا.....'' انھوں نے اس کا بازو دبایا۔

''تم اسے لینے آ جاؤ۔ اسے منا لو۔ میاں بیوی کی ناراضگیوں کو اتنی دیر اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ تم بس آ جاؤ، بلکہ ابھی میرے ساتھ چلو۔ تم اُسے مناؤ، اپنی محبت کا یقین دلاؤ، وہ مان جائے گی۔ ضدی ہے لیکن محبت کے آگے پگھل بھی جایا کرتی ہے مجھے یقین ہے تم اُسے مناؤ گے تو پگھلی ہوئی موم کی طرح تمہارے پاس آ جائے گی۔''

شاہجہاں نے آہستہ سے اپنا بازو چھڑایا۔

''میں اسے کبھی لینے نہیں آؤں گا چچا۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے، میں نے نہیں نکالا۔''

''کیا تم اُس کی ضد سے واقف نہیں ہو؟ وہ کبھی نہیں آئے گی۔''

''تو نہ آئے۔ آپ کے پاس ہی رہے۔'' اس نے لاپرواہی سے سر جھٹکا۔

عرفان صاحب کو بے اختیار اچھو لگا۔ کیا عفت بیگم کی بات سچ ثابت ہونے والی تھی۔ کیا واقعی شاہجہاں اب بولنے والا تھا۔ کیا اس کا برسوں پہلے کیا وعدہ سچ ہونے جا رہا تھا اور اس کی بیٹی برباد؟

شاہجہاں شیشے کے پار دیکھ رہا تھا۔ انداز بہت چڑچڑا تھا۔

عرفان صاحب کے تاثرات بے بسی سے کینہ توزی میں بدلے۔ ''تم جانتے ہو شاہجہاں، میں وہ باپ ہوں جس کی بیٹی کا ریپ کیا ہے تم نے۔''

شاہجہاں نے بھونچکا کے دیکھا۔ ''ریپ؟''

''ہاں۔ ریپ۔ اُس رات جس حالت میں وہ تمہارے کمرے میں پائی گئی.....'' کہتے کہتے اُن کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں انتقامانہ خلش سے سرخ ہو گئیں۔ ''خیر..... جانے دیتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں بھتیجے کہ تم زید کا خیال کر لو۔ وہ بچہ کس طرح در بدر ہو رہا ہے۔''

''آپ کی بیٹی کر رہی ہے۔ میں نہیں۔''

''مسئلہ یہ نہیں کہ کون کر رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کون ہو رہا ہے۔''

''یہ ایسی نصیحت آپ اپنی بیٹی کو بھی کرتے ہیں؟'' اس نے طنز سے پوچھا۔

''وہ کبھی نہیں ہو سکتی۔'' عرفان صاحب کی رگیں تن گئیں۔

''جی.....؟؟'' وہ ٹھٹکا۔

''غزارا..... تمہاری..... کبھی..... نہیں..... ہو سکتی.....''

شاہ جہاں کا دل بے اختیار حلق کو آ گیا۔ سارا خون نچڑ گیا۔

''وہ تم سے پندرہ سال چھوٹی ہے۔ تمہارے لیے بالکل بہن جیسی ہے وہ۔ تم ایک عمر کو پہنچ

چکے ہو، سینتیس سال کافی ہوتے ہیں کہ مرد کو پختہ کرنے کے لیے۔ تمہارا بیٹا اُس کے چھوٹے بھائیوں جیسا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ تم اتنی کم عمر اور نوخیز لڑکی سے شادی کا سوچو۔ کیا تمہارے اندر ذرا شرم حیا نہیں ہے؟"

ڈارئیور بے اختیار ہنس پڑا۔ شاہجہاں نے سخت نظروں سے ڈرائیور کو دیکھا لیکن وہ ڈھٹائی سے اُسے بیک ویو میں دیکھ رہا تھا۔ عرفان صاحب نے ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کے بال چھوئے۔

"بالوں میں سفیدی آ گئی ہے۔ بوڑھی گھوڑی کو اس عمر میں لال لگام لگانے سے گریز کرنا چاہیے بھتیجے۔" وہ حسد بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ شاہ جہاں کا دل زور سے دھڑک رہا تھا اور غصے کا الاؤ، پورے جسم میں بھنور کی طرح گھوم رہا تھا۔

"وہ لڑکی ابھی انجان ہے۔ اگر تمہاری سچائی سے واقف ہوئی تو وہ....."

"میں اس سے شادی نہیں کر رہا چچا۔" دفعتاً اُس نے کہا۔

"کیا کہا؟" عرفان صاحب ٹھٹک گئے۔

"میں غزالا سے شادی کبھی نہیں کروں گا۔"

عرفان صاحب نے چچہ گیر ڈارئیور کو دیکھا۔ دونوں کی نظروں میں بے اعتباری تھی۔ شاہجہاں نے سر اٹھایا۔ اب اُس کی نگاہیں شیشے کے پار پیچھے کو دوڑتی درختوں پر تھیں۔

"میں نے اُس سے خیانت کی ہے۔ دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کچھ بھی کرنا چاہیے لیکن خیانت نہیں کرنی چاہیے اور اگر کسی ایک سے ہو جائے تو اُسے خود بخود دوسرے سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ Cheating is not allowed in love,not at all." وہ کرب سے کہنے لگا۔

''اور وہ لڑکی؟ اُس کا کیا خیال ہے؟'' عرفان صاحب نے ٹٹولا۔

''اُس سے کیا فرق پڑتا ہے چچا؟'' وہ زخمی سا ہنسا۔ ''جب اُسے معلوم ہوگا، اُس کا دل ٹوٹے گا۔ وہ لعنت ملامت کرے گی پھر ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ کورین لڑکی ہے، ایک غیر جذباتی تہذیب سے تعلق رکھتی ہے اور break ups کے مفاہیم سے بھی واقف ہے۔ وہ move on کر لے گی۔''

عرفان صاحب کے چہرے پر ایک تسلی بھرا تاثر آیا۔ بے چین سے جسم میں سکون اُتر گیا۔

''گاڑی روک دو ڈرائیور، مجھے اُترنا ہے۔'' اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔ وہ یکدم بہت تھک گیا تھا۔

ڈرائیور نے سڑک کنارے گاڑی لگا دی۔ شاہجہاں نے سیٹ پر پڑا کوٹ اٹھایا اور دروازہ کھول دیا لیکن ایک پیر باہر رکھنے کے بعد اس نے پلٹ کر عرفان صاحب کو دیکھا۔

''رہی بات حمنہ کی۔ تو میں اسے لینے کبھی نہیں آؤں گا۔ وہ خود آنا چاہتی ہے تو آسکتی ہے۔ اور زید۔ تو اس کی رسی میں نے مضبوطی سے تھامی ہے۔ وہ میرے اور حمنہ کے درمیان جھولے گا ضرور لیکن کبھی گرے گا نہیں۔''

جتاتے انداز میں کہتے ہوئے وہ باہر نکلا، ڈکی کھولی، بیگ کھینچا۔ گاڑی کچھ ہی پل میں فراٹے بھرتی ہوئی دور نکل گئی۔ اب وہ تھا، خالی سڑک تھی اور اس پر تیزی سے رینگتی ہوئی گاڑیاں۔

☆.....☆.....☆

جانے کتنی دیر تک وہ سڑک کنارے بیگ گھسیٹے ہوئے، بازو پر کوٹ ڈالے چلتا رہا۔ کونسی سڑک تھی، کیسا راستہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ بالکل اس کی زندگی کی طرح۔ وہ ایک ایسے مسافر جیسا تھا جو کسی انجان اسٹیشن پر اُتر گیا ہو، یا ایک ایسے اندھے انسان کی طرح تھا جس کی بینائی یکدم

لوٹ آئی ہو۔ لورلور چلتے، ماضی میں اُلٹے قدم بھاگتے وہ جب تھک ہار گیا تب ڈرائیور کو فون کر کے بلایا اور گھر گیا۔ اس وقت شام کے گہرے سائے پھیل چکے تھے۔

وہ پہنچتے ہی کمرے میں گھس گیا، نہا دھو کر سو گیا۔ پانچ گھنٹے بعد جب وہ اٹھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کئی ساعتوں تک وہ کھوکھلی کھوکھلی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا۔

عرفان صاحب کی باتیں، اُس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ اُس رات کے المیہ کا سارا بھگتان اس کے سر آیا تھا۔ وہ ہوس پرست، خبیث اور گھر کی عورتوں پر نظر رکھنے والا قرار دیا گیا تھا۔ حمنہ کی ذات نے ہمدردی، محبت اور خود ترسی سمیٹی تھی۔ ملامت، لعنت اور تشنے اس کا نصیب بنے تھے۔

ٹوٹتے اعصاب کے ساتھ وہ اٹھا اور غسل خانے تک گیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے اپنا بیگ کھولا۔ زپ کھولتے جو چیز پہلی نظر میں اس کے شعور کا حصہ بنی تھی، وہ ایک باکس تھا جس میں وہ غزارا کے لیے تحفے لایا تھا۔ اس نے وہ باکس اٹھایا اور جانے کیا خیال آیا کہ وہ بے اختیار اُس کے کمرے کی طرف چلا آیا۔

دروازہ کے سامنے رُک کے اس نے ایک گہرا سانس لیا اور انگلی کے جوڑ سے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا، البتہ موہوم سی آواز آ رہی تھی جیسے دور کہیں کوئی جھرنا گر رہا ہو۔ اس نے دوبارہ دستک دی۔ جواب ندارد تھا۔

تیسری بار دستک دینے پر دروازہ نہیں کھلا تو وہ ناب گھماتے ہوئے خود ہی اندر آ گیا۔ احتیاطاً دروازہ کھلا رکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ بیڈ نفاست سے بنا ہوا تھا البتہ صوفے پر ایک سفید رنگ کی شال پڑی تھی جس کے اوپر ایک بیگ تھا۔ اس نے پلٹ کر غسل خانے کی سمت دیکھا جو بند تھا اور جس کے اندر سے ہی جھرنے جیسی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً غزارا نہا رہی تھی۔ وہ باکس

لیے بیڈ کی پائنتی پر ایک طرف بیٹھ کے انتظار کرنے لگا۔

اس وقت وہی تھی جو اس کا ذہنی اضطراب ختم کر سکتی تھی۔ اس کے لہو میں پنپتے بھنور کو روک سکتی تھی۔ دس منٹ گزرے تھے، وہ اضطراب سے گھٹنا جھلا رہا تھا تب پانی گرنے کی آواز تھمی، پھر دس منٹ مزید گزرے، اس کی نگاہ اُس سمت دیکھ رہی تھیں جب گلاس ڈور کھسکا اور وہ باہر آئی۔ سفید شرٹ کے نیچے گلابی رنگ کا ٹروذر پہنے، بالوں کو تولیے میں باندھتی، وہ ہلکا ہلکا گنگنا رہی تھی۔ جونہی نگاہ شاہجہاں پہ پڑی، وہ جیسے خواب سے جاگی۔ شاہ جہاں استقبالاً کھڑا ہو گیا۔

''شاہ.....؟؟'' برق سی تیزی سے وہ اس کی طرف لپکی۔ بوکھلاہٹ اور بے خودی سے قدر تھی کہ اُس کے بالوں سے تولیہ کھل کر گر گیا۔ اس سے قدم بھر دور وہ ٹھہر گئی۔ ''آپ نے جمعے کو آنا تھا اور آج منگل ہے۔ اتنا لیٹ کیوں؟''

شاہ جہاں مسکرایا۔ ''کام بڑھ گیا تھا۔''

''یہ وعدہ خلافی ہے۔ کم از کم آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے شاہ۔'' وہ خفگی سے بولی۔

شاہ جہاں کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ''آئی ایم سوری یانگ شی۔''

''اب سوری کیوں کر رہے ہیں۔ آپ نے مجھے سرپرائز بھی تو دیا ہے۔'' وہ خفت سے کہنے لگی۔ شاہجہاں کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔ جب جب اُسے دیکھتا، ایسا لگتا جیسے وہ سات سال کی غزارا ہو۔ اگر اس نے قد نہ نکالا ہوتا تو وہ کبھی اُس کی عمر کا اعتبار نہ کرتا۔ کبھی کبھی ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا کوئی پیارا بڑا ہو جائے۔ کچھ لوگ بچپن میں ہی زیادہ پیارے لگتے ہیں۔

''یہ میرے لیے ہیں؟'' وہ بیڈ پہ پڑے باکس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے اٹھا کر کھولنے لگی۔ نم بالوں سے پانی قطرہ قطرہ گرتا ہوا، اُس کے شرٹ میں جذب ہو رہا تھا۔ شاہجہاں

خیالوں سے نکلا اور اُس کی طرف پلٹا۔

''یہ بیگ..... یہ بیگ میرے لیے ہے؟'' وہ بے یقینی سے پوچھنے لگی۔

''ہاں۔''

''اور یہ گھڑی بھی؟'' اس نے peach رنگ کے ڈائل اور سنہرے اسٹریپ والی گھڑی لہرائی جو چل نہیں رہی تھی مگر کمرے کی روشنیوں کے باعث بہت چمک رہی تھی۔

''ہاں۔ سب تمہارا ہے۔'' وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا۔

''یہ بہت خوبصورت ہے شاہ۔ آپ کو یاد تھا پیچ کلر میرا فیورٹ ہے۔ ہاہ..... آپ میرے بارے میں کچھ نہیں بھول سکتے۔'' وہ جذباتی ہوئی تھی۔

''لاؤ میں پہناؤں۔'' اس نے پیش کش کی۔ غزارا اُس کے سامنے کھڑی ہوئی اور اپنی کلائی آگے کر دی۔ شاہجہاں گھڑی باندھنے لگا۔

''اس گھڑی میں ایک خاص بات ہے۔ یہ نبض کی حرکت پر چلتی ہے۔ جیسے جیسے نبض چلے گی، اس کی سوئیاں چلیں گے۔ اس کے اسٹریپ میں سینسرز لگے ہیں جو بتاتے ہیں کہ گھڑی کلائی کے گرد لپٹی ہوئی ہے۔''

غزارا نے جھک کر ڈائل دیکھا، سوئیاں حرکت میں آ گئی تھیں۔

''یہ نبض کی رفتار سے چلتی ہے؟''

''ہوں۔''

''اور اگر نبض رُک جائے تو؟'' اس نے یکا یک پوچھا۔

''تو گھڑی بھی رُک جائے گی۔''

''یعنی یہ گھڑی وقت دکھانے کے لیے نہیں، وقت کو تھامنے کے لیے ہے۔''

''کہہ سکتے ہیں۔''

''عجیب بات ہے شاہ۔'' وہ گھڑی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے مجھے ایسا تحفہ دیا ہے''

''کیوں؟ پسند نہیں آیا؟''

''پسند؟ آپ کا دیا ہوا ہر تحفہ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔'' وہ مان بھرے لہجے میں بولی۔ شاہجہاں کو اُس کی آنکھوں میں اٹوٹ اپنائیت نظر آئی جس میں ایک مان، ایک بھروسہ اور آگ کا دریا پار کرنے کی صلاحیت تھی۔ وہ نرمی سے مسکرا دیا۔

''اِسے نہیں کھولو گی۔'' اس نے آخری باکس کی طرف اِشارہ کیا۔

''اوہ..... یہ بھی ہے۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔'' اس نے ایک طرف رکھے اس باکس کو اٹھالیا۔ ڈھکن ہٹا کر دیکھا تو اندر سے شیشے سے بنا سرخ رنگ کا ایک دل نکلا۔ ایسا دل جس کے عین درمیان بڑا سا کریک تھا۔ وہ ایک شوپیس تھا۔

''اب یہ کیا ہے؟'' وہ پریشان ہوگئی۔

''یہ دل ہے مس یانگ۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''وہ تو نظر آرہا ہے لیکن یہ کیسا دل ہے جو دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔'' اس نے الٹ پلٹ کر اس کو حیرت سے دیکھا۔

''یہ جڑ بھی سکتا ہے۔'' شاہ جہاں نے احتیاط سے اُس کے ہاتھ سے پیس لیا اور اندرونی طرف کچھ سلائیڈ کر دیا، دل کھسک کر قریب ہوگیا اور کریک ختم ہوگیا لیکن ایک آڑھی ترچھی درز تا حال موجود تھی۔

''یہ real heart break کی نشانی ہے یانگ شی۔ جب دل ٹوٹتے ہیں تو گزرتا ہوا وقت اُنھیں جوڑ دیتا ہے لیکن دل کے جڑنے کے باوجود یہ crack ہمیشہ رہتا ہے جو بتاتا

ہے کہ دل کبھی ٹوٹا تھا۔ جانتی ہو یانگ شی دل جب ٹوٹ جاتے ہیں تو heal ہو جاتے ہیں لیکن کبھی recover نہیں ہوتے۔''

وہ گردن اٹھائے اُسے دیکھتا، عجیب ندامت، عجیب لہجے میں کہہ رہا تھا۔ تھکا ہوا، غمزدہ لہجہ۔

غزارا نے دل کو اٹھا کر آنکھوں کے سامنے کیا۔

''آپ سارے symbolic gifts لائے ہیں مگر پھر بھی بہت اچھے ہیں۔ بہت شکریہ شاہ، مجھے بہت پسند آئے۔ مجھے کم ہی کوئی تحفے دیتا ہے۔ شکریہ مجھے special محسوس کرانے کے لیے۔'' وہ ممونیت سے کہتی، سارے تحفے اٹھا کر ڈریسنگ میں لے گئی۔

جب واپس آئی تو تولیہ اٹھانے کا خیال آیا لیکن اب تک بال خشک ہو چکے تھے۔

اس نے تولیہ ایک طرف صوفے پر ڈال دیا اور وہاں پڑی اپنی شال اٹھائی۔

''کیسا رہا آپ کا ٹرپ؟'' وہ اُس کے پاس آئی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ شال خود کے گرد لپٹالی۔ شاہ جہاں اُس کی سمت مڑا۔ ایک ٹانگ نیچے تھی، ایک فولڈ کر کے بیڈ پر پڑی تھی۔

وہ اسے بزنس ٹرپ کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ چپ چاپ اُسے سنتی رہی۔ اُس کے بولتے وقت اُس کی پلکوں کی جنبش، اُس کی ہونٹوں کی حرکت، اُس کے تاثرات کے زیر و بم نوٹ کرتی رہی۔ اُس کے نرخرے کے چڑھنے، اُترنے کے اُس حسین نظارے کو وہ مبہوت ہو کر دیکھ رہی تھی۔

کتنی دیر گزری معلوم نہ ہو سکا۔

وہ اپنی جمائیوں، انگڑائیوں اور تھکے اعصاب کو بمشکل نیند میں جانے سے روک رہی تھی جس کے سبب بے اختیار اُس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ شاہجہاں اتنا باتونی نہیں تھا۔ وہ

خاموش طبیعت کا مالک تھا لیکن آج عرفان صاحب نے جو کہا تو اس غبار کو یونہی نکالنا چاہتا تھا۔ بول کے، دل ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ وہ نیند پوری کر چکا تھا جب کہ غزارا سارے دن کی تھکی ہوئی تھی۔

دو گھنٹے تک وہ اس کی ہمہ تن گوش رہی پھر اس کے پپوٹے بھاری ہو گئے اور سر خود بخود جھولنے لگا۔ جھولتے جھولتے وہ بے اختیار شاہجہاں کی سمت لڑھک گئی۔ شاہجہاں نے اُسے تھام لیا اور آہستہ سے بستر پر ڈال دیا۔ کمفرٹر اسے اوڑھنے کے بعد اس نے سائیڈ لیمپ بند کیا اور کمرے کی مین بتی بجھانے کے بعد باہر آ گیا۔

اب وہ کم بے چین اور کم کرب میں تھا۔

☆.....☆.....☆

زید اس وقت کمرے میں کھڑے ملازم کو تندہی سے سامان پکڑا رہا تھا۔ کچھ کپڑے جو کور بیگز میں ٹنگے ہوئے تھے۔ تلوار، تاج، بوٹس، چغہ نما شال جو ایک بڑے سے باکس میں تھیں۔ اس کی اسکرپٹ جو ملازم کو دینے کی بجائے، اس نے ہاتھ میں پکڑ لی اور ایک باسکٹ جس میں کھانے کا سامان تھا۔

آج اُس کا سکول میں اسٹیج پلے تھا جس میں وہ شہزادے کا کردار ادا کر رہا تھا۔ شاہجہاں اُسے لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ گاڑی گھر کے باہر انتظار کر رہی تھی۔ وہ جھٹ پٹ اپنا سامان ملازم کی بانہوں میں پھینک کے، ایک طائرانہ وار نظر کمرے میں دوڑانے کے بعد باہر نکل آیا۔

''جلدی چلیے رشید کاکا..... بابا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ ہڑبڑاہٹ میں سیڑھیوں کی طرف لپکا، جب ہی نیچے سے اپنی ماں کو اوپر آتا دیکھا۔ وہ فون میں مگن تھی۔ چہرے پر مشکوک سی مسکراہٹ تھی۔

جس لمحے رشید اُس کے پہلو سے نکل کر نیچے گیا، وہ ٹھٹک کے رُکی۔ اس نے پلٹ کر رشید کو راہداری میں آگے جاتے دیکھا پھر واپس مڑ کر زید کو..... جو برا سا منھ بنائے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''It"s staurday mom.....'' وہ اتنا ہی بولا اور سیڑھیاں پھلانگ گیا۔

saturday,saturday..... یہ لفظ اُس کے ذہن میں گونجا، شعور نے جذب کیا تو وہ چونکی اور اگلے ہی پل وہ برانگیختگی سے اُس کے پیچھے آئی۔

''زید..... رُکو..... بات سُنو.....''

وہ تیزی سے بھاگتی پورچ میں گئی جب تک کہ وہ مین گیٹ سے نکل رہا تھا۔ وہ پھرتی سے اُس کے تعاقب میں لپکی۔ گیٹ کو دھکیلتی جب وہ حواس باختہ انداز میں باہر آئی تو ہانپ کے رُک گئی۔

شاہجہاں ڈرائیورنگ ڈور کے پاس کھڑا تھا۔ نیوی بلیو شرٹ اور گہرے کریم رنگ کی پینٹ پہنے ہوئے۔ شرٹ کی آستینیں فولڈ تھیں۔ وہ گاگلز لگائے زید کے بال سہلاتا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ اتنا ہینڈسم لگ رہا تھا کہ بے ساختہ حمنہ کی دھڑکن تھم گئی۔

''چلیں؟'' اس نے زید سے کہا۔ ملازم بیک سیٹ میں سامان رکھ کے اندر جا چکا تھا۔

''چلیں بابا.....'' وہ مسکرایا اور باپ کے پہلو سے نکل گیا۔ اسی لمحے شاہجہاں کی نظر حمنہ پڑی۔ وہ سیاہ پینٹ اور سیاہ ہی شرٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔ گردن میں مفلر نما سٹالر تھا اور بال پونی میں قید تھے۔

وہ بدمزگی سے مڑا اور گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔

''شاہ..... میری بات سنو.....'' یکا یک وہ آگے آئی اور اُس کا دروازہ روک کے کھڑی ہو گئی۔

وہ جھنجھلا کے اُس کی طرف مڑا۔ ''کتنی بار کہوں میں تم سے مس عرفان کہ میرا پورا نام لے کر بلایا کرو۔''

''تم بھی تو حمنہ کہہ سکتے ہو۔'' وہ دوبدو بولی۔

''کیا تم یہی بکواس کرنے آئی ہو؟'' شاہجہاں نے غصہ روکا۔

''نہیں۔ مجھے کچھ بات کرنی تھی۔'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔ اندر بیٹھا زید گردن نیچی کر کے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاہجہاں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ پلے شروع ہونے میں وقت کم تھا۔

''جو کہنا ہے جلدی کہو۔ وقت نہیں میرے پاس۔''

''وقت نکالو پھر..... مجھے دوٹوک بات کرنی ہے کہیں اکیلے میں بیٹھ کے، صرف میں اور تم.....''

شاہجہاں کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بدستور دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ آرٹریو اینڈ گرل میں ملو مجھے شام پانچ بجے۔'' اس نے ایک کیفے کا نام لیا اور اس کا ہاتھ سختی سے دروازے سے ہٹایا پھر گاڑی میں بیٹھ گیا اور کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ اگلے ہی پل گاڑی فراٹے بھر کے وہاں سے نکلی۔

☆.....☆.....☆

''she is not into me dad,she is too selfish.....'' کچھ دیر آگے جا کے اسے زید کی روٹھی ہوئی آواز آئی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے، منہ پھلائے شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

شاہجہاں نے ایک نظر اسے دیکھا پھر مسکرا کر اُس کا گال چھوا۔

''Dont worry,she will be alright.''

No she won't,she knows that it's my big day" today yet she does'nt paid any heed to it.My all friends would have their parents with them and look at me,how pitiful I am ,I have both "parents,yet I am an orphan.

شاہجہاں کا پیر بریک پہ پڑا،اگلے ہی پل گاڑی رُک گئی۔

"کیا کہا تم نے؟" اس نے بے یقینی سے زید کو دیکھا۔

"یہی کہ میں یتیم ہوں بابا۔" وہ اسی لے میں روٹھ کے بولا۔

شاہ جہاں کو اگلا سانس نہیں آیا۔

"آپ دونوں میری کیئر نہیں کرتے۔آپ نے ماما کے پاس پھینک دیا ہے مجھے اور ماما کہتی باپ کی پیداوار ہو۔کیا مطلب اس کا؟" وہ رونے لگا۔

"زید....." شاہجہاں کا لہجہ کرب سے ٹوٹ گیا۔

"آج وہاں کتنے لوگ ہوں گے ڈیڈ؟ سب کے پیرنٹس ہوں گے وہاں۔ایک میں اکیلا ہوں گا۔" وہ زور زور سے ہچکیاں لے رہا تھا۔"میرا کوئی نہیں ہوگا۔ میں پرنس بنا ہوں۔ پرنس....."

شاہجہاں سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔گاڑی گھٹن زدہ ہو رہی تھی۔پھر اس نے شیشہ کھول دیا۔

"میں نے زید کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔وہ میرے اور حمنہ کے بیچ جھولے کا ضرور مگر کبھی گرے گا نہیں۔" اسے اپنا عویٰ یاد آیا۔زید جھول ہی تو رہا تھا۔اُس کی رسی ٹوٹ ہی

تو رہی تھی۔

زید اب رو کر خاموش ہو چکا تھا۔

کافی دیر یونہی گزری..... وہ نقش کالحجر بنا رہا..... سرد ٹھنڈا مجسمہ..... پھر اس نے گاڑی واپس سڑک پہ ڈال دی۔

☆.....☆.....☆

کچھ دیر بعد وہ اسکول پہنچ گئے۔ پلے اسکول کے ہال میں کرایا جا رہا تھا۔ شاہ جہاں اُس کا سامان اٹھائے، اُس کے ساتھ چل رہا تھا۔ ذہن عجیب سے انتشار کا شکار تھا۔ مرکزی دروازے سے ہال کے دروازے تک زید خاموش تھا۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں پھر ہال کے آغاز پہ اُسے اپنے کچھ دوست مل گئے۔

''بابا، آپ ہال میں جائیں، مجھے بیک اسٹیج جانا ہے۔ یہ مجھے دے دیں۔'' اس نے خفا چہرے کے ساتھ باکس، کپڑے اُس سے لیے اور اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے راستے پر ہولیا۔ شاہ جہاں اُس وقت تک اُسے دیکھتا رہا جب تک وہ اوجھل نہ ہوا۔ ہال کی راہداریوں، لابیوں میں بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ کھڑے تھے۔ کہیں کہیں اساتذہ اُن سے بات کر رہے تھے۔ کہیں ماں باپ خود اُس سے مل رہے تھے۔

اسکی رگ و پے میں طیش دوڑ گیا۔ اس نے لب بھینچتے ہوئے تیزی سے فون نکالا اور حمنہ کا نمبر ملایا۔ فون بزی جا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ ملایا۔ بزی ہی ملا۔ اس نے پے در پے کئی کالز کیں، لیکن بزی تھا، بزی ہی رہا۔ کوفت سے اس نے فون بند کر دیا۔ اسی پل اسے خاور صاحب مل گئے جو فوج میں میجر تھے اور جن کا بیٹا زید کا اچھا دوست تھا۔

''ارے شاہجہاں صاحب۔ بڑی مدتیں ہو گئیں ملاقات کیے ہوئے۔'' وہ آتے ہی اِس

کے گلے لگے پھر پیچھے ہوئے۔ ''کیسے ہیں آپ؟ بھابھی کیسی ہیں؟ آئیں نہیں؟''

''ام.....وہ.....دراصل اُس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔اس لیے.....''

''اوہ.....اللہ اُنھیں شفا دے۔آئیں ہال میں چلتے ہیں پھر سیٹیں فل ہو جائیں گی۔'' وہ شاہجہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا ہال میں چلا گیا۔

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ساری سیٹوں پر ماں باپ براجمان تھے محض پہلی کچھ نشستیں اساتذہ، معزز مہمانوں اور آرٹ سٹاف سے بھری ہوئی تھیں۔اسٹیج بالکل سامنے تھا، سطح سے دو فٹ بلند جس پر لمبے، سرخ پردے اس وقت گرے ہوئے تھے۔دوسری طرف سے ٹھک ٹھوں کی آوازیں آ رہی تھیں، یقیناً کوئی سیٹنگ چل رہی تھی۔

کچھ پل یونہی گزرے پھر پردے اٹھ گئے، روشنی جل اٹھی، میوزک آن ہوا، بچے مختلف کاسٹیوم پہنے اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ ہر بچہ ایک کردار بنا ہوا تھا اور اپنی باری پہ بھرپور اداکاری کرتے ہوئے مکالمہ پڑھ رہا تھا۔پس منظر میں صوتی تاثرات اُبھرتیں اور جہاں خاموشی ہو جاتی وہاں نریٹر کہانی کے بہاؤ کو آگے بڑھاتا۔

زید ابھی نہیں آیا تھا۔ابھی عمومی کردار تھے جو پلے کی تمہیدی فضا کو روانی دے رہے تھے۔

پھر وہ گھڑی آئی جب اِس نے شہزادے کے لباس میں زید کو دیکھا۔وہ سجا ہوا کرتا پہنے تھا۔پیروں میں بوٹس تھے، کمر سے بندھی تلوار، سر پہ تاج اور کندھوں پر لٹکتا ہوا چغہ جو پیچھے گر رہا تھا۔وہ اٹھے سینے والا مغرور شہزادہ تھا۔زید بالکل شاہجہاں جیسا تھا۔نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ اُس کی چال ڈھال، بات کرنے کا انداز، سب شاہجہاں پر تھا۔

اُس کی شہزادی جولڑکی بنی تھی، وہ اس سے قد میں کم تھی، نازک سے نیلے رنگ کا کلیوں والا پھولا ہوا فراک پہنے، سر پہ تاج سجائے اپنی نزاکت سے مکالموں کو مزید حساس بنا رہی

تھی۔ وہ اپنی شہزادی کے ساتھ اب ڈانس کر رہا تھا۔ پورے ہال میں اندھیرا تھا، صرف اُن دونوں پر روشنی گر رہی تھی۔

یہ منظر، یہ بہت جانا پہچانا تھا۔ اس نے نہیں یاد کرنا چاہا مگر یاد آ گیا۔ وہ لمحے یاد آ گئے۔ آج سے پندرہ سال قبل، جب وہ شہزادہ بنا تھا اور غزارا شہزادی۔

غزارا کو شہزادی کا کردار ملا تھا۔ اس نے اُردو مکالمے بہت مشکل سے یاد کیے تھے۔ اس کے ساتھ جو لڑکا شہزادے کا کردار ادا کر رہا تھا۔ وہ بہت مشتعل تھا۔ اُسے کوئی اور لڑکی، اپنے لیے شہزادی کے کردار میں چاہیے تھی۔ جب پلے شروع ہوا اور مکالمے بولے جانے لگے تب وہ لڑکا جانے غزارا کی کس بات سے چڑ گیا، کہ اُس نے اپنی تلوار پھینکی اور اسٹیج سے چلا گیا۔ سارے ہال میں سناٹا چھا گیا، عجیب سی چہ مگوئیاں اٹھیں۔

غزارا رو رہی تھی۔ باقی کردار جز بز کھڑے تھے۔ اسٹیج سے نیچے ڈرامہ آرٹ کی ٹیچر اُس لڑکے کو سمجھا رہی تھیں لیکن وہ بہت غصے میں تھا۔ عجیب سی بدنظمی پھیل گئی تھی۔ پھر کچھ ہی ساعتوں بعد وہ لڑکا بھاگ کر ہال سے نکل گیا۔ اساتذہ under study actor لانا چاہ رہے تھے لیکن غزارا بری طرح گھبرا گئی۔ اس سے مکالمے تتر بتر ہونے لگے۔ اسی لمحے شاہ جہاں اُٹھا تھا، وہ اسٹیج پر گیا۔ لڑکے کی پھینکی تلوار اٹھائی اور شہزادہ بن گیا۔

شاہ جہاں کو دیکھ کر غزارا کو کچھ حوصلہ ہوا اور اس نے اطمینان سے اپنے مکالمے بولے۔ اس نے شاہجہاں کے ساتھ ڈانس کیا، اپنا کردار مضبوطی سے نبھایا۔ آخر میں اُس نے شہزادے کو لبوں پر بوسہ دینا تھا۔ ایک ہلکا سا بوسہ، جب وہ لمحہ آن پہنچا تو اس نے شاہ جہاں کے گال پر لب رکھ دیے اور اس کی گردن میں منہ ڈال کر رو پڑی۔

ماضی کا یہ لمحہ، کتنا خوشگوار اور کربناک تھا، نشست پر براجمان شاہجہاں زید کو دیکھتے ہوئے

سوچ رہا تھا۔ پلے ختم ہونے والا تھا۔ زید اب شہزادی کو بوسہ دینے والا تھا، سب دل تھام کے بیٹھے جب زید نے آہستہ سے جھک کر اپنا ہاتھ لڑکی کے ہونٹوں پر رکھا اور اپنے ہی ہاتھ پر ہونٹ ثبت کر دیے۔

شاہ جہاں بے ساختہ مسکرا دیا۔ وہ اسی کا بیٹا تھا، اسے کسی ڈی این اے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہال میں لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ بھی کھڑا تھا۔ تالیاں پیٹ رہا تھا۔ اسٹیج پر موجود تمام کردار اب ناظرین کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ زید اب کھلکھلا گیا تھا۔ پھر وہ سب بیک اسٹیج چلے گئے۔

پلے ختم ہوا تو سب باہر نکلے۔ ماں باپ اپنے بچوں پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ بچے تا حال کاسٹیوم میں ملبوس تھے۔ وہ بے خودی میں چلتا ہوا، اُس بورڈ کے پاس آیا جو مرکزی راہداری میں پوری دیوار پر نصب تھا اور جہاں ہال میں منعقد ہونے والے تمام plays and performances کی تصاویر چسپاں تھیں۔ وہاں اس کی اور غزارا کی تصویر بھی لگی تھی جس میں وہ غزارا کو گود میں اٹھائے، مسکرا رہا تھا۔ وہ بائیس سال کا لڑکا تھا اُس وقت.....

اس نے ہاتھ بڑھا کر اُس تصویر کو چھوا۔

"She is pretty....."

یہ زید کی آواز تھی جو اس کے پہلو کے ساتھ کھڑا، گردن اونچی کر کے تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ شاہ جہاں نے جلدی سے اپنے آپ کو کمپوز کیا اور اس کی طرف مڑا۔

"گریٹ جاب بڈی۔ یو میڈ می پراؤڈ۔ آلو ویو۔" اس نے جھک کے باری باری اُس کے گال چُومے پھر اسے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ ابھی تک کاسٹیوم میں تھا۔ باپ کے سینے سے جڑے، وہ تصویر میں غزارا کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''Who is she dad?'' اس نے پوچھا۔

شاہجہاں مسکرایا۔''she is one of my cousin.....''

زید تعجب سے سیدھا ہوا۔''آپ کی کزن؟ مگر یہ تو چائنیز ہے۔''

''چائنیز نہیں بیٹا، کورین ہے۔''

''کورین؟ کیسے؟''

اس نے کئی بار یہاں اپنے بابا کی تصویر دیکھی تھی اور ہمیشہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ کوئی غیر ملکی سٹوڈینٹ ہوگی۔ غیر ملکی اسٹوڈینٹس اس کے اسکول میں بہت تھے اور پاک چین دوستی کی وجہ سے تو چائنیز زیادہ پائے جاتے تھے۔ اس لیے اس نے نہیں پوچھا۔ یہ لڑکی اس کے بابا کی کزن ہے؟ کیسے؟

شاہ جہاں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اور اس کا رخ پورا بورڈ کی طرف موڑ دیا۔ اگلے دس منٹ وہ اسے غزارا سے متعارف کراتا رہا۔ جہاں زید چونکا تھا، وہیں اسے تجسس بھی ہوا تھا۔

''وہ حویلی میں ہے؟'' اس نے بات سننے کے بعد پوچھا۔

''ہاں۔'' شاہ جہاں نے سر ہلایا۔

''میں اس سے مل سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ ضرور۔''

''مگر ماما آنے نہیں دیتیں حویلی.....'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

شاہ جہاں نے اس کے کندھے پر گرفت مضبوط کی۔''وہ تمہارے بابا کی حویلی ہے چیمپ۔ تم وہاں کبھی بھی، کسی بھی وقت آسکتے ہو۔''

''mom will kill me'' زید نے طنزیہ انداز میں سر جھٹکا۔

''شش..... ایسے نہیں کہتے۔'' شاہجہاں نے تیزی سے ٹوکا۔

''وہاٹ ایور.....'' اس نے تمسخر سے ہاتھ جھلایا۔ شاہجہاں کے دل میں ایک ہوک اٹھ رہی تھی۔ حمنہ اگر اسے لے کر گئی تھی تو پھر اس کی پرورش میں اتنی لاپرواہ کیوں ہو رہی تھی؟ کیا محض اسے تکلیف پہنچانے کے لیے ایسا کر رہی تھی۔ اس نے کراہ کر سوچا۔ زید تاحال غزارا کو گھورے جا رہا تھا۔

''چلو، کچھ کھانے چلتے ہیں۔ بھوک لگی ہے۔'' اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا تو زید نے تصویر سے آنکھیں ہٹائیں۔

''میں پہلے کپڑے بدلوں گا.....'' وہ راہداری میں آگے بڑھ گیا۔

جب واپس آیا تو اسی ڈھیلی پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھا جس میں گھر سے آیا تھا۔

شاہجہاں نے اُس کا سامان گاڑی میں رکھوایا اور اسے لے کر ایک اچھے ریستوران چلا گیا۔

شام پانچ بجے تک اس نے تمام وقت زید کو دیا تھا۔ اُس کا یہ گلہ کہ وہ ''یتیم'' ہے۔ شاہ جہاں کو اندر تک جلا گیا تھا۔ تیزاب کی طرح۔ آج وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ ہر وہ رشتہ جو اس سے ناخوش تھا، اس کا دل بری طرح گھائل کر دیتا تھا۔ وہ بدنصیب نہیں تھا، ہاں مگر رشتوں میں وہ بدقسمت ضرور تھا۔

☆.....☆.....☆

آرٹریو کیفے اینڈ گرل کی بالائی منزل پر کونے والی میز پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ کیفے میں کئی لوگ تھے جو فاصلے فاصلے سے رکھی میزوں پر براجمان تھے۔ مستعد بیرے ہاتھ میں آرڈرز لیے پھر رہے تھے۔ کیفے کی شیشے کی

گرل سے دور مارگلہ کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ انٹیریئر کے باعث کیفے میں رومانوی روشنیوں کا عکس تھا۔ فضا بہت سکھی اور سکون بخش تھی۔

ان کے سامنے میز پر کافی کے بڑے والے کپ پڑے تھے۔ حمنہ وقفے وقفے سے کافی کا کپ اٹھا رہی تھی جب کہ اُس کا کپ کتنی ہی دیر سے ایسے ہی پڑا تھا۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی، سطح پر کریم سے بنایا گیا نقش بھی مٹ گیا تھا۔ وہ اُسی کو گھور رہا تھا۔ زید کی بات دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

''فیصلہ تمہارا ہی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تم مجھے رکھنا چاہو گے۔'' حمنہ محظوظ انداز میں اُسے دیکھ رہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ اسے بتا رہی تھی کہ وہ کیسی لڑکی ہے جو کسی اور سے افیئر چلا رہی ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے اور شاہجہاں کیسا آدمی ہے جو ذرا بھی غیرت نہیں کر رہا، وغیرہ وغیرہ۔ وہی عورت کی ازلی بلیک میلنگ..... وہ بغور سنتا رہا، جب وہ چپ ہو چکی تو اُس نے اوپر لکھا گیا آخری فقرہ بول دیا۔

''تم نے زید کے بارے میں سوچا ہے؟'' ذرا سی نگاہ اٹھا کر اس نے اُس سنگ دل عورت کو دیکھا جسے صرف اپنی پڑی تھی۔ حمنہ کے ماتھے پر بل پڑے۔

''اُس کے بارے میں کیا سوچنا؟''

''اُسے ہم دونوں کی ضرورت ہے۔ ہم دونوں کا یہ جھگڑا، اسے پریشان کر رہا ہے۔''

''اس لیے تو کہہ رہی ہوں ختم کرو اِس کو۔ جب اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اُس کے ماما پاپا ڈیورس ہو چکے ہیں تو وہ آپ ہی ٹھیک ہو جائے۔ ابھی تو وہ اس لیے پریشان ہو رہا ہے کہ اس رشتے کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہو رہا۔'' اس نے شانِ بے نیازی سے لٹ جھٹکی۔ وہ آف شولڈر ٹاپ اور تنگ جینز پہن کر آئی تھی۔

شاہجہاں ذرا سا آگے ہوا۔ ''دیکھو..... وہ بچہ ہے اُسے ان سب چیزوں کا نہیں پتا۔ طلاق کیا ہوتی، وہ نہیں جانتا، بالکل اسی طرح جیسے اسے نہیں پتا کہ شادی کیا ہوتی ہے۔ اسے جو پتا ہے وہ یہ ہے کہ ماں کیا ہوتی ہے اور باپ کیا ہوتا ہے۔ اس لیے سمجھنے کی کوشش کرو، یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ تم اسے.....''

''کیا مطلب؟ اس میں مشکل ہی کیا ہے؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر درشتی سے بولی۔

''میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں، زید کو ضرورت ہے ہم دونوں کی۔'' وہ ذرا سخت ہوا۔

''زید بڑا ہو چکا ہے۔ وہ نو سال کا لڑکا ہے۔ دو سال کا بچہ نہیں۔ سمجھ جائے گا وہ سب۔ تم پلیز یہ بچگانہ ضد چھوڑ دو اور مجھے آزاد کرو تاکہ میں.....'' تیزی سے کہتی وہ یکدم رُکی۔

''تاکہ تم کسی اور سے شادی کر سکو۔'' اس نے جان بوجھ کر حامد کا نام نہیں لیا۔

''یہ میرا حق ہے۔ تم ازدواجی حقوق نہیں دو گے، تو میں کسی سے تو لوں گی ناں۔ آخر میں بھی انسان ہوں، مجھے بھی فیلنگز ہیں۔'' وہ انتہائی خودغرضانہ لہجے میں بولی تھی۔

شاہ جہاں نے کرب سے اُسے دیکھا۔ ''زید بہت پیار کرتا ہے تم سے، کم از کم کچھ سال اور انتظار کر لو جب تک کہ وہ تیرہ چودہ سال کا نہیں ہو جاتا۔''

''وہ چودہ سال کا ہوگا تو میں بوڑھی ہو چکی ہوں گی۔ تمہیں تو اپنی جوانی کی پرواہ نہیں، کم از کم میری بھی برباد مت کرو۔'' وہ بے اختیار چلا اٹھی۔

''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ اُس وقت تک تو بالکل بھی نہیں جب تک زید بڑا نہ ہو جائے۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ حمنہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے درشتی سے ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی۔

''تم مجھے چیلنج کر رہے ہو؟''

''تمہیں جو سمجھنا ہے، سمجھو۔'' وہ اسی سپاٹ لہجے میں بول کر کھڑا ہوا۔

''تم کس سن میں رہے ہو مسٹر شاہجہاں؟ تمہیں کیا لگتا میں لاء، کورٹ کہیں سے بھی تم سے جان نہیں چھڑا سکتی؟'' اس نے تمسخر بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم ایسا ''نہیں'' کر سکتیں ڈیئر فورسڈ وائف۔'' اس نے تپانے والی مسکراہٹ سے کہتے ہوئے میز پر سے کار کی چابی اور فون اٹھایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

وہ مٹھیاں بھینچتی، دانت بجاتی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ یہ مکالمہ، ایسے ہی شروع ہو کر، ایسے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ پچھلے تین سال سے وہ اسی سولی پر آگے پیچھے جھول رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شاہجہاں تیز تیز چلتا کیفے سے اُتر آیا اور پارکنگ کی سمت بڑھا مگر اپنی کار تک جانے سے قبل ہی اُس کی نظر حمنہ کی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے حامد پر پڑی۔ اس نے یونہی، ایک نظر اوپر دیکھا۔ شیشے کی دیوار کے پاس میز پر اب کوئی نہیں تھا۔ اسے جانے کیا ہوا، اپنی گاڑی میں بیٹھ کے اور وہاں سے جانے کی بجائے، شیشے چڑھا کر اُدھر ہی بیٹھا رہا۔

کچھ لمحوں بعد حمنہ باریک ہیلز فرش پہ مارتی ہوئی کیفے سے باہر آئی اور تیوراتی پیشانی کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھی۔ اس سے قبل کہ وہ خود دروازہ کھولتی، اس نے حامد کو اندر سے دروازہ کھولتے دیکھا جس پر حمنہ تیزی سے اندر بیٹھی تھی۔ اس کے بیٹھنے کے بعد، حامد نے گاڑی سٹارٹ نہیں کی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' حامد نے پوچھا۔

''نہیں دے گا۔ پانچ سال تک نہیں دے گا۔'' اس نے بمشکل غصہ روکا۔

''کیوں؟ آخر کیوں؟'' حامد کا ضبط ٹوٹا۔

''زید۔زید چھوٹا ہے۔اسے ماں باپ کی ضرورت ہے۔مائی فٹ.....''

''زید بڑا ہو چکا ہے۔نو سال کا بچہ اچھا خاصا ہوتا ہے۔بتاؤ نا اس کو۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے میں نے نہیں بتایا ہوگا۔وہ نہیں سُن رہا۔اب کچھ اور کرنا ہوگا۔کچھ ایسا کہ وہ بے بس ہو جائے۔'' وہ تیزی سے دائیں بائیں آنکھیں ہلانے لگی۔شاہجہاں دونوں کو مشتعل انداز میں باتیں کرتا دیکھ رہا تھا۔وہ سمجھ رہا تھا کہ کیا بحث چل رہی ہوگی۔حامد نے آنکھیں موند کر پیشانی سہلائی۔

''ایک تو میرا ساتھ بھی کوئی نہیں دے رہا۔بابا یا ماما ساتھ ہوتیں تو عدالت جا کر خلع لے لیتی لیکن وہاں بھی نہیں جا سکتی۔یہ شخص تو میری جوانی برباد کرنے کے درپے ہے۔میں کیا کروں اللہ۔کہاں جاؤں۔'' اس نے بے بسی بھرے انداز میں بالوں میں انگلیاں ڈالیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی، حامد اسی طرح پیشانی سہلا رہا تھا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ کچھ تہیہ کر چکا تھا۔

''تم یہ سب مجھ پہ چھوڑ دو۔بہت ہو گئیں منتیں۔اب میں اسے اپنے طریقے سے دیکھتا ہوں۔'' وہ گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولا۔

حمنہ نے چونک کر اِسے دیکھا۔''کیا کرو گے تم؟''

''یہ مجھ پہ چھوڑ دو سویٹ ہارٹ۔''

اس نے ایک ہاتھ حمنہ کی طرف بڑھایا اور دوسرے تیزی سے گاڑی ریورس کی اور زن سے سڑک پر ڈال دی۔

جب وہ شاہجہاں کی گاڑی کے پاس سے گزرے، اس نے حامد کو اسے چھوتے دیکھا۔ ایک ہوک سی دل میں اٹھی لیکن اس نے گہرا سانس لیا۔

زید..... ہاں زید کے لیے وہ یہ بھی سہہ سکتا تھا۔اس نے کرب سے سوچا اور گاڑی قطار سے باہر نکال لی۔

☆.....☆.....☆

اُسے پاکستان آئے ایک ماہ دس دن ہو چکے تھے۔چینل میں اِس کی ڈبنگ کا دھمال مچا ہوا تھا۔چینل والوں نے اِسے مزید پراجیکٹس بھی دے دیے تھے اور باقی کے چینلز نے بھی اس سے رجوع کیا تھا۔تنگی وقت اور فرصت کی قلت کی وجہ سے وہ زیادہ نہیں، مگر فی الوقت دو تین پراجیکٹس پر کام شروع کر چکی تھی جہاں سے اِسے معقول رقم مل رہی تھی۔اس نے ایک ماہ کے پیسے اور کچھ پراجیکٹس کا ایڈوانس یانگ منی کو بھجوا دیا تھا۔

اس وقت وہ اپنے پہلے پراجیکٹ کی آخری قسطیں ریکارڈ کروا رہی تھی۔وہ ریکارڈنگ روم میں تھی، تین لوگ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔کانوں پر ہیڈ فونز تھے، ہاتھ میں اسکرپٹ اور منھ کے آگے جالیدار مائیک۔سامنے ایل ای ڈی پر ڈرامہ چل رہا تھا، کردار بول رہے تھے اور وہ ریکارڈنگ میں مصروف تھے۔

غزارا (ہیروئن)

عمر (ہیرو)

اورزوبیا (ہیروئن کی دوست).....

(منظر یوں ہے کہ ہیرو اور ہیروئن اپنے کمرے میں ہیں، ہیروئن کپڑوں کو اسٹیم آئرن کر رہی ہے، ہیرو صوفے پر بیٹھا، کچھ فائلوں کو دیکھ رہا ہے۔اُس کے آگے لیپ ٹاپ کھلا ہے۔ دونوں گھر کے آرام دہ لباس میں ملبوس ہیں۔)

ہیروئن: ”کم ووسیون بتا رہا تھا کہ تم کینسر کے مریضوں کے لیے کچھ کرنے والے ہو۔“

ہیرو: (ذرا سی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھتا ہے) ''اُس نے تمہیں بتا بھی دیا؟''

ہیروئن: ''کیوں، تم چھپانا چاہتے تھے۔''

ہیرو: ''میں کیوں چھپاؤں گا۔ میں تو تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔''

ہیروئن: ''کینسر کے مریضوں کے بارے میں کیا سرپرائز ہوسکتا ہے؟''

ہیرو: ''ارے بابا۔ وہ تو اس ڈیل کا حصہ ہے، اصل سرپرائز تو ڈیل تھی لیکن اُس لنگور نے تمہیں یہ بھی بتا دیا ہوگا۔ اُس کے پیٹ میں کوئی بات کیوں نہیں ٹکتی، آخر کوئی اتنا اوتاؤلا کیسے ہوسکتا ہے؟''

ہیروئن: ''کونسی ڈیل، کیسی ڈیل، تم کیا کہہ رہے ہو؟''

ہیرو: (چونکتا ہے) ''کیا اُس نے تمہیں ڈیل کے بارے میں نہیں بتایا؟''

ہیروئن: (ذرا تعجب سے) ''کونسی ڈیل؟''

(ہیرو کاغذ ایک طرف رکھ کے ہیروئن کے پاس آتا ہے اور اس کے ہاتھ سے اسٹیمر لے کر ایک طرف رکھتا ہے پھر اس کے ہاتھ تھامتا ہے۔)

ہیرو: ''ڈانگ وون کمپنی کے ساتھ ہماری ایک ڈیل ہوئی ہے ایراسو! چالیس ملین وان کی ڈیل ہے جس میں تیس فیصد کینسر کے مریضوں کے لیے بطور عطیہ جائے گا۔ پتا ہے، میرے مینیجر نے کہا کہ یہ عطیہ بہت زیادہ ہے، یہ کئی سو ہزار وان بنتے ہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے یہ ڈیل نہیں لینی چاہیے۔ مجھے نقصان ہوگا اور ڈانگ وون کمپنی صرف عطیہ کے لیے یہ پراجیکٹ کر رہی ہے مگر پتا ہے۔ میں نے اس کو لے لیا کیوں کہ میں کینسر کے مریضوں کے لیے ایک فلاحی کام کرنا چاہتا ہوں۔ دل سے مدد کرنا چاہتا ہوں ان کی۔''

(ہیروئن اُس کو ناسمجھی اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات سے دیکھتی ہے، پھر وائس اوور آتا

ہے) ہیروئن: (سوچتے ہوئے) اسے معلوم تو نہیں ہو گیا کہ مجھے کینسر ہے؟'' پھر سر جھٹکتی ہے اور تکلف سے مسکراتی ہے۔ ''یہ تو بہت..... بہت اچھی بات ہے کم جان۔ تم اچھا کر رہے ہو۔''

ہیرو: ''جانتا تھا کہ تم مجھے سپورٹ کرو گی۔ آخر تم بھی تو اُن کے لیے ہی کام کر رہی ہو۔'' (وہ ہیروئن کو پشت سے خود سے جوڑتا ہے اور سامنے آئینے کی طرف موڑ دیتا ہے۔) ''دیکھو خود کو۔ لوگوں کے کام آ آ کے تم اپنا آپ کتنا کمزور کر لیا ہے۔ پیلی پڑ گئی ہو پوری۔''

(ہیروئن بس مسکرا دیتی ہے۔ کچھ نہیں کہتی۔ ایک لمبی خاموشی آتی ہے پھر ہیروئن پلکیں اٹھا کر ہیرو کو دیکھتی ہے۔)

ہیروئن: ''ایک بات پوچھوں؟''

ہیرو: ''پوچھو۔''

ہیروئن: ''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟''

ہیرو: ''اگر محبت کو ناپنے کا پیمانہ ہوتا تو میری محبت سب سے وزنی ہوتی۔''

ہیروئن: ''یہ سچ ہے یا پھر ایویں مجھے بہلا رہے ہو؟''

ہیرو: ''تم میری محبت آزمانہ چاہتی ہو؟''

ہیروئن: ''محبتوں کو آزمانے والی میں کون ہوتی ہوں، محبت کو تو وقت آزماتا ہے۔''

ہیرو: ''یہ آج کا فلسفہ ہے؟''

ہیروئن: ''ہاں، کہہ سکتے ہو۔''

ہیرو: (ذرا پیچھے ہوتا ہے اور میز کی طرف بڑھتا ہے) ''مجھے بالکل سمجھ نہیں آیا پھر۔''

ہیروئن: ''پتا ہے کم جان فلسفہ کب سمجھ آتا ہے؟''

ہیرو: ''کب؟''

ہیروئن: ''جب زندگی سمجھ نہیں آتی۔''

ہیرو: (ذرا دلچسپی سے) ''اور زندگی کب سمجھ نہیں آتی؟''

ہیروئن: ''جب موت نظر آجائے۔''

ہیرو: ''اور موت کب نظر آتی ہے؟''

ہیروئن: ''جب ''محبت'' ختم ہو جائے۔''

ہیرو: (سر ہنس کر سر جھٹکتا ہے) ''اچھا۔ اچھا فلسفہ ہے یہ بھی، اوہ یہ لو، تمہارا فون بج رہا ہے۔''

(ہیروئن فون لے لیتی ہے۔ اسکرین پہ دوست کا نمبر نظر آتا ہے۔ وہ اٹھاتی ہے۔)

ہیروئن: ''ہاں یون جنگ؟ کیا ہوا؟''

دوست: ''تم سے ملنے کا کہا تھا، بھول گئیں؟''

ہیروئن: ''ملنے کا؟ کب؟''

دوست: ''ارے تمہیں او کے دائی سوک سے ملوانا تھا۔ یاد ہے؟''

(ہیروئن کو یاد آتا ہے۔ وہ گردن کی پشت سہلاتی ہے۔)

ہیروئن: ''ہاں، آتی ہوں۔ ایڈریس بھیجو۔''

(دوست ایڈریس بھیجتی ہے۔ اگلا سین آتا ہے۔ ایک بڑا ریستوران ہے۔ روشنیوں سے چمکتا ہو، روشن، جگہ جگہ مختلف وضع قطع کی کرسیاں، میزیں لگی ہیں۔ اوپر سے روشن فانوس لٹک رہے ہیں، وہ ایک مشہور ریستوران ہے۔ ہیروئن بیگ کا اسٹریپ پکڑے اُس نمونے کو سرتا پیر دیکھ رہی تھی جسے یون جنگ اپنا بوائے فرینڈ کہہ رہی تھی)

ہیروئن: ''یہ تمہارا ''نیا بوائے فرینڈ'' ہے؟''

دوست: (خوشی سے سر ہلاتی ہے۔) ''ہاں..... کیسا لگا؟''

ہیروئن: (ذرا ناک سکوڑتی ہے) ''یہ نیا بوائے فرینڈ ہے یا پھر پچھلے بوائے فرینڈ کا ''گلٹ پلیژر'' ہے؟''

دوست: (برا مناتے ہوئے) ''یہ تم کیا کہہ رہی رہو، یہ میری جان ہے۔''

(کہتے ہی، وہ اپنے بوائے فرینڈ کو چومتی ہے اور اسے کس کے گلے لگاتی ہے۔ دوست اس کو دیکھ کے دنگ رہ جاتی ہے، کیا کوئی اتنی جلدی کسی دوسرے میں involve ہوسکتا ہے؟ کیا پچھلا پیار، اتنی جلدی بھلایا جاسکتا ہے؟ نہیں۔نہیں۔)

ہیروئن: ''تمہیں یہ سب چھوڑ دینا چاہیے۔''

دوست: ''کیا مطلب؟''

ہیروئن: ''اگر تم چُول من ہو کو واقعی چاہتی تھیں تو تمہیں اِسے چھوڑ دینا چاہیے۔''

دوست: (شاک سے دیکھتی ہے) ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ چول من ہو، اب جا چکا ہے۔ میں موو آن کر رہی ہوں کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو؟''

دوست کا بوائے فرینڈ: ''تم نے تو کہا تھا جان کہ یہ تمہاری دوست ہے، کیا دوست دوست کا بریک اپ کراتے ہیں؟ وہ بھی پہلی ہی ملاقات میں؟''

دوست: ''تم ٹھیک کہتے ہو، یہ دوست نہیں ہوسکتی۔''

ہیروئن: ''کیا تم اب اس کے لیے میری دوستی پہ شک کروگی؟''

دوست: ''کرسکتی ہوں۔آخر میں او کے ڈائی سے محبت کرتی ہوں۔''

ہیروئن: ''محبت؟ کیا اتنی جلدی محبتیں ہو جایا کرتی ہیں؟''

دوست: ''تمہیں بلانا ہی نہیں چاہیے تھا۔تمہارے فلسفے کسی کو سمجھ نہیں آتے، میں جا رہی ہوں، چلو او کے ڈائی۔''

(وہ بوائے فرینڈ کی کلائی تھام کر وہاں سے واک آؤٹ کر لیتی ہے اور یہاں قسط ختم ہو جاتی ہے۔)

''الحمدللہ، سیکنڈ لاسٹ قسط ہوگئی۔'' غزارا ہیڈ فون اتارتے ہوئے کہتی ہے۔

''مبارک ہو مس یانگ شی، آپ بہت ٹیلنٹڈ ہیں۔'' ڈائریکٹر اُس سے کہتا ہے۔ وہ سر خم کرتی ہے۔ اسی اثنا زوبیا باہر چلی جاتی ہے۔ عمر پہلے ہی جا چکا ہوتا ہے۔ غزارا اسے یونہی یکا یک نکلتے دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔

واش روم جا کے خود کو فریش کرنے کے بعد وہ جب باہر آتی ہے تو دور لابی میں زوبیا کو عمر کے ساتھ بات کرتا دیکھتی ہے۔ وہ کچھ چونکتے ہوئے اُس کے پاس آتی ہے، جب تک عمر وہاں سے چلا جاتا ہے۔

''کیا ہوا زوبیا؟ سب ٹھیک ہے؟'' وہ تشویش سے پوچھتی ہے۔

''ہاں۔ سب ٹھیک ہے، بس کہیں جانا ہے مجھے، تم بھی چل رہی ہو میرے ساتھ۔'' وہ کہتے ہی اندر چلی گئی۔ غزارا نے پلٹ کر تذبذب سے اُسے دیکھا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئی تو چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔

''چلو.....'' اس نے کہا اور غزارا چپ چاپ اُس کے عقب میں چل پڑی۔ پورچ میں عمر کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اگلا دروازہ کھول کے بیٹھ گئی اور غزارا کو پیچھے بیٹھنے کا کہا۔ وہ الجھے الجھے انداز میں پیچھے متمکن ہوئی۔

✿ ..... ✿ ..... ✿

(قسط نمبر: 5)

اسے زوبیا کے تاثرات سے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہونے جارہا تھا۔آج زوبیا کا موڈ اچھا تھا، بھائی کی شادی اگلے ہفتے متوقع تھی، وہ بہت پرجوش تھی پھر جانے قسط کو ریکارڈ کراتے وقت اُس کا موڈ کیوں خراب ہوگیا۔وہ دوران ریکارڈ اسے ٹوکنا چاہتی تھی لیکن سین بہت روانی میں جارہا ہے جس کی سلاست کو وہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

کچھ دیر گاڑی چلتی رہی پھر وہ ایک بلڈنگ کے سامنے رُک گئے جو کسی بینک کی عمارت تھی۔زوبیا اور عمر اُترے، دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوکر بلڈنگ کو دیکھنے لگے۔وہ بھی پیشانی پر بل ڈالے باہر آئی۔عمر اور زوبیا نے ہاتھ تھاما جس پر غزالہ کو اچھو لگا۔اس نے بھونچکا کر زوبیا کو دیکھا۔وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے اندر چلے گئے جب کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی اُن کی پیروی میں چلی آئی۔

اندر وہ دونوں بالائی منزل پر چڑھے پھر ایک لمبی راہداری میں چلتے آگے گئے جہاں ایک نیا عرشہ کھلتا تھا، وہاں کونے سے کونہ جڑے میزیں تھیں جن پر کمپیوٹر لگے تھے اور ورکرز بیٹھے تھے۔پرنٹر کی زوں زوں اور کاغذوں کے پلٹنے کی عجیب سی آوازیں وہاں پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے آگے گئے اور ایک میز کے سامنے رُک گئے جہاں ایک آدمی استری شدہ شرٹ پہنے، گلے میں کارڈ لٹکائے منہمک سا کام کررہا تھا۔زوبیا نے مٹھی سے میز بجائی۔آدمی نے چونک کر سر اٹھایا پھر اگلے ہی پل اِس نے آدمی کو کھڑا ہوتے دیکھا، آفس کے باقی لوگ بھی قدرے متوجہ ہوئے۔

''مبارک ہو۔تمہارا بیٹا ہوا ہے۔'' زوبیا بولی۔آدمی نے الجھن سے اُسے دیکھا پھر عمر کو۔ وہ کچھ نہیں سمجھا۔

''شکریہ زوبیا.....لیکن.....تم.....یہاں؟'' وہ محو حیرت تھا۔

''تمہیں کچھ بتانا تھا۔'' وہ ٹھنک کے بولی۔

''یوسف کی شادی کا کارڈ تو مل چکا ہے پھر؟'' وہ کچھ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

''پھر یہ کہ جلد میری شادی کا بھی مل جائے گا۔'' اس نے تیزی سے عمر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا جسے آدمی نے ایک نظر دیکھا۔دونوں کے ہاتھ بہت مضبوطی سے آپس میں پیوست تھے۔ غزارا دور کھڑی اُنھیں سُن رہی تھی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔مبارک ہو پھر.....'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''ہاں۔میرے لیے۔'' وہ سپاٹ انداز میں کہتی ذرا قریب آئی۔''تمہیں کیا لگا، میری شادی نہیں ہوگی۔مجھے کبھی اصلی محبت حاصل نہیں ہوگی میں ہمیشہ کم نصیب رہوں گی؟''

''میں نے ایسا کب کہا؟''

''کہا نہیں، کیا تو؟ مجھے چھوڑتے وقت۔''

''زوبیا.....تم.....تم کیسے حالات کو کیسے ملا رہی ہو۔''

''کیسے ملا رہی ہوں؟ بولو کہ جھوٹ بول رہی ہوں۔بولو کہ تم نے ہماری بچپن کی منگنی اور محبت کو آگ میں نہیں جھونکا ہے۔بولو کہ میں نے تم سے محبت نہیں کی۔بولو کہ ہم دونوں کے درمیان کچھ نہیں تھا۔'' وہ تیزی سے بول کر اس کے بہت پاس آئی اور براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

آدمی بوکھلا کر پیچھے ہوا تو کرسی سے ٹکرا گیا۔کرسی دھڑام سے گر گئی جس کی چنگھاڑتی ہوئی

آواز آفس میں گونجی۔ ہر طرف خاموشی تھی، کام رُک گیا تھا۔ سب دم سادھے دونوں کو سُن رہے تھے۔ آدمی نے بیشتر خود کو سمیٹا۔

''زوبیا، شاید تم، تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔''

''ہاں۔ غلط ہی سمجھا تھا۔ تم جیسے مکار کو دل دیا تو تو غلط ہی کیا۔ تم تو محبت کے لائق ہی نہیں تھے۔ مجھے لگا کہ تم مجھے میرے فیصلے میں سب سے پہلے سپورٹ کرو گے لیکن تمہیں تو..... تم تو بہت بزدل نکلے۔ تم نے میری محبت کی پرواہ نہیں کی۔ ذرا سی قدر نہیں کی۔ اتنی سی بھی نہیں۔'' وہ بہت ٹوٹ کے کہہ رہی تھی۔ آنکھیں پانی سے لبالب تھیں۔

''اس لیے تم نے بھی شادی کا فیصلہ کر لیا۔'' آدمی جیسا طنز سے ہنسا تھا۔

''ہاں۔ مجھے بھی موو آن کرنے کا حق ہے۔'' وہ تیزی سے بولی۔ غزارا سے روکنا چاہتی تھی لیکن نہیں روک سکی۔ یہ جو ہو رہا تھا غلط تھا۔ بے حد غلط۔

''بیسٹ آف لک دین۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ محبت تمہاری، فیصلہ تمہارا۔'' وہ شانے اُچکا کر بولا۔ زوبیا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر گہرا سانس نکالا اور عمر کا ہاتھ اسی طرح تھامے تیز تیز قدم لیتی وہاں سے نکل گئی۔ باہر راہداری میں آتے ہی اُس نے عمر کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اکیلے آگے بڑھ گئی۔

جب تک عمر اور غزارا بلڈنگ سے باہر آتے، وہ پارکنگ میں گاڑی کے پاس کھڑی، گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ وہ دونوں قدم قدم چل کر اُس کے پاس آئے۔

''زوبیا.....'' غزارا نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونکی پھر جلدی سے آنسو پونچھے، اپنا بیگ کھولا، اندر سے چند نیلے نوٹ نکالے اور عمر کی طرف بڑھائے۔

''یہ لو..... میری مدد کرنے کا شکریہ۔''

عمر نے سہولت سے رقم لے لی پھر انگوٹھے سے گنی اور ''کوئی بات نہیں، آئندہ بھی مدد چاہیے ہو تو بتانا۔'' کہا اور پیسے والٹ میں ڈالنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

غزارا قدرے شاک سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اُس نے یکا یک زوبیا کی کلائی پکڑی۔

''اب تم میرے ساتھ چلو۔''

اور اسے چپ چاپ اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی ٹیکسی کی طرف بڑھی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک کیفے میں وسط والی میز پر آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ غزارا نے چائے منگوائی تھی جس کی پیالیاں دونوں طرف ان چھوئی پڑی تھیں۔

''تو تم نے یہ سب یون جنگ (ڈرامے کا کردار) سے متاثر ہو کر کیا؟'' غزارا ذرا آگے ہو کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ زوبیا نے آنکھیں چرائیں اور نم سا سانس لیا۔

''تم نے کہا تھا کردار میں گھسنا چاہیے۔''

''لیکن تم نے کردار کو اپنے اندر گھسایا ہے۔''

''تو کیا میں نے غلط کیا؟'' وہ تیزی سے بولی۔ ''اس کی شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں غزارا۔ دو بچے ہو گئے اُس کے اور میں ابھی تک ایسی بیٹھی ہوئی ہوں۔ کیا اُس کو میرا ساتھ نہیں دینا چاہیے تھا۔ مجھے سپورٹ نہیں کرنا چاہیے تھا؟''

''کیا اُس پہ لازم تھا؟''

''ہاں۔''

''کس بنیاد پر؟'' غزارا نے سنجیدگی سے دیکھا۔

''محبت کی بنیاد پر۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔''

''ifactuation (کشش) کو محبت کہہ رہی ہو تم؟''

''وہ کشش نہیں تھی۔ محبت تھی۔ ہم ٹوٹ کے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔'' وہ ضد سے کہنے لگی۔

''ہاں جیسے یون جنگ اور چول من ہوا ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔'' غزارا نے تلخی سے چوٹ کی۔

زوبیا کے چہرے پر ناگواری اُبھری۔

''ہماری منگنی بچپن سے ہوئی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے منسوب تھے غزارا۔ یہ یون جنگ کی طرح پل بھر کا تعلق نہیں تھا۔ یہ بیس سال کی بات تھی۔''

''اگر ایسا تھا تو پھر اُس نے شادی کیوں کی؟''

''اُس نے بے وفائی کی ہے۔'' وہ سسکی لے کر بولی۔

''جہاں محبت ہو، وہاں بے وفائی نہیں ہوتی میری جان۔ تم دونوں کے درمیان جو بھی تھا، محبت نہیں تھی۔''

''اچھا۔ تو پھر کیا تھا تمہی بتاؤ۔'' زوبیا نے طنز سے پوچھا۔

غزارا کچھ دیر اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اُس نے شیشے کے پار دیکھا جہاں کیفے کا کاؤنٹر نظر آ رہا تھا۔ وہاں کچھ نئے مہمان کھڑے رسپشن پر کچھ آرڈر کر رہے تھے۔ اُن کے ساتھ بڑا سا اکیوریم تھا، اتنا بڑا جیسا کوئی ٹنکی رکھی ہو۔ اُس میں رنگ برنگی مچھلیاں خاموشی سے بلبلے بناتے ہوئے تیر رہی تھیں۔ کچھ سطح پر تھیں اور کچھ گہرائی میں۔ وہ کچھ دیر اُس سمت دیکھتی رہی پھر زوبیا نے اُسے گہرا سانس لیتے دیکھا۔

''تم دونوں کے درمیان ''اُلفت'' اور ''ہمدردی'' تھی۔'' اس نے ہلکا سا سر نیہوا ڑا جیسے

یہی برحق ہو۔ یہی سچ ہو۔ زوبیا کچھ دیر اس کو دیکھتی رہی پھر وہ طنزیہ مسکرائی۔

''محبت اور الفت ایک ہی چیز ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ''محبت اور الفت معنی کے لحاظ سے بھلے ایک جیسے الفاظ ہوں لیکن شدت اور گہرائی کے لحاظ سے ''محبت'' تہہ میں ہے اور الفت ''سطح'' پر۔''

''کیا مطلب؟'' زوبیا الجھ گئی۔

''وہ اُس اکیوریم کو دیکھو۔'' غزالہ نے اشارہ کیا جس پر زوبیا نے اپنی گردن اُس سمت موڑ دی۔

''وہ ایک ہی طرح کا پانی ہے لیکن مچھلیوں کو دیکھو، دو پانی کے اوپر اوپر تک آ رہی ہیں تیرنے کے لیے لیکن وہ نیلی مچھلی..... وہ ہمیشہ نیچے رہتی ہے۔ تہہ میں۔ اوپر نہیں آتی، وہ گہرائیوں کی مچھلی ہے۔ اسی طرح محبت گہرائی کی چاہت ہے جب کہ اُلفت سطح کی چاہت ہے۔ دونوں میں صرف شدت کا فرق ہے۔ یوں سمجھو الفت خالی زکام ہے اور محبت ٹی بی جیسی مہلک بیماری۔''

''تمہارا مطلب میرے اور اُس کے درمیان صرف الفت تھی۔''

''ہاں۔ الفت۔ الفت کسی کے ''پیارے یا اچھے'' لگنے کو کہتے ہیں۔ محبت اُس سے بڑا درجہ ہے، پھر عشق اس سے بھی بڑا، پھر جنون اس سے بڑا اور سب سے بلند درجہ ہے ''فنا'' کا اس کے بعد کچھ نہیں بچتا، محبت امر ہو جاتی ہے۔''

زوبیا اس کو بغور سن رہی تھی۔

''وہاں تک کوئی نہیں پہنچ پاتا، یا شاید پہنچنا نہیں چاہتا۔ کیوں کے ان تمام درجوں کے درمیان بڑا فاصلہ ہے اور اس فاصلے پر کئی امتحان، کئی لالچ، کئی نفسانی خواہشیں اور کئی ایسی

چیزیں ہیں جو انسان کو کھینچتی ہیں۔ وہ آدمی، وہ الفت سے محبت کا درجہ طے کر سکتا تھا، لیکن فاصلے کے درمیان موجود ''شادی، گھر داری، بچے، خاندان''، کی رکاوٹ نے اُس کے ارادوں کو متزلزل کر دیا۔ وہ اپنی محبت میں ڈگمگا گیا اور جو محبت میں ڈگمگا جائے، اُس کی گرفت ہی ڈھیلی ہوتی ہے۔ اُس کی تمہارے لیے اور تمہاری اُس کے لیے، بس الفت تھی، محبت نہیں''

زوبیا نے ٹشو سے ناک رگڑی۔ اُس کے چہرے پر اب طمانیت بھرا احساس تھا۔ یوں جیسے اُسے اپنے جذبات سے آزادی مل گئی ہو۔ جیسے حلق میں پھنسا خوش فہمی کا کانٹا نکل گیا ہو۔

''جانتی ہو ہم نے محبت کے مفہوم میں دو چیزیں ملا دی ہیں۔ ''انانیت''، ''عزت نفس''۔ محبت میں یہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ عاشق عزت نفس اور محبوب میں انا کا ہونا، محبت کو کبھی قائم نہیں رہنے دیتا۔ ہم سمجھتے ہیں اگر دو لوگ، جو ایک دوسرے سے محبت کے دعوے دار ہیں۔ تو ان کو برابری کی سطح پر ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ شاید پہلے ہوا کرتا تھا جب جذبوں میں خلوص اور محبت میں صداقت تھی۔ اب یہ ہوتا ہے زوبیا کہ اگر ایک انسان نے دوسرے میں ایک کمی دیکھی ہے تو وہ تیسرے کو ڈھونڈ کر اُس کمی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً اگر ایک مرد کی بیوی کم حسین ہے تو وہ حسین لڑکی سے دوستی یا تعلق رکھ کر اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی مرد کی شکل، دولت یا اُس کے اسٹیٹس میں کمی ہو تو عورت اس کو ہر وقت ری پلیس کرنے کے بارے میں سوچتی ہے۔ چاہے وہ اس کا اظہار کرے نہ کرے، چاہے اُس کے بس میں ہو یا نہ ہو، اُس کی خواہش ہمیشہ یہی ہوتی ہے۔ ہم کبھی ایک دوسرے کو ''کمیوں'' کے ساتھ قبول نہیں کرتے۔ ہم سوچتے ہیں کیوں کریں؟ کیا باقی لڑکیاں یا لڑکے مر گئے ہیں دُنیا میں؟ ہمیں بہتر مل جائے گا لیکن جانتی ہو، بہتر کبھی نہیں ملتا۔ ہر دوسرا، کسی نہ کسی کمی کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ جو نعم البدل کا چکر ہے ناں زوبیا، یہی تعلقات کی خرابی کا باعث ہے۔ ہم کمیاں دور نہیں کرتے،

ان سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔ اُن کو ری پلیس کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اُس آدمی نے تمہارے ساتھ یہی کیا۔ تمہیں قبول کرنے کی بجائے، تمہیں ری پلیس کیا۔ تم نے بھی یہی کیا۔ اس کو جانے دینے کی بجائے، عمر سے ری پلیس کرنے کی کوشش کی۔ یہ غلط ہے۔"

زوبیا سر جھکائے ہوئے تھی۔ چہرے پر ندامت تھی۔

"میں نے سوچا جان جنگ نے ایسا کیا، یعنی چول من ہو کو جلانے کے لیے تو میں....."

"تو تم بھی ایسا کرو گی؟ آہ زوبیا تم بھی ناں۔" غزارا نے کراہ کر بات مکمل کی۔

"کہانیاں چاہے ڈراموں کی شکل میں ہوں، ناول کی شکل میں ہوں یا فلموں کی شکل میں۔ کہانیوں میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ ایک الگ پلاٹ، الگ قصے اور الگ مقصد کے تحت ہوتا ہے۔ ہم، ہماری زندگی، ہمارے آس پاس کا ماحول، ہماری تہذیب ثقافت، ہمارا دین، ہمارے قدریں، ہمارا خاندان یہاں تک کہ ہمارا جسم، اُس کہانی سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر ہمارے ساتھ، وہ سب کیسے ہوسکتا ہے؟ زوبیا اور جان جنگ میں بڑا فرق ہے۔ ان دونوں کے حالات مختلف ہیں، وہ دونوں ایک دوسرے کو متاثرہ نہیں کر سکتے، صرف متاثر کر سکتے ہیں۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ زوبیا نے آنکھیں میچ لیں۔

"آئی ایم سوری، میں غصے میں آ گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے جان جنگ میں ہوں، جو وہاں ہوا، وہ میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ جان جنگ نے اس کا حل نکال لیا تھا، میں نے کیوں نہیں نکالا۔ اس لیے میں نے عمر کو پیسے دیے کہ کچھ دیر کے لیے میرا ساتھ دے اور....." وہ پشیمانی سے کہتے ہوئے خاموش ہوگئی۔

"ایک وقت ایسا آتا ہے جب قاری اور لکھاری یکجا ہو جاتے ہیں۔ جب ناشر اور ناظر یکجا ہو جاتے ہیں، جب مصور اور بصارت یکجا ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں کے

حالات بھی ایک جیسے ہوں گے۔تم خود سوچو،اس آدمی نے تمہارے گھر والوں کو بتا دیا،تو تم کیا کروگی؟ عمر کو پھر سے پیسے دوگی؟''

''وہ جانتا ہی ہوگا کہ عمر کو میں نے ہائیر کیا تھا۔وہ مجھ سے واقف ہے کہ میں کسی سے دوستی نہیں رکھتی، میں نے جو کیا، غصے میں کیا۔'' وہ خود کو ایک کمزور سی تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''یہ اچھی بات ہے لیکن تم دوبارہ یہ سب مت کرنا۔محبت کی دعوے دار ہو تو اسے نبھاؤ، نہیں نبھائی جاتی تو محبت کے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ۔'' غزارا نے دوٹوک لہجے میں کہا جس پر زوبیا نے محض سر ہلا دیا۔

جب وہ کیفے سے باہر آئیں تو زوبیا کسی حد تک پرسکون ہو چکی تھی۔ایک اچھی تسلی چاہے لفظی ہو، انسان کی ذہنی وحشت کم کر دیتی ہے جیسے اُس کی ہوئی تھی۔ابھی وہ کیفے کی سیڑھیوں سے اُتر رہی تھیں جب غزارا کا فون بجا۔اِس نے رُک کر بیگ سے فون نکالا تو یانگ منی کا نمبر تھا۔اس نے فوراً سے بیشتر کال اٹھائی۔

''آینگ ہاسیوایمو (ہیلو پھوپھو، سلام) کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں۔تم سناؤ۔'' یانگ منی نے پوچھا، اُس کے پیچھے لوہے اور برتن ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔''

''دوائی لے رہی ہو ناں؟ ناغہ تو نہیں کرتیں؟'' یانگ منی نے اس کی گھبراہٹ کے متعلق کہا تھا جو اسے ہر قدم پر ہونے لگتی تھی۔

''جی لے رہی ہوں۔یہاں کی دوائیں اچھی ہیں۔'' (اس نے جھوٹ بولا، حالانکہ دوا کو ختم ہوئے دوسرا دن تھا)

''پھر تو اچھی بات ہے۔ سنو یانگ شی، تمہیں کچھ بتانا تھا۔'' کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولی۔ وہ جو آخری سیڑھی اُترنے والی تھی، وہیں رُک گئی۔ زوبیا قدرے دو قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ لوگ کیفے کے اندر جا رہے تھے۔

''ہاں ای مو بولو ناں۔ سن رہی ہوں۔''

''میں نے اوپا (بھائی) کے لیے وکیل ہائیر کیا ہے۔''

''وکیل؟'' وہ چونکی۔

''ہاں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا بھائی کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے۔ یانگ شی، تم تو جانتی ہو ہم لوگ اتنے امیر نہیں کہ آناً فاناً پیسے جمع کر دیں، تم بھی پکستان گئی ہو کمانے۔ ہم انتظار تو نہیں کر سکتے، اس لیے وکیل میں نے ہائیر کیا۔ میں نے ٹھیک کیا ناں؟'' وہ روہانسے انداز میں تسلی مانگ رہی تھی۔

''ای مو۔ کیا ہم وکیل کی فیس بھر پائیں گے؟ کیا یہ یقینی ہے کہ ہم بابا کو ٹرائل جتا دیں گے؟''

''تم جانتی ہو، میری مدد کون کر رہا ہے؟'' یانگ منی اترائی۔

''کون؟''

''یوشنگ، وہ والا وکیل جس نے سانگ لیو کو پھانسی سے بچایا تھا۔''

غزارا چونک گئی۔ ''یوشنگ ہماری مدد کر رہا ہے؟''

''ہاں۔ وہ خود آئے تھے۔ انھوں نے کہا وہ اوپا کو ضرور باہر نکالیں گے۔ بس ایک دو ٹرائل ہوں گے زیادہ سے زیادہ اور تم جانتی ہو، انھوں نے فیس پر تیس فیصد رعایت دی ہے۔''

''کیا؟ آپ سچ کہہ رہی ہیں؟'' وہ لاکھوں مسرت ہوئی تھی۔

''ہاں۔سچ کہہ رہی ہوں۔''

وہ سیڑھیوں پر بلیوں اُچھل پڑی۔''ای مو یہ بہت بڑی خبر ہے۔تم نے کمال کر دیا ای مو۔تم بہت کمال ہو۔''

زوبیا قدرے حیرانی سے اُسے دیکھنے لگی۔

''بس تم اپنا خیال رکھا، مجھے پیسے بھیجتی رہنا،کوریہ کو میں سنبھال لوں گی۔''یانگ منی نے یقین دہانی کرائی۔

''تم فکر نہیں کروای مو، میں جلد ہی تمہیں اچھی رقم بھیجوں گی۔تم نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ آج کا دن زبردست ہے۔''وہ آسمان کو دیکھ کے جھوم اٹھی۔

جب اس نے فون رکھا تو زوبیا تذبذب سے اُس کے قریب آئی۔

''کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے۔بہت خوش لگ رہی ہو؟''

''خوش ہوں۔لگ نہیں رہی۔پتا ہے اپا کے لیے ہم نے وکیل ہائیر کرلیا ہے۔یانگ منی کہہ رہی تھی، اب صرف کچھ ٹرائل ہوں گے اُس کے بعد اپا جیل سے رہا ہو جائیں گے۔''وہ دبے دبے جوش سے کپکپا رہی تھی۔

''مبارک ہو۔یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔''زوبیا نے برابر جشن منایا۔

''میں شاہ کو بتانا چاہتی ہوں۔میں اس کو فون کرتی ہوں۔''اس نے جلدی جلدی فیڈ نکالی مگر اس سے قبل کے وہ نمبر ملاتی، اس نے سر اٹھا کر یہاں وہاں دیکھا پھر وہ کچھ دیر آگے چلی، وہاں سے بائیں طرف دیکھا پھر دائیں طرف۔جب وہ پلٹ کر اپنی جگہ پر آئی تو زوبیا حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''یہاں سے شاہ کا آفس قریب ہے۔ایسا کرتے ہیں،فون نہیں کرتے۔اُس کے آفس جاکے اُس کوسرپرائز کرتے ہیں۔کیا خیال ہے؟''اس نے فون پینٹ کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔اگر قریب ہے تو چلے جاتے ہیں۔''زوبیا جھٹ پٹ تیار ہوگئی۔

وہ وہاں سے ٹیکسی لے کر شاہجہاں کے آفس آگئیں۔یہ دو جڑواں عمارتیں تھیں۔بلاکس کی شکل میں بنی،آٹھ منزل عمارتیں جن کی کھڑکیاں شیشے کی تھیں۔دونوں فاصلے پر تھیں لیکن داخلے کا راستہ ایک ہی تھا۔جب وہ چھوٹی تھی،تب شاہجہاں اُسے اکثر یہاں لاتا تھا۔تب عمارتوں کے سامنے خالی میدان ہوا کرتا تھا جس میں لاتعداد درخت اور جنگلی جھاڑیاں ہوتی تھیں۔اب یہاں چھوٹی چھوٹی عمارتیں،کوارٹر اور مورچے تھے۔میدان کی جگہ گھاس اور باغیچے نے لے لی تھی۔

اب عمارتیں زیادہ خوش افزا لگتی تھیں۔شاہجہاں کے آفس میں کئی لوگ آتے جاتے تھے۔ایک جم غفیر لگا ہوتا تھا۔اسی لیے نہ صرف بیسمنٹ کی پارکنگ تھی بلکہ عمارت کے باہر احاطے میں بھی وسیع روش میں گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں۔

وہ دونوں پہلی عمارت کی طرف چلی آئیں جہاں پروموشن آفس ہوا کرتا تھا۔شاہ جہاں اُس برانچ کا سربراہ تھا۔عمارت جیسی باہر سے پرتعش تھیں،اتنی ہی اندر سے بھی دیدہ زیب تھیں۔انٹیریئر اس قدر پرآسائش تھا کہ کونے کونے پر باریکی سے کام کیا گیا تھا۔زوبیا ایڑھیوں پر گھوم رہی تھی۔

''کیا کمال کے آفس ہیں۔تمہارا ننھیال بہت امیر ہے غزارا۔''اس نے ستائش سے تبصرہ کیا۔وہ ہلکی سی مسکرائی۔اب اُسے کیا بتاتی کہ اس دولت و وسعت میں اُس کی پھوٹی کوڑی

نہیں۔ رسپشن پر دو لڑکیاں اور ایک لڑکا، کھڑے تھے۔ وہاں بھی کئی لوگ تھے۔ وہ قریب گئیں تو ایک لڑکی اِن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''سلام میڈم۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' رسپشنسٹ نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

''شاہجہاں سے ملنا ہے۔ اُن کو بتائیں کہ یانگ شی آئی ہے۔''

''شاہجہاں سر تو ابھی ابھی نکلے ہیں۔''

''باہر گئے ہیں؟''

''ہاں۔ کچھ دیر پہلے۔ میرے خیال سے ابھی تک پارکنگ میں ہی ہوں گے۔'' لڑکی نے بتایا۔

''ٹھیک ہے شکریہ۔'' اس نے مسکرا کے سر ہلایا اور زوبیا کی طرف پلٹی۔ ''چلو پارکنگ میں چلتے ہیں وہ اُدھر ہی ہوں گے۔''

وہ اپنی کہہ کر لفٹ کی طرف بڑھ گئی جو بیسمنٹ میں جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک ہاتھ میں کار کی چابیاں اُٹھائے، دوسرے میں فون تھامے، اسکرین کو دیکھتے ہوئے جا رہا تھا۔ شاید کچھ اہم پیغامات تھے جن کا جائزہ لے رہا تھا۔ نیلی پینٹ اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ نیلا ہی کوٹ تھا جس کے تمام بٹن کھلے تھے۔

پارکنگ میں نیم اندھیرا تھا۔ موٹے موٹے ستونوں کے اندر فاصلے فاصلے سے قطاروں کی شکل میں گاڑیاں پارک تھیں۔ فرش پر سڑک کی طرح سفید پٹیاں کھینچی گئی تھیں۔

اس نے چابی کا بٹن دبایا تو دور کھڑی گاڑی کی لائٹیں آواز کے ساتھ جلنے لگیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا، اُس طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ گاڑی کے پاس پہنچا لیکن دروازہ کھینچنے سے پہلے، وہ

ٹھٹک گیا۔ اسے غیر ارادی طور پر کچھ محسوس ہوا۔ کچھ آہٹیں۔ اس کی چھٹی حس پھڑکی۔ کچھ گڑبڑ تھی۔ اس نے فون بند کر کے پینٹ کی جیب میں ڈالا اور گاڑی لاک کر کے پلٹا۔

دور تک پارکنگ خالی تھی۔ گاڑیاں بند تھیں۔ پورا سناٹا تھا۔

وہ کچھ جز بز ہوا لیکن سر جھٹک دیا مگر اسے قبل کے وہ نظر انداز کر کے مڑتا، اس کے سر پہ ٹھاہ سے ایک زوردار ضرب لگی۔ ضرب اتنی بھرپور تھی کہ وہ چکر کر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ اس نے سر کی پشت پر ہاتھ رکھا تو انگلیاں سرخ مائع سے چپ چپی ہو گئیں۔ وہ بے اختیار کراہا۔

اگلے ہی لمحے ایک کاری ضرب اس کے دائیں کندھے پر لگی۔ وہ بے ساختہ لڑکھڑا گیا، پھر بائیں کندھے پر پڑی، وہ بری طرح منہ کے بل فرش پر گر گیا۔ اِس نے فرش پہ بوٹوں میں لپٹے کچھ پیر دیکھے۔

چار..... چھ..... آٹھ یا شاید دس..... پھر وہ بوٹ اس کی طرف بڑھے۔ اسے ان نقاب پوش لڑکوں کے دھندلے دھندلے عکس نظر آ رہے تھے۔ اس نے ہتھیلیوں کے بل اٹھنا چاہا لیکن اس کا سر چکرا گیا تب ہی غنڈوں نے اسے ہاکی اور گالف کے ڈنڈوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔

وہ دونوں نیچے آ گئیں۔ غزارا چاروں اوور دیکھ رہی تھی، ساتھ ہی وہ شاجہاں کا نمبر بھی ملا رہی تھی۔ فون کان سے لگائے وہ ستون کے آگے پیچھے دیکھ رہی تھی، جب گھنٹیاں قریب سے کہیں سے سنائی دیں۔

''فون کی آواز آ رہی ہے۔'' زوبیا نے کہا۔ ''وہ اِدھر ہی ہیں۔''

''ہاں..... مجھے بھی آ رہی ہے۔''

''شاید اس طرف سے.....'' زوبیا نے بائیں طرف کی قطار کی سمت اشارہ کیا۔ وہ دونوں اس طرف گئیں۔ تب ہی انھوں نے ایک گاڑی کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ گاڑی

کے اندر لائٹیں بند تھیں۔ وہ اتنے زن سے دونوں کے پاس سے گزری کہ ہوا کا بھرپور جھونکا غزارا اور زوبیا کو چہرہ پر محسوس ہوا۔

''جاہل.....'' زوبیا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''تمیز ہی نہیں گاڑی چلانے کی۔''

''جانے دو۔ شاہجہاں کی فون کی گھنٹیاں قریب سے آرہی ہیں۔'' اس نے سر جھٹک کے کہا اور تیزی سے اُس سمت گئی۔ زوبیا اُس کے پیچھے لپکی۔ گاڑی کے بعد گاڑیوں میں جھانکتی، وہ جیسے عجیب وسوسے میں گر گئی۔

''فون بج رہا ہے لیکن اٹھا نہیں رہے۔'' وہ پریشانی سے بولی پھر اگلے ہی لمحے اسے کسی گاڑی کے نیچے سے خون نکلتا دکھائی دیا۔ وہ ٹھہر گئی۔

کالی زمین پر مدھم سی روشنی گر رہی تھی۔ وہیں پر خون کی چھوٹی سی دھار آرہی تھی۔ اب گھنٹیوں کی آواز اتنی قریب تھی کہ اس نے فون بند کر دیا۔ زوبیا بھی اس مائع کو دیکھ رہی تھی۔

وہ قدم قدم آگے آئی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جونہی گاڑی کے آگے سے نکلی، اس نے گاڑی کے اگلے ٹائر کے ساتھ شاہجہاں کو اوندھے منہ گرے دیکھا۔

وہ برق سے تیزی سے اُس کی طرف لپکی۔ ''شاہ..... او میرے اللہ..... شاہ.....'' اس نے بمشکل اُسے سیدھا کیا۔ شاہجہاں کی آنکھیں بند تھیں۔ خون کن پٹی اور کان کے اطراف سے نکل رہا تھا۔

''یا اللہ.....'' زوبیا نے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''شاہ..... اٹھو..... آنکھیں کھولو.....'' اس نے شاہجہاں کا چہرہ تھپکا جو خون سے لپا ہوا تھا۔ شاہجہاں بے ہوش تھا۔

''کوئی مدد کرو..... پلیز..... کوئی ہے۔'' وہ حواس باختہ انداز میں چلانے لگی۔ شاہجہاں کا

سر اُس کی گود میں تھا۔ ''زوبیا..... زوبیا..... کسی کو مدد کے لیے بلاؤ..... شاہ..... شاہ اٹھو۔'' وہ اس کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی۔

زوبیا بھاگ کر کہیں غائب ہوگئی۔

اس نے جلدی سے گردن سے مفلر والا دوپٹہ نکالا، اسے دو حصوں میں کاٹا اور شاہجہاں کے سر کے نیچے یوں دبایا کہ خون کا بہاؤ روک دیا۔ اگلے حصے کو اس نے گولا سا بنا کر شاہ جہاں کی کن پٹی پر رکھا اور نیچے سے دباؤ ڈالا تا کہ خون رسنا بند ہو۔

کچھ دیر بعد زوبیا دو آدمیوں کے ساتھ بھاگی بھاگی اس طرف آ رہی تھی جن کے پیچھے دو گارڈز بھی تھے۔ انھوں نے شاہجہاں کو یوں بے سدھ دیکھا تو سٹپٹا گئے۔ تیزی سے انھوں نے فرش پر گری شاہجہاں کی گاڑی کی چابی اٹھائی اور گاڑی کھول دی پھر شاہجہاں کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا جہاں غزارا دوسری طرف سے چڑھ کر بیٹھی تھی۔

دو آدمی، زوبیا اور غزارا اس کو ہسپتال لے کر گئے۔

☆.....☆.....☆

ہسپتال کی ٹھنڈی اور فینول سے دھلی راہداریوں میں وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ شاہجہاں ایمرجنسی وارڈ میں تھا جہاں ڈاکٹرز اُس کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ زوبیا دیوار سے جڑی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھی جب کہ دو آدمی، ایک وارڈ کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ دوسرا دور، کسی کو فون ملا رہا تھا۔

وہ ٹہلتے ہوئے اللہ سے گریہ وزاری کر رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو متواتر رواں تھے۔ اس کی شرٹ بھی سرخ ہوگئی تھی۔ گردن، ہاتھ، بازوؤں پر شاہجہاں کا خون لگا تھا۔ زوبیا پیر جھلاتے ہوئے بے چینی سے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

کچھ دیر گزری تھی کہ ماموں، ممانی، شاہ عالم اور اس کے کتنے ہی رشتہ دار وہاں پہنچ گئے۔ وہ دو آدمی، شاہجہاں کے ساتھ کچھ دیر پہلے بزنس ڈیل کر کے گئے تھے۔ شاہ جہاں معذرت کر کے پہلے نکل آیا تھا کیوں کہ اُس نے غزارا کے ساتھ اُس کی ماں کی قبر پہ جانا تھا جب کہ دو آدمی بعد میں آئے جنھیں قریباً لفٹ سے ہی زوبیا نے پکڑ لیا تھا۔

اس وقت راہداری میں سراسیمگی کا ماحول تھا۔ بڑے ماموں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ انھوں نے چھوٹے ماموں اور شاہ عالم کے ساتھ عمران (حمنہ کا بڑا بھائی) کو پولیس سٹیشن بھیجا تھا، رپورٹ لکھوانے۔ بیسمنٹ کے جائے وقوعہ کو گھات میں لے لیا گیا تھا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج کا اس وقت جائزہ لیا جا رہا تھا۔ یہ صرف ایک حملہ نہیں تھا۔ جان لیوہ حملہ تھا۔ بڑے ماموں کا خون انتقام سے کھول رہا تھا۔ طاہرہ بیگم انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ انھوں نے غزارا کو کئی بار جھنجھوڑا۔

''بتاؤ کس نے کیا ہے۔ تم وہاں تھیں۔ کون تھے بتاؤ۔''

غزارا اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ کچھ کہہ سکے۔ وہ بس روئے جا رہی تھی۔ جب کئی بار ہلانے پر بھی وہ کچھ نہ بولی تو طاہرہ بیگم نے چھوڑ دیا اور سر پکڑ کر زار زار رونے لگیں۔

☆.....☆.....☆

وہ پاگلوں کی طرح راہداری میں چل رہی تھی۔ اس کی باریک ہیل سے نچلی منزل لرز رہی تھی۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی جب اِس نے ایک فلیٹ کا دروازہ بجایا۔ کچھ دیر وہ رُکی مگر انتظار مشکل تھا۔ اس نے دوبارہ دھڑ دھڑایا، دروازہ چوکھٹ پر لرز گیا۔

''کون ہے۔ دروازہ توڑنا ہے کیا.....'' اندر سے آواز آئی پھر اگلے ہی پل دروازہ کھل گیا۔ سامنے حمنہ کھڑی تھی، سرخ رنگ لیے، تیز ابی آنکھوں سے دیکھتی۔

''تم؟'' حامد چونکا۔

سرعت سے اُس نے حامد کو سینے پر دھکا دیا اور اندر آ گئی۔ تندہی سے اُس نے دروازہ لاک کر دیا۔ جب وہ مڑی، حامد اسے اچنبھے سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا کیا تم نے؟ تم ہوش میں ہو احمق آدمی؟'' وہ غصے سے اس کے سینے پر دھمو کے مارتے ہوئے آگے بڑھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ پیچھے ہٹتا گیا۔

''تم نے شاہ جہاں پر حملہ کروا دیا۔ کیا اس طرح سے تم اس کو ہینڈل کرو گے؟''

''ہاں تو اور کیسے کرتا۔ انسانوں کی طرح تو وہ طلاق دے نہیں رہا تھا۔'' ہٹتے ہٹتے وہ کچن کی سلیب سے جا لگا۔

''تم جانتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟ اگر اسے پتا چلا کہ یہ تم نے کیا ہے۔ وہ تمہاری بوٹیاں بنا کر چیل کوؤں کو کھلا دے گا۔ آخر تمہیں کس بے وقوف نے مشورہ دیا تھا یہ سب کرنے کے لیے۔''

''دیکھو حمنہ ہم اسے پیار سے بہت سمجھا چکے تھے۔ ایک یہی طریقہ.....''

''شٹ اپ.....'' وہ بے اختیار چلائی۔ ''جسٹ.....شٹ.....اپ.....''

وہ گردن ڈال کر خاموش ہو گیا۔ حمنہ ہتھیلیاں کھولے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف تھا۔ شدید خوف۔ حامد نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھا جسے اُس نے تیزی سے جھٹک دیا۔

''مت چھوؤ مجھے۔ تم نے جو کیا ہے، اس کا انجام میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' اس نے وحشت بھری نظروں سے حامد کو دیکھا جو پرسکون سا کھڑا تھا۔ ''شاہجہاں تمہارے ساتھ کیا

کرے گا حامد۔ یا اللہ، وہ تو تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔"

"بس کرو۔ میں نہیں ڈرتا اُس سے۔" اس نے چہرے سے مکھی جھٹکی۔

"ڈرو اس سے..... شاہجہاں سے ڈرو حامد۔ میں نے دس سال اُس کی دسترس میں گزارے ہیں۔ میں جانتی ہوں، وہ کتنا خوفناک غصہ رکھتا ہے۔" کہتے ہی اُس کی آنکھیں چکرا گئیں۔ "وہ..... وہ غصہ نہیں کرتا لیکن جب کرتا ہے تو پوری حویلی لرز جاتی ہے۔ تم اُس کو قابو نہیں کر سکو گے۔ کبھی نہیں۔"

"کم آن۔ چار غنڈوں کو تو وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ چپ چاپ پٹ گیا۔ مجھے کہے گا۔" حامد نے طنز سے ہنکار بھرا۔

حمنہ اشتعال سے اُس کی طرف مڑی۔

"تمہیں میری بات سمجھ نہیں آ رہی؟ غلط انسان سے پنگا لیا ہے تم نے۔ کتنی بار کہوں۔ اب میری بات غور سے سنو۔ تم ابروڈ جا رہے ہو۔ کچھ دنوں کے لیے۔ آج، بلکہ ابھی نکل جاؤ۔ اسی وقت۔"

"کیا بکواس ہے؟ میں کہیں نہیں جا رہا۔" وہ بے زار ہوا۔

"بکواس بند کرو۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں۔ ویسا ہی کرو۔ ابھی اسی وقت جاؤ ائیر پورٹ۔ جس بھی ملک کا ٹکٹ ملے۔ خریدو اور دفع ہو جاؤ۔" دھکا دیتے دیتے وہ اسے ڈریسنگ روم تک لے آئی اور خود ہی اس کا بیگ نکالا پھر جلدی جلدی ہینگر میں لٹکی شرٹس ہینگر نکالے بغیر بیگ میں ڈالنے لگی۔

"کم آن....." وہ بے زاری سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"بات کو سمجھو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ تمہیں براہِ

راست نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ باقی جو ہوگا، وہ میں دیکھ لوں گی۔"

وہ ڈریسنگ ٹیبل سے بغیر دیکھے چیزیں اٹھا اٹھا کر بیگ میں ڈال رہی تھی۔ پھر اس نے ریک سے جوگرز نکالے، اسی طرح بیگ میں پھینکے۔ زپ چڑھائی اور بیگ سیدھا کھڑا کر دیا۔

"یہ لو..... اپنا پاسپورٹ لو اور جاؤ....."

"کتنی عجیب بات ہے۔ تم اپنے بوائے فرینڈ کو چھپا رہی ہو۔" وہ محظوظ سا ہنس پڑا۔

"گدھے۔ میں تمہیں بچا رہی ہوں۔" وہ حواس باختہ انداز میں چلائی۔

حامد بری طرح بدمزہ ہوا۔ اس نے چپ چاپ بیگ کا ہینڈل پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے گیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اس نے پاسپورٹ نکالا، کچھ رقم پکڑی اور بازو پہ کوٹ ڈالتے ہوئے باہر آ گیا۔ حمنہ اس کے ساتھ تھی۔ دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے، اس نے پلٹ کر حمنہ کو دیکھا۔

"صرف چار دن۔ پھر میں واپس آ جاؤں گا۔" اس نے جیسے چتاؤنی دی۔

"جب تک سب ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ تم نہیں آؤ گے۔ میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گی کب آنا ہے۔ فی الوقت تم جاؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے، نکل جاؤ۔"

"اگر مجھے کوئی فلائٹ نہ ملی تو؟"

"تو میرے باپ کسی دوسرے شہر چلے جانا۔ کراچی، کوئٹہ، گوادر کہیں دور چلے جانا۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"دیکھو لو، دور کر رہی ہو خود سے۔" اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔

حمنہ نے کھینچ کر اسے جھاپڑ مارا۔ "تمہیں رومینس سوجھ رہا ہے؟ اس وقت تمہاری زندگی

اور ہمارا رشتہ داؤ پر ہے۔"

یکدم وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "اچھا ناں۔ جا رہا ہوں۔ تم بس اپنا خیال رکھنا اور اگر وہ تمہیں کچھ کہے تو....."

"میں سنبھال لوں گی میرے بہادر سرتاج۔ میری فکر مت کرو۔" وہ ڈرامائی انداز میں بولی۔

"اووو کے۔ بائے۔" اس نے بدمزگی سے کہا اور بیگ گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ تب تک اُس کے گھر میں ٹھہری رہی جب تک اس نے جہاز سے تصویر نہیں بھیجی۔ وہ اس وقت ترکی جا رہا تھا۔ وہی فلائٹ میسر تھی جس میں اسے بمشکل اکانومی سیٹ ملی تھی۔

اس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ اُسے باہر بھیج کر، اب وہ شاہجہاں کے پاس تیمارداری کے لیے جا سکتی تھی، لیکن آج نہیں۔ کچھ دن بعد۔ اس نے جیسے سوچا۔

☆.....☆.....☆

شاہجہاں کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ سر کے پچھلے حصے کی ضرب کاری تھی جس کے ٹانکے لگا دیے گئے تھے۔ اندرونی چوٹ، فریکچر اور کسی ہڈی پسلی کے نقصان سے وہ بچ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے شام تک ہسپتال رکھا پھر ڈسچارج کر دیا۔

اس وقت اپنے کمرے میں کراؤن سے ٹیک لگائے لیٹا تھا۔ کمبل سینے تک کھینچ رکھا تھا۔ ماتھے پر پٹی تھی اور ہونٹ کے کنارے خون جما تھا۔ گردن سے پٹی میں ایک بازو لٹک رہا تھا جس پر ہاکی کی ضرب لگی تھی۔

طاہرہ بیگم اُس کے ساتھ بیٹھی ممتا کی تڑپ سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ جب کہ بڑے ماموں صوفے پر بیٹھے بار بار مٹھیاں مروڑ رہے تھے۔ اُن کے جبڑے سختی سے پیوست تھے۔ غزالہ شاہجہاں کے ساتھ پائنتی پر بیٹھی تھی جب سے رو رہی تھی۔ خاموش کمرے میں اُس کی

دبی دبی سسکی اُبھرتی تو وہ گال پونچھ کر، ناک رگڑ لیتی۔ سب شاہ عالم اور عمران کا انتظار کر رہے تھے جو پولیس جاسوس کے ساتھ آنے والے تھے۔

''بس کرو پرنسز۔ میں ٹھیک ہوں۔'' شاہجہاں جب سے اسے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ طاہرہ بیگم نے ناگواری سے اس لڑکی کو دیکھا جو ان کے بیٹے کا ماتم کر رہی تھی۔

''مجھے لگا، میں نے آپ کو کھو دیا ہے۔ اتنا خون بہہ رہا تھا کہ.....'' اس نے ہچکی لی۔

''کم آن۔ اتنا خون تو ہر تین مہینے ڈونیٹ کرتا ہوں میں۔'' وہ تھکان سے مسکرایا۔ حالانکہ پورے جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جوڑ جوڑ چیخ رہا تھا۔ اس نے پلکیں موند لیں اور سر طاہرہ بیگم کے شانے پر رکھ دیا جسے انھوں نے فوراً سہلانا شروع کر دیا۔ اسی لمحے بڑے ماموں کی نظر غزارا کے کپڑوں پر پڑی۔

''تم جاؤ۔ جا کے کپڑے بدل لو۔ ابھی تک خون لگا ہے۔ مجھ دیکھ کے وحشت ہو رہی ہے۔'' وہ رُخ پھیر کر کراہت سے بولے۔ شاہ جہاں اب گہرے تھکے ہوئے سانس لے رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد شاہ عالم اور عمران آ گئے۔ اُن کے ساتھ پولیس کی وردی میں ایک آفسر تھا۔ انھوں نے بڑے ماموں کو لاؤنج میں بلا لیا۔ وہ آئے تو پولیس آفسر کھڑے ہو گئے۔ آہستہ سے مصافحہ کیا، پھر وہ سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ ان کی دوسری طرف درمیانے ماموں بھی تھے۔

''سر۔ ہم نے سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھی ہے۔ آلٹو گاڑی میں چار لوگ آئے تھے۔ ان کے چہرے تو نقاب میں ہیں، لیکن ہم نے گاڑی کا نمبر ٹریس کر لیا ہے مگر.....'' آفسر بیان دیتے دیتے رُکا۔

''مگر کیا آفیسر؟'' بڑے ماموں رعب سے بولے۔

''گاڑی شاہراہ کے کنارے جنگل میں ملی، گاڑی خالی تھی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔''

''تو اُنھیں ڈھونڈو۔ جتنا جلدی ہو باہر نکالو۔'' وہ غرائے۔

''ہم کوشش کر رہے ہیں۔ جنگل میں سپاہی کھوجی کتوں کے ساتھ بھیج دیے ہیں۔ وہ جلد ہی تحویل میں ہوں گے۔'' آفیسر نے کہا۔ بڑے ماموں کے چہرے کی جھریاں بڑھنے لگیں۔ مٹھیاں اسی طرح مڑ رہی تھیں۔

''جس نے بھی کیا ہے۔ میں چھوڑوں گا نہیں۔'' وہ وحشت ناک لہجے میں بولے تھے۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن صبح عفت اور عرفان صاحب بھی پہنچ گئے تھے۔ عرفان صاحب بڑے بھائی سے آنکھیں چرا رہے تھے لیکن عفت دکھیاری بہن کی طرح طاہرہ کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ اس وقت شاہجہاں لاؤنج میں صوفے پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ غزارا اُس کے پہلو میں براجمان تھی۔ عفت اور عرفان صاحب کو آتا دیکھ کے وہ اٹھ کر سائیڈ پہ ہو گئی تھی۔

''کیسے ہو بیٹا۔ ٹھیک ہو۔'' عرفان صاحب نے واجبی ہمدردی سے اُسے گلے لگایا۔

''کیا میں یقین کر سکتا ہوں کہ یہ آپ نے نہیں کرایا؟'' شاہجہاں نے اُن کے کان میں سرگوشی کی جس پر وہ تیزی سے پیچھے ہوئے۔

''میں ایسا کیوں کروں گا؟'' وہ بے یقینی سے بولے۔

عفت کی دھاڑیں لاؤنج میں پھیلی ہوئی تھیں۔ طاہرہ بمشکل اُسے بہلا پا رہی تھیں۔ کرن اور روشنا ایک دوسرے کو بے زاری سے دیکھ رہی تھیں۔

''میں نے آپ کی بیٹی کا ریپ کیا تھا۔'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

عرفان صاحب کا چہرہ یکدم سرخ پڑ گیا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے۔ تمہاری ہڈی پسلی توڑنی ہوتی تو دس سال پہلے توڑتا۔''

''خیر وہ تب بھی آپ نہیں توڑ سکتے تھے۔'' وہ تپانے والی مسکراہٹ سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

عرفان صاحب کلس کر رہ گئے۔ اسی لمحے عفت کسی اُڑتے ہوئے کمبل کی طرح اُس پر آن گری۔

''میرا بچہ..... میرا شہزادہ..... کس نے کیا یہ سب؟ اللہ اللہ، کتنا زخمی کر دیا میرے بچے کو۔ اللہ غارت کرے۔ تباہ کرے۔ دنیا کا سکھ نہ دے اُس کو۔'' وہ دھاڑیں مار کر کہہ رہی تھیں۔

اُن کے ہاتھوں سے شاہجہاں بمشکل اپنا آپ بچا رہا تھا۔

دور کھڑی غزارا عجیب نظروں سے اپنی اُس ممانی کو دیکھ رہی تھی جن کو وہ پندرہ سال بعد پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ کتنی بدل گئی تھیں۔ جسم سکڑ گیا تھا اور ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ اور ماموں۔ انھوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ جسم بھی توانا ہو گیا تھا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ کوئی ہڈی تو نہیں ٹوٹی؟'' عفت ناک سعال کر بولیں۔

''نہیں، بالکل نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔'' شاہجہاں نے ذرا سا کھسک کر کہا۔ وہ پوری اس کے بازو پہ آن لیٹی تھیں۔

''ایک بھی ہڈی نہیں ٹوٹی۔'' عفت نے غیر اختیاری طور پر پوچھا۔

''آپ کیا چاہتی تھیں، ایک آدھ ٹوٹتی؟'' غزارا نے تیزی سے کہا جس پر انھوں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ماموں کی نگاہ بھی اٹھی۔ وہ قدم قدم چل کر شاہجہاں کی پشت پر صوفے کے عقب میں کھڑی ہوئی۔

''بتائیں۔آپ چاہتی تھیں،ان کی ہڈی ٹوٹ جائے؟''

''چپ کرو غزارا۔وہ صرف شکر ادا کر رہی ہیں کہ ایک بھی ہڈی نہیں ٹوٹی۔'' طاہرہ بیگم نے ٹوک کے کہا۔

''لگ تو نہیں رہا ممانی۔''

''تو یہ ہے ثمن شاہ کی بیٹی۔'' وہ کسی خوابیدہ کیفیت میں صوفے سے اٹھیں۔

غزارا گردن کڑا کے مسکرائی۔''ہاں۔میں ہی ہوں غزارا شاہجہاں،کوریہ میں یانگ شی ہی.....''

عفت نے سرتاپیر اس لڑکی کو دیکھا جو گہرے نیلے رنگ کی شرٹ اور سفید پینٹ میں ملبوس تھی۔بال کھلے تھے جو کندھوں تک آرہے تھے۔آنکھوں میں عجیب سی بے باکی اور دلیری تھی۔وہ اندر سے چونکی،ایک ایسی چونک کہ ایک نظر انھوں نے شاہجہاں کو دیکھا،پھر پیچھے کھڑی اس لڑکی کو۔انھیں کچھ محسوس ہوا۔کچھ مکمل نامکمل سا احساس۔مستقبل کی عجیب سی للکار۔یکدم ان کا سانس گھٹنے لگا۔

''بڑوں کو سلام کرتے ہیں۔لگتا ہے کوریہ جا کے سب بھول گئی ہو۔'' عرفان ماموں نے اپنی جھنجھلاہٹ نکالی۔

''آن یانگ ہسے یو کیون سن چونم.....'' وہ مسکرا کے بولتی ذرا سی جھکی پھر سیدھ ہوگئی۔

شاہجہاں زیرلب مسکرایا لیکن عفت اور عرفان کو وہ لڑکی،ایک نظر اچھی نہیں لگی۔

ساری تیمارداری میں وہ کن اکھیوں سے اُس لڑکی کو دیکھتے رہے جو شاہجہاں کے پہلو میں بیٹھی جانے کیا کھسر پسر کر رہی تھی۔دوبار طاہرہ بیگم نے اسے بہانے بہانے سے اندر بھی بھیجنا چاہا لیکن اُس کے ساتھ شاہجہاں بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ان کو ذرا اچھا نہیں لگا تھا۔جب وہ

چھوٹی تھی جب یہ سب اُنھیں بچپنا لگتا تھا لیکن اب وہ جیسے خوفزدہ ہو رہے تھے۔ حمنہ کے گھر کا سوال تھا تو کیا اُس کا گھر..... دل میں ہوک اٹھی۔

رات جب وہ ڈنر کر کے لوٹ رہے تھے تو گاڑی میں عجیب خاموشی تھی۔ ڈرائیور مستعدی سے گاڑی بھگا رہا تھا جب کہ وہ دونوں شیشے کے پار دیکھ رہے تھے۔ یہ خاموشی ایسی تھی جیسے دونوں فریقین جانتے ہوں کہ دونوں ہی ایک چیز سوچ رہے ہیں۔ گھر آنے تک یہ سناٹا جاری تھا۔ جیسے ہی وہ پہنچے، مرکزی دروازے کے پاس ہی انھیں حمنہ ٹہلتی ہوئی ملی۔ وہ یقیناً ان دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ بیٹی کو دیکھ کے وہ جیسے ٹھہر گئے۔

''کیا ہوا۔ شاہ کیسا ہے؟ ٹھیک ہے ناں؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' وہ فوراً سے لپکی۔

''تم نے غزالا کو دیکھا ہے؟'' عفت نے سرد لہجے میں پوچھا۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی لگتی تھیں۔

''نہیں..... نہیں تو..... کیا ہوا؟''

''دیکھ لو..... شاید تم دوبارہ اپنا گھر بسانا چاہو۔'' انھوں نے خشک انداز میں کہا اور اس پر ایک سرد نظر ڈالتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ عرفان پہلے ہی جا چکے تھے۔ وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

''اب اس کا کیا مطلب ہے؟ میں کیوں دیکھوں اُسے؟'' وہ جیسے چڑ گئی تھی لیکن ساتھ ہی چونک گئی تھی۔ دل عجیب سے وسوسے کا شکار ہو گیا۔ وہ کچھ دیر جز بز کھڑی رہی پھر وہ زید کے کمرے میں چلی گئی کہ ابھی وہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ یہ ضروری تھا کہ بچہ قابو میں رہے۔

اس نے زید کو شاہجہاں کے حملے سے متعلق نہیں بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باپ کے زخمی ہونے کا سُن کر وہ حویلی چلا جائے۔ حامد کی غیر موجودگی میں وہ زید کے ساتھ رہنا چاہتی

تھی تا کہ اُس کا بھروسہ جیت سکے۔ آگے چل کر زید ہی مہرہ بن کر اُس کی رشتے کی بساط پر کھیلنے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ تین دن سے ریکارڈنگ کے لیے نہیں جا رہی تھی۔ وہ شاہجہاں کے ساتھ quality time گزار رہی تھی۔ وہ پوری طرح اُس کا خیال رکھ رہی تھی، اس کو باقاعدگی سے ہسپتال لے کر جاتی، مرہم پٹی کرتی، اس کو دوا دیتی اور اس کے لیے کھانا بناتی، پورا دن اُس کے پاس ہوتی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی، کوریہ کے قصیدے ملاتی یا پھر بچپن کے کسی قصے کو لے کر اپنا ماضی یاد کرتی۔

گو کہ طاہرہ بیگم کو یہ سب ایک آنکھ اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن وہ کسی بھی طور پر غزارا کو منع نہیں کر پا رہی تھیں کیوں کہ شاہجہاں کی شہ پر ہی تو وہ ایسا کر رہی تھی اور شاہجہاں سے وہ فی الحال نہیں لڑ سکتی تھیں۔

آج بھی وہ کچن میں گھسی ہوئی تھی۔ سلیب کے پیچھے کھڑی، کٹنگ بورڈ پر تیز تیز سبزیاں کاٹ رہی تھی۔ اس نے پوری مرغی کُکر پر چڑھا رکھی تھی جس کی سیٹی کی چک چک کچن میں گونج رہی تھی اور گوٹی سے نکلنے والی بھاپ سے یخنی کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔

وہ آج شاہجہاں کے لیے ایک خاص قسم کا کورین سوپ بنا رہی تھی جو بقول اُس کے کوریہ میں صرف بیمار لوگ پیتے ہیں۔ گلابی شرٹ اور گلابی ہی پینٹ پہ اُس نے سیاہ ایپرن باندھا ہوا تھا۔ بال پونی میں بند تھے تاہم پھر بھی دو باغی لٹیں ماتھے پر پھسل رہی تھیں۔

شاہجہاں اس کے ساتھ ہی تھا۔ سفید آدھی آستین والی ٹی شرٹ میں ملبوس، وہ سلیب کے سامنے موجود میز پر بیٹھا، پھلیاں چھیل رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ہلکی سی سوزش برقرار تھی تاہم

ڈاکٹر کے مشورے پر وہ ہاتھ اور بازو کو وقتاً فوقتاً حرکت دیتا رہتا تھا تاکہ مسل میں گرمائش اور جنبش جاری رہ سکے۔

کچن خالی تھا۔ خانساماں اور باورچی ابھی نہیں آئے تھے تاہم صدف کچن کے اسٹور میں گھس کر جانے کیا نکال رہی تھی جس کی ہلکی ہلکی ٹھک ٹھوں کی آواز آ رہی تھی۔

''کتنی بری بات ہے۔ میرا ہاتھ زخمی ہے پھر بھی تم مجھ سے کام کروا رہی ہو۔'' شاہجہاں نے مصنوعی خفگی سے کہا اور انگوٹھے سے پھلی کو دبا کر دانے باہر نکالے۔ اس نے ایک نگاہ اٹھائی۔

''فکر کی کوئی بات نہیں، سوائے طاہرہ مامی کے گھر میں موجود کسی کو برا نہیں لگے گا۔''

''وہ ماں ہے ناں۔ بچے کا درد سمجھتی ہے۔''

''ہاں۔ صرف اپنے بچے کا۔'' سرد آہ بھرتے ہوئے وہ جھکی، ککر کے نیچے چولہا بند کر دیا۔

شاہجہاں نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

''ایک بات بتائیں؟'' اس نے سیدھے ہو کر شاہجہاں کو دیکھا۔

''پوچھو؟''

''طاہرہ مامی کو مجھ سے کیا مسئلہ ہے؟ جب بھی اُن کو دیکھو، مجھے گھورتی رہتی ہیں۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں، لیکن کہہ نہ پا رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں، کسی بات سے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ ماما گھر کی بڑی ہیں۔ ان پر ایک ذمہ داری ہے، شاید اس لیے وہ سب پر نگاہ رکھتی ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔ کہاں جا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔'' شاہجہاں نے رسان سے کہا جس پر وہ کچھ جز بز ہوئی۔

''یعنی وہ مجھ سے پریشان نہیں ہیں؟''

''وہ کیوں ہوں گی؟ تم ایسی باتیں مت سوچا کرو۔'' اس نے ہلکا سا ڈپٹا جس پر وہ کچھ

خاص قائل نہیں ہوئی لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان باتوں پر کڑھتی رہتی۔ اس نے شانے جھٹک دیے۔

مرغی پک چکی تھی۔ اِس نے پلاسٹک کے دستانے پہنے پھر بڑے سے پیالے میں ثابت مرغی نکال کر رکھی۔ شاہجہاں اس کی طرف رُخ کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ مرغی کو درمیان میں رکھنے کے بعد اس نے ٹکر میں سے یخنی نکالی اور مرغی والے پیالے میں ڈالتی گئی یہاں تک کہ مرغی پانی میں ڈوب گئی۔

پھر اِس نے seasoning کے لیے کالی مرچ، دھنیا پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر اور کچھ فلیکس چھڑکے۔ بعدازاں کاٹی ہوئی سبزیاں جن میں ہری پیاز، ادرک اور لہسن کے باریک جوے تھے اوپر ڈال دیا۔ دستانے اُتار کے اس نے چمچ لے کر چکھا تو اسے سب کچھ مناسب لگا۔ وہ وہی پیالا اٹھا کر شاہجہاں کے پاس آئی اور شیف کی طرح ہلکا سا جھک کر serve کر دیا۔

''ٹن ٹنا..... پی جیے samgyetang.....'' اس نے پرجوش سی تالیاں بجائیں۔

شاہجہاں نے جھک کر اس پیالے کو دیکھا جس میں ثابت مرغی پڑی ہوئی تھی اور اُس کا گوشت اس حد تک گھل چکا تھا کہ ریشے الگ ہو رہے تھے۔ وہ یقیناً پاکستانی یخنی تھی۔

''چکھیے اور بتایئے کہ شیف یانگ شی ہی نے کیسا سوپ بنایا ہے؟''

شاہ جہاں نے مسکرا کے چمچ میں تھوڑا سی یخنی لی اور سرکی لیتے ہوئے پی۔ ذائقہ قریباً یخنی جیسا تھا لیکن اِس میں ایک عجیب سا فلیور آ رہا تھا۔ شاید چینی جنسنگ (Dong quai) کا ذائقہ تھا یا پھر جوجوبی (سرخ کھجور) کا ذائقہ تھا جو وہ ریستوران کے لیے منگوائے جانے والے مصالحوں میں منگوالائی تھی۔ وہ جو بھی چیز تھی، ذائقہ تھوڑا ہٹ کے تھا۔

''کیسا ہے؟'' وہ تبصرے کے لیے اوتاؤلی ہو رہی تھی۔

شاہجہاں نے اُسے چھیڑنے کے لیے بدمزہ سا چہرہ بنایا۔ ''اچھا ہے لیکن.....''

''لیکن؟'' وہ بے چین ہوئی۔

''لیکن یہ کہ.....تھوڑا.....تھوڑا تیکھا ہے۔'' اس نے جان بوجھ کر سسکی لی۔

''تیکھا ہے؟'' غزارا نے ابرو اٹھائے۔

''ہاں.....'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''ابھی ختم ہو جائے گا۔'' اسی لمحے غزارا نے ہتھیلی اس کی کرسی کی پشت پر رکھی اور اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' شاہجہاں گڑبڑایا۔

''دیکھ رہی ہوں۔ کتنی مرچیں لگ رہی ہیں آپ کو؟''

وہ یکدم سرخ ہو گیا۔ ''پیچھے ہو جاؤ۔''

''کیوں کیوں کیوں؟'' وہ شرارت سے اُس پر آن جھکی مگر اس سے قبلکہ وہ کچھ کرتی، اس کی نظر دروازے میں ایستادہ صدف پر پڑی جو چکرائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک وسط سائز کا ڈول تھا جس میں کناروں تک چاول بھرا ہوا تھا۔ وہ یوں غزارا کو دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

''کیا ہوا صدف؟ وہاں کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ۔'' وہ پرسکون انداز میں بولی۔

شاہجہاں نے تیزی سے پلٹ کر چوکھٹ کو دیکھا، پھر غزارا کو ہلکا سا پرے کیا اور گلا کھنکھارتا ہوا سوپ پہ جھک گیا۔

صدف بے جان مجسمے کی طرح قدم قدم چلی آئی اور ڈول سلیب پر رکھ دیا، پھر وہ اسی طرح روح کی طرح چال چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ شاہجہاں نے کن اکھیوں سے اسے نکلتے

دیکھا اور سکون کا سانس لیا۔

''میں آتی ہوں۔'' غزارا اٹھ کے صدف کے پیچھے آئی۔ وہ اسٹور روم میں تھی، دوسرے ڈول میں چاول ماپ کے نکال رہی تھی۔ اسٹور میں جگہ جگہ اناج کی پیٹیاں ایستادہ تھیں جس کی وجہ سے کسی کریانے کی دکان ایسی بساند پھیلی ہوئی تھی۔

''لاحول والہ قوۃ..... لاحول والہ قوۃ..... لاحول والہ قوۃ.....'' صدف منہ ہی منہ بڑبڑا رہی تھی جب غزارا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اسپرنگ سے اُچھلی یوں کہ پیمانہ بے ساختہ چاول کی پیٹی میں گر گیا۔

''کیا ہوا؟ کوئی بھوت دیکھ لیا کیا؟'' اس نے بھولے پن سے پوچھا۔

''بھوت تو نہیں میڈم لیکن کچھ ''غلط'' ضرور دیکھ لیا ہے۔'' صدف نیم ڈرے انداز میں بولی۔

''اچھا..... مثلاً کیا؟''

''آپ شاہ صاحب کو۔'' اس نے اشارہ سا کیا۔

''میں شاہ صاحب کو کیا؟''

''ان کو..... ان کو چومنے والی تھیں۔ بڑی میڈم کو پتا چلا تو وہ بہت خفا ہوں گی۔''

غزارا ہنس پڑی۔ پاکستان کا یہ طبقہ کتنا معصوم تھا۔ صدف پیشانی پر بل ڈالے دیکھ رہی تھی جب اُس کی ہنسی تھمی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بڑی میڈم ناراض ہوں گی۔''

''مگر میں پیار کرتی ہوں شاہجہاں سے.....'' اس نے صدف کو چھیڑا۔

''پیار میں بھی حد دیکھی جاتی ہے۔ آپ کیسے ایک..... ایک شا.....'' وہ کہتے کہتے تیزی

سے رُکی۔ فوراً منہ پر ہاتھ رکھا۔ غزارا اس کو یوں بات ادھورا چھوڑ کر حیرانی سے دیکھنے لگی۔

''کیسے ایک شاہ..... شاہ کو چوم رہی ہوں؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' وہ خوفزدہ انداز میں کہتی واپس چاول ماپنے لگ گئی۔ غزارا نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ ہلکے ہلکے کانپ رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا اس کی جھکی ہوئی پیٹھ سہلائی جیسے قربانی کا جانور سہلاتے ہیں۔

''پریشان نہ ہو۔ تم نے جو دیکھا، اس کی عادت ہو جائے گی۔'' آگ لگاتی انداز میں کہتی وہ اس پر ایک خیر خواہی بھری نظر ڈال کے وہاں سے نکل گئی۔

صدف پھر سے استغفار پڑھنے لگی۔

شاہجہاں کے پاس واپس بیٹھی تو وہ گوشت کے ریشے جدا کر رہا تھا۔

''کیسے کیسے لوگ ہیں۔ انھوں نے کسی کو پیار کرتا نہیں دیکھا کیا۔''

شاہجہاں ہنس دیا۔ ''اب تم بڑی ہو چکی ہو یانگ شی اور مت بھولو پاکستان میں ہو تم۔''

غزارا نے بدمزہ سا منہ بنایا۔ ''بوڑھی عورت نے کہا تھا کہ محبت کی اولین شرط ہی یہی ہے کہ محبوب کو سرتاپا چوما جائے۔''

''استغفراللہ.....'' شاجہاں نے نگاہ چرائی۔ ''کس سے تعلیم لے کر آئی ہو تم؟''

''محبت کی تعلیم یہ (دل پہ ہاتھ رکھا) دیتا ہے، اُس کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''اگر یہ (دل) تمہارا اُستاد ہے تو میرا یقین کرو، اس کی ڈگری جعلی ہے۔''

غزارا نے بری بری نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''ہاں۔ آپ کے سینے میں یہ ہے جو نہیں، وہاں تو پتھر نصب ہے۔''

وہ زیرِ لب مسکرا دیا۔

''لیکن کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اسے موم کر دوں گی۔ محبت پتھر کو موم کر دیتی ہے۔''

''آگ بھی کر دیتی ہے۔'' وہ لاشعوری طور پر بولا پھر اپنی ہی بات پر جیسے ٹھہر سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ غزارا نے چونک کر اُسے دیکھا لیکن وہ فوراً ہی مسکرا دیا اور لمحے بھر کا اثر ضائع کر دیا۔

''مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔'' کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولی۔

''کیا؟'' اس نے سوپ کی سرکی لی۔

''یانگ منی نے اپا کے لیے وکیل ہائیر کیا ہے۔ اب ہم اپا کا کیس عدالت میں لڑیں گے۔''

وہ چمکتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ شاہجہاں نے خوش دلی سے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اچھا قدم اٹھایا ہے اُس نے۔''

''جانتی ہوں۔ ہم نے سوچا تھا کہ ہرجانہ بھر دیں گے اور اپا کو رہا کرا لیں گے۔ یانگ منی کچھ دن پہلے اپا سے ملنے گئی تھی، ان کو بتایا کہ میں پیسے بجھوا رہی ہوں۔ جلد ہی سارا پیسا جمع ہو جائے گا کمپنی کے پاس اور اپا باہر آ جائیں گے لیکن اپا خوش نہیں ہوئے یہ سن کر۔''

''کیوں؟'' شاہجہاں نے چمچ رکھ دیا۔ وہ توجہ سے اُس کی بات سننا چاہتا تھا۔

''شاہ.....'' اس کی آواز افسردہ ہوئی تھی۔ ''اگر ہم اپا کو ہرجانے پر رہا کریں گے تو اُن کو صرف جیل سے آزادی ملے گی۔ وہ non guilty ثابت نہیں ہوں گے۔ ان پر جو الزام لگے ہیں، وہ صاف نہیں ہوں گے۔ انھوں نے یانگ منی سے کہا کہ اُن کو باعزت بریت چاہیے۔''

''تو کیا تم لوگ عدالت میں یہ کیس جیت جاؤ گے؟'' شاہجہاں نے پوچھا۔

''یانگ منی نے جو وکیل کیا ہے وہ کوریہ کا جانا مانا وکیل ہے۔ پچھلے کئی سال سے وہ لندن میں ہے۔ خال خال ہی وہ کوریہ آتا ہے۔ انھوں نے یقین دہانی کرائی ہے کہ اپا باعزت بری ہو جائیں گے۔''

''یہ تو پھر بہت اچھا ہے۔ اس طرح تم لوگوں کو ہرجانے کی رقم نہیں بھرنی پڑے گی۔''

''ہاں۔ مگر وکیل کے اور قانونی کاروائی کے پیسے تو دینے ہی پڑیں گے۔'' وہ اُداسی سے مسکرائی تھی۔

شاجہاں کچھ دیر چپ رہا۔ وہ میز کی سطح کو گھور رہی تھی جہاں اُس کا عکس نظر آ رہا تھا، روح میں عجیب سی تھکن تھی۔

''یانگ شی.....'' اس نے دھیرے سے مخاطب کیا جس پر اس نے ذرا سی نگاہ اٹھائی۔ ''تم مجھ پہ اعتبار کرو۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں کوریہ بھی جا سکتا ہوں، ہم دونوں.....''

''پلیز شاہ..... میں اپا کو اپنے پیسوں سے رہا کرانا چاہتی ہوں۔ کسی کا احسان لینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''لیکن مجھے برا لگتا ہے جب تمہیں کام کرتا دیکھتا ہوں۔ میں مرضی سے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''پلیز.....'' وہ سخت جھنجھلائی۔ ''کوریہ میں سترہ سے ستر تک سب ہی عمر کے لوگ کام کرتے ہیں۔ سب اپنی ذات کے لیے خود کفیل ہیں۔ وہاں کسی پر کام کے لحاظ سے ترس نہیں کھایا جاتا۔ میں تو پھر بھی بائیس سال کی ہوں۔''

''میں تم پر ترس نہیں کھا رہا میں صرف.....''

''آپ میری عزت نفس کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں اور کچھ نہیں۔'' وہ درشتی سے بات کاٹ

کے بولی۔

شاہجہاں کا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کے کھڑی ہوئی اور ایپرن کی ڈوریاں کھینچ لیں۔ ''میں ریستوران جا رہی ہوں۔ شام میں ملتے ہیں۔'' اس نے ایپرن سلیب پر ڈالا اور باہر نکل گئی۔

وہ کچھ لمحے یونہی بیٹھا رہا۔ دماغ میں غزارا چل رہی تھی۔ بار بار Guilt feeling آ رہی تھی۔ اس کے خاندان کی کسی لڑکی نے جاب نہیں کی تھی۔ اس کم عمری میں تو بالکل نہیں پھر وہ رئیس زادے تھے۔ ان کو کیسے گوارا ہو رہا تھا کہ اُن کے گھر کی لڑکی یوں کڑی مزدوری کرے۔

اس نے غزارا کو اپنے ہوتے ہوئے ایک انچ کی تکلیف نہیں پہنچنے دی تھی۔ جب وہ چھوٹی تھی، جب وہ زیادہ توجہ کے لائق تھی۔ تب اس نے اُس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ اب چیزوں کو اس کی مرضی کی رو میں بہنے دے رہا تھا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ ایک خوددار لڑکی تھی۔ اسے پیسے لینا برا لگ رہا تھا۔

نہیں۔ یہ ایسے نہیں چل سکتا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔

☆.....☆.....☆

اس کا نہ صرف موڈ خراب ہوا تھا بلکہ خود پہ غصہ بھی آ گیا تھا۔ اسے شاہجہاں کو بتانا ہی نہیں چاہیے تھا کہ وہ crisis میں ہے۔ لوگوں کے آگے اپنے زخموں کے اشتہار نہیں لگاتے، لوگ ہمدرد بننے سے پہلے ترازو اور ہتھوڑا لے کر منصف بن جاتے ہیں تاکہ اچھی طرح آپ کا محاسبہ کر سکیں۔ دنیا شاید اتنی تلخ ہو گئی ہے کہ کسی بھی خطے میں چلے جاؤ، لوگ زہر پھنکارتے مل ہی جاتے ہیں۔ لیکن وہ یہ سب شاہجہاں سے چھپا بھی نہیں سکتی تھی۔ آخر کب تک

چھپاتی؟ کچھ دن پھر اُس نے مصروفیات کی تاویل دینی ہی دینی تھی۔ اس لیے اُس نے سر جھٹک دیا اور ریکارڈنگ میں مشغول ہوگئی۔

کم از کم ایک برے خیال کو انسان کا روشن دن خراب کرنے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔

اس نے سوچا اور پوری ایمانداری و خلوص سے ریکارڈنگ کرائی۔ آج ڈرامے کی آخری قسط کی ریکارڈنگ ہونا تھی۔ آخری قسط کے اولین تین چار مناظر کے بعد ہیروئن بے ہوش ہوجاتی ہے اور پھر کبھی نہیں اٹھتی۔ اس لیے کردار کے خاموش ہوتے ہی، غزارا کے مکالمے بھی تمام ہوگئے۔ ابھی تک پوری گھنٹے کی قسط باقی تھی لیکن غزارا کا کام مکمل ہوگیا تھا۔

ریکارڈنگ کرا کے وہ سٹنگ روم میں اپنے بیگ میں چیزیں ڈال رہی تھی، جب ہی زوبیا نے کمرے کا دروازہ کھولا۔

''غزارا..... مبارک ہو، تمہارا کام مکمل ہوگیا۔'' وہ مسکرا کے کہتی قریب آئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سنہرا، سخت کاغذ سے بنا کارڈ تھا جس پر بیل بوٹے منقش تھے۔

''شکریہ..... اب سارا کام تمہارا ہے۔ تو اچھے سے نبھانا۔'' وہ بیگ کی زپ بند کر کے سیدھی ہوئی۔

''ضرور..... یہ لو، یہ بھائی کی شادی کا کارڈ ہے۔ تم نے ضرور آنا ہے۔'' اس نے کارڈ پیش کرتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔ غزارا کارڈ لیتے ہوئے خلوص سے مسکرائی۔

''ضرور آؤں گی۔ مجھے پاکستانی شادی دیکھنے کا بہت شوق ہے۔''

''تم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی ناں؟'' زوبیا نے اندازہ لگایا۔

''نہیں۔ کوریہ میں اسلامی شادیاں بھی سفید گاؤن اور سادے نکاح کے بعد ختم ہوجاتی ہیں۔''

''اوہ..... پھر تو تمہیں ضرور آنا چاہیے۔'' اس نے صلاح دی۔

''ان شاءاللہ.....'' وہ خلوص سے بولی۔

زوبیا سے کارڈ لینے کے بعد وہ سیدھا ریستوران آئی۔ گو کہ شاہجہاں حویلی میں تھا لیکن اِس کا کوئی موڈ نہیں ہو رہا تھا وہاں جانے کا۔ فی الوقت وہ اپنے ذہن کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔

ریستوران میں معمول کے مطابق اچھی بھیڑ تھی۔ فیملی ہال، پرسنل اسپیس، فرینڈز ڈائننگ اور مختلف مختص عرشوں میں اس وقت کوئی میز خالی نہیں تھی۔ ویٹرز مہمانوں کو آرڈرز سرو کرنے میں جٹے ہوئے تھے۔ ابھی نیم پاکستانی کے ساتھ دو اور شیف لگ گئے تھے جو کام کو تیزی اور نفاست سے نبٹا رہے تھے۔

وہ پچھلے دروازے سے جو کچن سے ملحق اسٹور روم میں کھلتا تھا۔ وہاں سے چلی آئی۔ کچن میں پاکستانی اور نیم پاکستانی چولہوں چوکھوں سے دور ایک لوہے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھے جانے کس موضوع پر بحث کر رہے تھے۔

''سلام.....'' اس نے اونچا سے کہا تو دونوں نے پلٹ کے اُسے دیکھا۔ وہ دروازے کے پاس جوتوں میں ''پلاسٹک'' کور ڈال رہی تھی جو ان سب کا خاصا تھی کہ کچن میں ایسے نفاست و احتیاط کام کرتے تھے جیسے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر۔ دونوں نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ کام کرتے دو شیف اور اُن کے ہیلپرز نے بھی ہاتھ ہلائے۔

اس نے دیوار سے پرس ٹانگا، اُدھر ہی پڑے اسٹینڈ سے ایپرن اور کیپ اٹھائی۔ چلتے چلتے پہنتی وہ اِن تک آئی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں درمیان میں پھلیوں کا ڈھیر رکھے، اپنے اپنے برتنوں میں دانے چُن رہے تھے۔

''کیسے ہو دونوں۔ بہت خوش نظر آرہے ہو۔'' اس نے مشکوک نظروں سے دونوں کو تاڑا۔

''دیز..... میڈم کے لیے بھی ایک برتن لے آؤ۔'' پاکستانی نے پلٹ کر ہیلپر سے کہا پھر وہ غزارا کی طرف مڑا۔

''خوشی کسی بات کی میڈم؟ خوشی کے لیے جینا ضروری ہے۔ ہم تو بس سانس لے رہے ہیں۔''

''ارے.....'' غزارا کو ہمدردی ہوئی۔ ''ایسے کیوں کہہ رہے ہیں پاکستانی صاحب؟''

''کیوں نہ کہوں؟'' اس نے ہاتھ گردن کی پشت پر رکھے اور چھت کو گھورنے لگا۔ ''زندگی پر اگر غور کروں تو مجھے کچھ ہی نہیں ملا اس سے۔ بچپن میں پڑھائی سے نفرت تھی تو سکول چھوڑ دیا۔ ابا باورچی تھے اور اماں باورچن۔ دونوں نے کھانا بنانے پہ لگا دیا۔ کھانا بنانا ہی سیکھتا رہا، کسی دوشیزہ کی طرح۔ کئی پاکستانی کھانے سیکھے۔ کانٹی نینٹل، چائنیز، تھائی، انڈین۔ ہر طرح کی کزین۔ جب جوان ہوا تو اماں ابا چل بسے.....'' وہ روانی سے کہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں ماضی کا عجب سا عکس تھا۔

ہیلپر برتن دے گیا تو اِس نے بھی دانے نکالنا شروع کیا۔ جانے کیوں دانوں سے اُسے شاہجہاں یاد آ گیا۔

''میں نے اُن کا چھوٹا سا ہوٹل سنبھال لیا..... لیکن ہوٹل چلاتے وقت مجھے احساس ہوا کہ میں صرف کھانا پکا سکتا ہوں، manage نہیں کر سکتا۔ دونوں جگہ خود کو مصروف رکھتے رکھتے بلا آخر میں ہار گیا۔ ہوٹل بد سے بدتر اور بدتر سے بدترین ہوتا گیا اور پھر بند ہو گیا۔ میں نے دوسرا کھولا، وہ بھی ٹھپ ہو گیا حالانکہ میں نے وہاں باقاعدہ اسٹاف رکھا تھا۔ پھر میں نے تیسرا کھولا، وہ بھی چار ماہ چل سکا۔''

وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیم پاکستانی لب بھینچے پھلیاں چھیل رہا تھا۔

''اس کے بعد میں نے کوئی ریستوران نہیں کھولا بلکہ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں بطور شیف نوکری شروع کر دی۔ وہاں مجھ سے تین چار دفعہ کھانے میں مرچیں تیز ہو گئیں تو مالک نے نکال دیا یہ کہہ کر میں بے حد مرچیلا ہوں۔''

''چک..... یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' غزارا نے افسوس کیا۔

''مرچیلا کہنا برا نہیں تھا میڈم..... نوکری سے نکالنا برا تھا۔'' وہ ڈرامائی انداز میں رو پڑا۔ غزارا نے اشارے سے ہیلپر کو پیپر ٹاول لانے کا کہا کیوں کہ عام ٹشو کے بس کی بات تو یہ تھی نہیں۔

ہیلپر نے ٹشو دیا تو پاکستانی نے رگڑ رگڑ کر آنسو صاف کیے پھر پوری قوت سے ناک سنبھالی۔

''اس کے بعد میں نے.....'' ٹشو نیچے کر کے وہ بولا۔ ''میں نے کچھ عرصے اپنی جمع پونجی چلائی۔ پھر میں سڑک پہ آ گیا۔ یہ ساڑھے سات ماہ پہلے کی بات ہے۔ تب مجھے یہ (نیم پاکستانی) ملا۔ یہ بھی زمانے کا ستایا ہوا ستم ظریف تھا۔ اس نے میرا ساتھ دیا، میں نے اس کا۔ شاہجہاں صاحب سے ''فنڈ ریز'' کرایا اور ۲ فیصد equity دی، صرف ایک کروڑ کے منافع پر۔ انھوں نے بہت مدد کی۔ ہم نے یہ ریستوران کھولا۔ چھ ماہ یہ بھی نہیں چلا.....'' وہ پھر رونے لگا۔

''لیکن اب تو چل رہا ہے ناں۔ اب تو.....''

''میڈم رُکیں، اس بات پہ نہیں رو رہے، بات کچھ اور ہے۔'' نیم پاکستانی نے جھک کے اِس کے کان میں سرگوشی کی۔

وہ ٹھٹک گئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''بتاتا ہوں۔'' نیم پاکستانی نے کہا۔ اسی وقت پاکستانی نے ناک سعالی۔

''میں نے کوئی فائدہ نہیں کیا زندگی میں۔ سارا نقصان کیا ہے۔ سوچتا ہوں، میں نے کیا کیا نہیں گنوایا۔ ساری عمر اس کھانے پکانے میں لگادی، مجھے کیا ملا۔ کچھ بھی نہیں۔''

''آپ کو کیا چاہیے؟'' غزارا نے بے ساختہ پوچھا۔

''بیوی، بچے ایک اچھا خاندان.....'' نیم پاکستانی نے ڈرامائی انداز میں ہاتھ جھلایا۔

''کیا مطلب؟'' غزارا چونکی۔

''اس کی شادی نہیں ہوئی ناں، اس لیے۔''

''کیا؟'' اُس کو اچھو لگا۔ پاکستانی تیزی سے سیدھا ہوا۔

''چپ کرو۔ تمہیں کتنی بار کہوں میری ذاتی زندگی کو بیچ میں مت لایا کرو۔'' وہ نیم پاکستانی پر بھڑکا۔

''میں نے تمہارے رونے کی وجہ بتائی ہے بس۔'' نیم پاکستانی نے شانے اُچکائے۔

''اِک منٹ۔ آپ کی شادی نہیں ہوئی؟'' غزارا نے دوبارہ دریافت کیا جس پر پاکستانی کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا پھر نادم سا ہو کر سر نفی میں ہلایا۔ ''لیکن کیوں؟''

''یہ خوبصورت نہیں ہے ناں۔'' نیم پاکستانی نے پھر ہانک لگائی۔

پاکستانی نے تیزی سے مٹھی بھر پھلیاں اٹھا کر اُس نے منہ پر ماریں۔

''چپ کرو تم.....'' وہ شرم سے روہانسا ہو رہا تھا۔

''خوبصورت کیوں نہیں ہیں بس چہرے پر.....'' غزارا نے ہاتھ بڑھا کر پاکستانی کے چیچک زدہ گال چھوئے۔ ''ہاں..... چہرہ خراب ہے۔ لیکن اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ بلکہ کوریہ

میں تو لاکھوں اسکن کی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔ ہماری سب سے بڑی صنعت skin products کی ہی تو ہے۔ قریباً 10 miillion dollers کی مارکیٹ ہے۔ ہم ایسی ایسی اسکن پراڈکٹس بناتے ہیں کہ کچھ دنوں کے استعمال سے ہی، انسان چمکنے دمکنے لگ جاتا ہے۔'' اس نے فخر سے شانے کڑا کے کہا۔

''تو پھر آپ ان کے لیے کوریہ سے مصالحوں کے ساتھ ساتھ ایک عدد کریم بھی منگوالیں تاکہ ان کا چہرہ چمکنے دمکنے لگ جائے اور اِن کو بھی کسی کا گھونگھٹ اٹھانے کی سہولت میسر آجائے۔'' نیم پاکستانی نے چھیڑتے ہوئے کہا جس پر پاکستانی کا موڈ ذرا نہیں بدلا۔ غزارا بھرپوری ہنسی۔

''ٹھیک ہے۔ بس یہ مجھے کچھ تصویریں دے دیں تاکہ میں اُن کو بھجوادوں پھر وہ مخصوص کریم بھجوادیں گے۔''

''ہورے ے..... زبردست!'' نیم پاکستانی جشن سے بولا پھر اس نے پاکستانی کو دیکھا جو تاحال منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس نے پھلیوں کے چھلکے اُس کی سمت اُچھالے ''اب تو خوش ہوجاؤ منحوس انسان۔''

پاکستانی نے ناگواری سے چھلکے جھاڑے۔ ''میرے دل کو خوشی نہیں مل سکتی جب تک علاج ہو نہ جائے۔''

''دیکھو.....'' غزارا نے کہنا چاہا لیکن تب ہی شیف آگیا۔

''میڈم، کوئی مہمان آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ تصویر بنوانی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

''ٹھیک ہے آتی ہوں۔'' اس نے اخلاق سے کہا تو وہ سر نیہوڑتا وہاں سے چلا گیا۔ وہ

دوبارہ پاکستانی کو دیکھنے لگی جس کی پیشانی کے بل اُبھرے ہوئے تھے۔

''تم زیادہ کیوں سوچتے ہو پاکستانی۔ دیکھو تمہارے پاس اب ایک مہنگا اور اچھا پیسا بنانے والا ریستوران ہے۔ تم چاہو تو کچھ پیسے پس انداز کر کے ان گڈھوں کی سرجری کرا سکتے ہو۔ اب ایسی تو کوئی بات نہیں کہ ان کا کوئی علاج نہ ہو۔''

پاکستانی نے تھکا سا سانس نکالا۔ ''تم لڑکی ہوں ناں، تم اس اذیت کو نہیں سمجھ سکتی جو میرے دل پہ گزر رہی ہے۔''

''تم بس زیادہ سوچ رہے ہو اور کچھ نہیں.....'' غزارا نے کہا اور برتن دھکیل کر کھڑی ہوئی۔

''زیادہ نہیں سوچتا۔ دیکھو اس ریستوران کو۔ یہ تم سے چلتا ہے۔ تم نہ ہو تو اسے بھی میرے نصیب کی کالک لگ جائے اور یہ بھی دوسروں کی طرح ٹھپ ہو جائے۔''

''چیزیں نصیبوں کو متاثر نہیں کرتیں۔ یہ ایک غلط فہمی ہے کہ بے جان چیزیں انسان کی قسمت پر اندھیرا ڈال سکتی ہیں۔ انسان کی تقدیر بدلنے میں وقت نہیں لگتا، بس آپ شکر ادا کریں۔ آپ کے ساتھ اور بھی ریستوران ہیں جو کئی سالوں سے قائم ہیں۔ ان کے یہاں بھی اتنا رش نہیں، جتنا یہاں ہے۔ یہ ایک بڑی کامیابی ہے پاکستانی۔''

اس نے گرمجوشی سے جتایا اور کرسی سے نکل آئی اور میز کی الٹ میں دیوار کی سمت گئی جہاں آئینہ لگا ہوا تھا۔

''لیکن پھر بھی میرا دل اُداس ہے۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔''

''تم مستقبل کو لے کر پریشان مت ہو، اپنے حال کا شکر ادا کرو۔ جس نے ابھی اتنا دیا ہے، وہ آگے اس سے بھی زیادہ دے گا۔'' وہ ہونٹوں پر انگلی رگڑنے لگی تاکہ لپ گلوز پھیل سکے

جواس نے چینل سے نکلتے وقت لگایا تھا۔

''کیسے معلوم.....'' پاکستانی نے پھلی کا چھلکا دور اُچھالتے ہوئے طنز سے کہا۔

''دیکھو پاکستانی.....اگر تم اس پر راضی نہیں ہوئے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے تو تم اُس پر بھی راضی نہیں ہوگے جو اللہ نے تمہیں دینا ہے۔'' دھیرے سے اُس کا شانہ تھپک کر وہ گرمجوش مسکراہٹ سے دیکھتی، آگے بڑھ گئی۔

پاکستانی کئی لمحوں تک اُن الفاظ کی گونج میں الجھا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ لان میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اگلے لان میں گھنے درختوں کے سائے میں آہنی بینچ نصب تھے جن کا رُخ حویلی کی دیوار کی طرف تھا جہاں کیاریوں میں بے تحاشا رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور نرم سبز گھاس بچھی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے درختوں کے پتے سرسرا رہے تھے۔

وہ چائے پی رہا تھا جو ملازم کچھ دیر پہلے دے کر گیا تھا۔ بچے اسکول سے آچکے تھے۔ وہ لان میں، اسی سمت فٹ بال کھیلنے میں مگن تھے۔ شاہجہاں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ گھنٹہ پہلے اس کی زید سے بات ہوئی تھی جو بتا رہا تھا کہ ماں کا مزاج بدل گیا ہے۔ وہ اُس کے ساتھ کھیلتی ہے، اس کو گھمانے اور کھانا کھلانے لے جاتی ہے یہاں تک کہ اُس کے ساتھ ویڈیو گیمز بھی کھیلتی ہے۔ وہ کچھ چونکا نہیں کہ وہ جانتا تھا کہ یہ بھی حمنہ کی کوئی نئی سازش ہوگی لیکن خیر اچھا تھا کہ وہ زید کو وقت دے رہی تھی پھر چاہے اُس کے جو بھی اِرادے تھے۔

وہ یہی سوچ رہا تھا جب اس کی نگاہ اچانک روشنا چچی کی طرف اٹھی۔ وہ لان کے دہانے پر کھڑی، بھرپور ہنستے ہوئے کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ باتوں میں ایسی گرمجوشی اور بے

تابی تھی کہ ایک لمحے کو اسے یقین نہیں آیا کہ یہ روشنا چچی ہی ہے۔ پھر اسے اُن کے عقب سے طاہرہ بیگم نمودار ہوتی نظر آئیں جنھوں نے چلتے چلتے ہنستی روشنا سے کچھ کہا پھر وہ اسی چال سے شاہجہاں کی سمت آئیں۔

نارنجی شلوار قمیص پر سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی۔ کانوں میں آنسو کی شکل کے ٹاپس تھے اور اسی طرز کی مالا گردن سے جڑی تھی۔ بال حسب معمول نفاست سے بندھے تھے۔

''کیا کر رہے ہو اکیلے۔ طبیعت ٹھیک ہے؟'' انھوں نے قریب آ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

''جی امی۔ ٹھیک ہوں۔ بس ایسی ہوا لینے کا دل کر رہا تھا۔'' اس نے ماں کا ہاتھ تھام کر ان کو برابر میں بٹھایا اور چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔

''میں نے اوپر سے دیکھا تو پوچھنے چلی آئی۔ دوا تو لی ہے ناں تم نے.....''

''جی۔ یانگ شی دے کر گئی ہے۔''

طاہرہ بیگم کا چہرہ ایک لمحے کو تاریک ہوا لیکن وہ سنبھل گئیں۔ زبردستی مسکراہٹ سجا کر انھوں نے بیٹے کے شانے چھوئے۔

''جانے کن مردودوں نے میری جان پر حملہ کیا۔ اللہ کرے وہ خبیث جلدی پکڑے جائیں۔ دیکھنا، اپنے جوتوں سے پٹائی کروں گی میں اُن کی.....'' وہ ممتا سے تڑپ کے بولیں جس پر شاہجہاں ہنس دیا۔

''ہیل والا جوتا استعمال کرنا۔''

''وہی کروں گی۔ باریک ہیل والا تاکہ کیل کی طرح چبھے اُن کو ہیل۔''

''اچھا جانے دیں۔ دل برا نہ کریں۔ یہ بتائیں چچی کیوں اتنی خوش تھیں۔ جنت کی

بشارت مل گئی ہے کیا؟'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔ طاہرہ بیگم کے نتھنے پھولے۔

''ان کی بہن آرہی ہے حسن ابدال سے۔''

''پھر سے؟ تین ماہ پہلے ہی تو گئی تھیں۔'' وہ بے زار ہوا۔

''وہ والی چینوٹ کی تھی۔ یہ دوسری ہے۔ پتے کا اپریشن ہے پمز میں۔ ہمارے یہاں کچھ دن ٹھہرے گی۔''

''اوہ.....'' شاہجہاں نے واجبی سا افسوس کیا۔

''میرا گھر ملا ہے اِن کو خدمت گزاری کے لیے۔'' وہ تلخی سے کہنے لگیں۔ ''جس کا گھر ہے۔ جس کو راج کرنا چاہیے وہ تو ماں کے ساتھ میکے بیٹھا ہوا ہے۔'' کہتے ہی وہ گلوگیر ہوئیں۔

''شاہ جہاں..... تیری بیوی فون کیوں نہیں اٹھاتی۔ مجھے اپنے پوتے سے بات کرنی ہے۔ سو دفعہ کال کر چکی ہوں۔ گھر کے نمبر پہ بھی کیا ہے۔ عفت کو ملا ملا کے تھک چکی ہوں، لیکن وہ ملتا ہی نہیں۔ میرا دل بہت اُداس ہو رہا ہے اُس کے لیے۔''

''وہ کسی ''چیز'' میں مصروف ہوگی۔ اس لیے نہیں اٹھا رہی ہوگی۔'' اس نے معنی خیز انداز میں سر جھٹکا۔

''مصروف وصروف نہیں ہے۔ بس ہم سے بات نہیں کرانی اُس نے۔'' انھوں نے ناک بھوں چڑھائی۔

''آپ ایک کام کریں۔ حلیمہ کے نمبر سے کال کریں وہ اٹھا لے گی پھر۔ حلیمہ کو کال کرتی رہتی ہے وہ۔ حویلی کا حال احوال جاننے کے لیے۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''اچھا۔ چلو۔ میں کرتی ہوں کوشش۔'' انھوں نے کہا۔ ''تم زیادہ ہوا میں نہ بیٹھو۔ زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے۔ متاثر نہ ہو جائیں۔''

''کچھ نہیں ہوتا امی۔ پٹی لگی ہوئی ہے۔آپ جائیں۔آرام کریں۔''اس نے ماں کا ہاتھ ہولے سے دبایا۔طاہرہ بیگم کچھ دیر اس کو ممتا سے دیکھتی رہیں پھر اس کا ماتھا چوم کر وہاں سے چلی گئیں۔

وہ کچھ پل یونہی ہوا کھاتا رہا اور تب ہی اِس کا فون بجا۔سیکرٹری کی کال تھی۔

اس نے فوراً اٹھائی۔''ہاں قاسم بولو۔کیا بنا کام کا۔''

''سرکیس پہ کام شروع ہو چکا۔ایک دو دن میں ہم عدالت میں ہوں گے۔''

''شاباش.....''وہ مسرور ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام جب وہ حویلی پہنچی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔حسبِ عادت وہ نہا دھو کر شاہ جہاں کے کمرے میں چلی آئی تھی لیکن اسے شاہ جہاں کمرے میں نہیں ملا تھا۔وہ اسٹڈی میں تھا اور اسٹڈی کا دروازہ بند تھا۔اس نے کھٹکھٹانا مناسب نہیں سمجھا اور اسی طرح کشمکش کی حالت میں کچن کی طرف چلی آئی تاکہ پانی کی بوتل کمرے میں لے جا سکے۔

کچن میں اسے صدف مل گئی جو گیلا کپڑا سلیب پر پھیر رہی تھی، یعنی وہ کام ختم کر کے جانے والی تھی۔اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کے وہ کچھ چونکی پھر ناگواری سے سر جھٹک دیا۔غزارا نے کچھ کہے بغیر فرج سے پانی کی بوتل نکالی اور پلٹ کر نکلنے لگی لیکن رُک گئی۔اس نے پلٹ کر صدف کو دیکھا۔

''سنو.....شاہ کو گرین ٹی دی تھی تم نے؟''

''دے دی تھی۔''وہ اسی نروٹھے انداز میں بولی اور اور زور سے سلیب رگڑنے لگی۔

''کہاں دی تھی؟ اُن کے کمرے میں یا اُن کی اسٹڈی میں؟''

''اسٹڈی میں، ان کو ہی نہیں۔ سب کو دی تھی۔'' صدف بے زار تھی۔

وہ ٹھٹک گئی۔ ''سب کو؟ مطلب؟''

''مطلب بڑے صاحب، چھوٹے صاحب، عمران صاحب، عالم صاحب سب کو.....''

''اس نے گیلا کپڑا سنک کی ٹونٹی کے نیچے دھویا پھر نچوڑ کر پیچھے لگے ننھے سے اسٹینڈ پر پھیلا دیا۔

وہ صدف کی بات سن کر تاحال وہاں کشمکش کی حالت میں کھڑی تھی۔

''وہ سب شاہ کے کمرے میں کیا کر رہے تھے؟'' بظاہر وہ منہ میں بڑبڑائی تھی لیکن صدف نے سُن لیا۔

''شاہ صاحب پر حملہ کرنے والا ایک لڑکا پکڑا گیا ہے ناں، اُسی کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔'' اس نے پلٹ کر جواب دیا جس پر وہ بری طرح چونکی۔

''کیا کہا؟ ایک حملہ آور پکڑا گیا؟''

''ہاں۔'' صدف نے ہاتھ دھو کر قمیص سے رگڑے اور ایک طائرانہ نظر ہر طرف ڈالی۔ سب کام ہو چکا تھا۔

''اچھا ہوا۔ اب دیکھنا باقی بھی پکڑے جائیں گے۔ پھر سامنے آئے گا کس نے حملہ کرایا تھا۔''

صدف نے ایک کوفت بھری نظر سے دیکھا۔ ''آپ جائیں گی یا کچھ اور چاہیے؟''

''نہیں میں جا رہی ہوں۔ تم بند کر دو یہ سب۔''

وہ مسکرا کے کہتی، بوتل لیے وہاں سے نکل آئی۔ صدف نے پیچھے ساری بتیاں ایک ایک کر کے بجھا دیں۔

☆.....☆.....☆

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ شاہ سے ملے یا نہ ملے؟ وہ اکیلا محسوس کر رہا ہوگا۔ شاید وہ اُداس بھی ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُسے اس وقت اس کی ضرورت ہو۔ بالائی رہداری پر پہنچ کر اس نے ایک نگاہ شاہجہاں کے کمرے کی طرف اٹھائی۔ دروازہ بند تھا، دروازے کی نچلی سطح سے روشنی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ کیا پتا وہ سو گئے ہوں، اُنھیں آرام کی بھی ضرورت ہے۔ اس نے سوچا اور سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آگئی۔

بستر پر دراز ہوتے ہی اسے خیال آیا کہ اس نے آج پھر اپنی دوا نہیں خریدی تھی۔ گو کہ آج کل وہ بہتر محسوس کر رہی تھی لیکن باقاعدگی سے کھائی جانے والی دوا کو وہ اچانک نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا اور دھڑکن محسوس کی۔ دل بے آواز دھڑک رہا تھا۔ دھیما دھیما..... اس نے گہرا سانس لیا۔ ابھی سب ٹھیک تھا۔

یانگ منی کو گڈ نائٹ کا پیغام بھیجنے کے بعد وہ داہنے کروٹ پر موبائل چلاتے چلاتے سو گئی۔ کچھ ساعتیں گزری تھیں جب اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور شاہجہاں اندر آیا۔ اُس کے بازو سے پٹی ہٹی ہوئی تھی اور وہ پہلے کی نسبت اب توانا لگ رہا تھا۔

وہ قدم قدم چل کر اُس کے بستر کی طرف آیا۔ روشنیاں بند تھیں، صرف سائیڈ لیمپ جل رہا تھا جو وہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ وہ کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

چہرے کے قریب فون گرا ہوا تھا جس کی اسکرین آن تھی۔ اس کا گال تکیے میں دبا ہوا تھا، ایک ہاتھ بیڈ کے نیچے لٹک رہا تھا اور دوسرا کہیں دور ترچھا پڑا تھا۔ اس کے سیاہ بال جو نم تھے، اس کے گال پر پھسل رہے تھے۔

وہ پنجوں کے بل اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ کتنے ہی لمحوں تک وہ اس کے معصوم، پھولے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا، وہ گہرے سانس لے رہی تھی۔ شاہجہاں کو یوں محسوس ہوا جیسا وہ

پندرہ سال پہلے کی یانگ شی ہو۔ وہی یانگ شی جو اس کے کندھے پر سر ڈال کر سو جاتی تھی اور جس کے گہرے سانس وہ اپنی گردن پر محسوس کرتا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا تو اسکرین چمکی۔ گلابی وال پیپر پہ درمیان میں اِس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ کچھ خوشگوار حیرت سے چونکا۔ وہ سیاہ شرٹ میں لی گئی اُس کی تصویر تھی جب وہ فون دیکھتے اور چائے پیتے ہوئے ٹیرس پر ٹہل رہا تھا۔ یہ اس نے کب لی؟ وہ سوچنے لگا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اُس کی وٹس ایپ پہ ڈی پی پہ اِسی کی ایک تصویر ہے اور ای میل پر بھی اس کی تصویر لگی ہے۔ وہ اُداسی سے مسکرا دیا۔

یہ لڑکی نہیں سدھرنے والی تھی۔

فون بند کر کے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور اس کا لٹکتا ہاتھ اٹھا کر پہلو میں برابر رکھ دیا۔ پھر اُس کے چہرے سے بال پیچھے کیے اور کمبل سینے تک کھینچ دیا۔ وہ کچھ کسمسائی لیکن جاگی نہیں۔ اس نے ایک الوداعی نظر اُس کے وجود پر ڈالی اور لیمپ آف کر کے نکل آیا۔

☆.....☆.....☆

صبح اُس کی آنکھ سورج کی روشنی سے کھلی جو کھڑکی کے پردوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر آنکھیں کھولنے میں مگن رہی، شدید تھکن بھری انگڑائیاں لیتے ہوئے وہ خمار آلود آواز میں منمناتی رہی پھر اٹھ کے بیٹھ گئی۔ بازو بڑھا کر اس نے کندھے اور کمر چٹخائی پھر جھٹ پٹ بستر سے نکل آئی۔

اسے آج ریکارڈنگ نہیں جانا تھا، اسے آج کی چھٹی ملی تھی۔ نہانے، برش کرنے اور کپڑے تبدیل کر کے وہ نیچے آئی تو لاؤنج میں شاہجہاں کو روشنا، کرن اور باقی کے کچھ کزن کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ وہ آج کل آفس نہ جانے کی وجہ سے گھر پر عورتوں کے بیچ گھرا نظر آتا تھا۔ وہ

سیڑھیوں پر ہی رُک گئی پھر بے زاری سے سانس نکالتی بادلِ نخواستہ اُس طرف چلی آئی۔

''گڈ مارننگ۔تم جاگ گئیں؟'' شاہجہاں جو چائے پی رہا تھا،اسے آتا دیکھ کے گرمجوشی سے بولا۔

''گڈ مارننگ.....'' وہ بشاشت سے کہتی صوفے کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔طاہرہ اور روشنا نے تلخ نظروں کا تبادلہ کیا جب کے کرن ممانی جلن سے مسکرائیں۔

''کافی دیر سے اٹھی ہو۔گیارہ بج گئے ہیں۔کیا کوریا میں لوگ دیر سے اٹھتے ہیں؟'' روشنا نے لہجے کی شہد میں مرچ ڈبوتے ہوئے دریافت کیا۔غزارا ڈرامائی انداز میں مسکرائی۔

''نہیں ممانی۔یہ بس یہاں کی آب وہوا کا اثر ہے ورنہ کوریا میں لوگ صبح ہی صبح اٹھ جاتے ہیں۔''

روشنا نے کلس کر پہلو بدل لیا۔

''جاؤ جا کے ناشتہ کرلو یانگ شی۔صدف تیار کر رہی ہے پھر ہم کہیں جائیں گے۔'' اُس نے مسکرا غزارا سے کہا۔

وہ چونکی۔''کہاں؟''

''خط دینے.....'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولا تو اُس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔آنکھوں میں سنجیدگی در آئی۔وہ سمجھداری سے سر ہلاتی کچن کی سمت چلی گئی۔

طاہرہ بیگم اور باقیوں نے نہیں پوچھا کہ خط کا کیا معمہ ہے۔اگر وہ پوچھ بھی لیتیں تو شاہجہاں نے ٹال دینا تھا۔اس لیے خاموشی سے چائے پینے لگ گئیں۔

جب وہ ناشتہ کر چکی تو باہر آ گئی۔شاہجہاں پورچ میں اُس کا انتظار کر رہا تھا۔گاڑی تیار تھی۔فیض ہی اگلی نشست پر متمکن تھا۔یہ وہی ڈرائیور تھا جو طاہرہ بیگم نے شاہجہاں کے دبئی

جانے پر اس سے چھین لیا تھا۔ اس نے شاہجہاں کو نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ ماں اور بیٹے کے درمیان کوئی کشیدگی نہیں بنانا چاہتی تھی۔

پیلے رنگ کی شرٹ کے نیچے آج اُس نے کریم رنگ کی پینٹ پہنی تھی۔ شرٹ لمبی تھی یوں کہ گھٹنوں تک آتی تھی۔ اس نے دوپٹہ مفلر کی طرح گردن میں ڈال رکھا تھا اور بیگ بھی تھا جو وہ ناشتے کے بعد کمرے سے لے آئی تھی۔

سب سے پہلے وہ پھولوں کی دُکان پر گئے۔ اُنھوں نے گلابی گلاب خریدے اور پھر قبرستان کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی مرکزی دروازے سے قدرے دور کھڑی کی کیوں کہ اس سے آگے بہت گاڑیاں پارک تھیں، معلوم ہوتا تھا کوئی نئی فوتگی ہوئی تھی۔

وہاں سے وہ دونوں پیدل چلنے لگے۔ گلابی بکے غزارا کے ہاتھ میں تھا اور وہ چلتے ہوئے وقفے وقفے سے پھولوں کو سُونگھ رہی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہمیں گلابی گلاب مل گئے۔'' وہ نم پتیوں کو دیکھ رہی تھی جو بہت تر و تازہ تھیں۔

''گلابی گلاب مل جاتے ہیں۔ یہ rare نہیں ہیں۔'' وہ بولا۔ سڑک پر قدرے رش تھا۔ لوگ سفید اور سیاہ کپڑوں میں ملبوس نظر آرہے تھے۔

''ہاں پھر بھی، جب نہیں ملنا ہوتے تو نہیں ملتے۔ ما کو بہت پسند تھے۔ اپا کہتے تھے، مجھے تو یاد نہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔

''اگر وہ کہتے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔''

''مگر مجھے ایک ہی طرح کے پھولوں کا بکے پسند نہیں۔ مجھے وہ بکے پسند ہے جس میں ہر طرح کا ایک ایک پھول ہو۔ گلاب، ٹیولپ، کنول، لالہ، عودی، گیندا..... سب.....''

''تمہیں پھولوں کے نام بھی اُردو میں آتے ہیں۔'' وہ تعجب سے بولا تھا۔

''ہاں تو..... کوریہ میں گزرے ان پندرہ سالوں میں تین چیزوں کو نہیں چھوڑا میں نے.....''

''کونسی؟'' وہ گیٹ کے پاس آگئے تھے۔ وہاں سے لوگ نکل رہے تھے۔ مرد ہی مرد، سرخ آنکھوں سے روتے، سنجیدگی طاری کیے ایک دوسرے کو گلے لگاتے۔

''اسلام، اُردو اور..... شاہ.....'' وہ اُسے دیکھتی گہری مسکرائی تھی۔ شاہجہاں نے گہرا سانس لے کر سر ہلا دیا۔

مرکزی دروازے سے بھیڑ چھٹی تو وہ دونوں پہلو بہ پہلو چلتے اندر داخل ہو گئے۔ غزارا نے احتراماً دوپٹے کو کھول کر سر پر جما دیا۔ جہاں سے بھیڑ آ رہی تھی، اُس کے مخالف سمت اِن کو جانا تھا اس لیے ہجوم نے پریشان نہیں کیا اور ویسے بھی اسلام آباد جیسے علاقے میں ایک قبرستان ہے جس کی وجہ سے ہر روز یہاں کئی جنازے ہوتے ہیں۔

ان کے خاندان کی قبروں کی قطار میں کئی لوگ دفن تھے، مگر پٹی پر صرف نانی کی قبر تازہ تھی۔ اِس نے جھک کے ماں کی قبر کے اوپر بکے رکھ دیا۔

''سلام ما.....'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''بابا نے بھجوائے ہیں۔''

شاہجہاں قدرے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ ادب سے پشت پر بندھے تھے۔ غزارا نے اُس کے برابر میں آ کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور آنکھیں بند کر لیں۔

آج اِسے گھٹن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ استقامت محسوس ہو رہی تھی اور اس کی وجہ شاہجہاں کا ساتھ ہونا تھا۔ اُس دن، یہاں ویرانی تھی جب ہی وہ اس بری طرح گھبرائی گئی تھی لیکن آج وہ پرسکون تھی۔ دل کی دھڑکنوں سے ماں کے لیے دعا کر رہی تھی۔ جب فاتحہ پڑھ چکی

تو وہ یونہی قبر کو دیکھنے لگی۔ بے وجہ، بے سبب۔

شاہجہاں نے ذرا سی گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔ وہ رو نہیں رہی تھی۔ خاموش تھی۔ سنجیدگی سے خاموش تھی۔ جانے کیوں اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے دل میں ایک پر کیف سا احساس بھرا ہوا تھا۔ وہ خود بھی اس چیز کو سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیوں رو نہیں پا رہی۔ اس کی آنکھیں یکا یک کیسے خشک ہو سکتی ہیں؟

''عجیب بات ہے.....'' وہ کتبے کو دیکھتے ہوئے بھاری لہجے میں بولی۔ ''مجھے لگا کہ میں..... میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں گی..... میں..... میں جذباتی طور پر اتنی مضبوط نہیں ہوں..... جلدی ٹوٹ جاتی ہوں..... لیکن..... لیکن مجھے رونا نہیں آ رہا۔ پتا نہیں کیوں؟''

شاہجہاں نے کوئی جواب نہیں دیا، بس نگاہ قبر کی طرف پھیر لی۔ اسے یاد آ رہا تھا وہ وقت جب یہ لڑکی، جو آج رونا نہ آنے کا شکوہ کر رہی ہے۔ اُس وقت کتنا رویا کرتی تھی۔ دھاڑیں مار کر، چیخ چیخ کر، ماتم کرتی تھی۔ کئی گھنٹوں تک فاقے کرتی، چڑتی، غصہ کرتی، مارنے پہ اُتر آتی تھی۔

بچے کے لیے ممتا کی کمی یا تڑپ ایسی نہیں ہوتی کہ اُسے لازماً شعور ہوگا تو وہ سمجھ سکے گا کہ اُس کی ماں نہیں رہی، دو ماہ کا بچہ بھی جان لیتا ہے کہ اب اُس کی ماں نہیں رہی۔ ممتا میں عمر کی قید نہیں ہوتی، ممتا ہر چیز سے بالاتر ہوتی ہے۔

غزارا نے پرس کھول کے خط نکالا جو چھوٹا سا نہ نظر آنے والا رقعہ تھا۔ کورین زبان میں لکھا ہوا۔ اِس نے جھک کے امانت کو ماں کی قبر کی مٹی میں یوں دفنا دیا کہ خط کا کاغذ مٹی میں دب گیا۔

''مجھے نہیں معلوم اپا نے کیا لکھا ہے۔ آپ پڑھ لینا۔'' ذرا سی سرگوشی کی پھر وہ سیدھی ہوئی اور نانی کی قبر کی سمت بڑھ گئی۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے فاتحہ پڑھی، اُن کے درجات بلندی کی دُعا مانگی۔

جانے کیوں وہ اُن کو دیکھ کے عجیب سی ''بے ثباتی'' کا شکار ہوگئی۔ جیسے فلسفہ کائنات پر تعجب کا اظہار کر رہی ہو۔ یہ فطرت بھی عجیب چیز ہے۔ اس کا نظام، جب کسی کو گرفت میں لیتا ہے جو اُس کا حجم نہیں دیکھتا۔ اُس کی جسامت، اُس کی طاقت، دبدبہ اور مقام نہیں دیکھتا۔ اس کے اصول سب کے لیے یکساں ہیں۔ بالکل یکساں۔

باہر آنے تک وہ یہی سوچ رہی تھی۔ دل مطمئن ہوگیا تھا کہ ابا کی امانت پہنچا دی لیکن قبرستان کی مستقل اُداسی اور بے ثباتی کا وہ اثر برقرار تھا۔ وہ سڑک کو گھورتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم لے رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' شاہجہاں نے اسے کھویا ہوا دیکھ کے پوچھا۔

''یہی کہ نانی کتنی شاندار ہوا کرتی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب وہ بہوؤں کو حکم دیتی تھیں تو وہ سرپٹ دوڑی چلی آتی تھیں۔ حویلی میں اُن کی ایک شان تھی۔ ایک غنیض تھا۔ دبدبہ تھا اور اب.....'' وہ احساسِ تاسف سے جھرجھرانے لگی۔

''آتش کا ایک شعر ہے:

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

جب موت آتی ہے ناں یا نگ شی تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کسے لینے آئی ہے۔ وہ بس لے چلتی ہے۔'' اس نے بے رحم سا لہجے میں تبصرہ کیا۔

''ہوں۔'' غزارا نے حمایتاً سر ہلایا۔

قبرستان کے آگے پارک گاڑیاں اب جا چکی تھیں۔ ایک آدھ رہ گئی تھی۔ فیض گاڑی کے دروازے سے جڑا کھڑا تھا۔ ٹوپی بغل میں پکڑ رکھی تھی۔

''آپ کا ایک حملہ آور پکڑا گیا ہے میں نے سُنا ہے۔'' چلتے ہوئے اُس نے کہا۔
''ایک نہیں۔ تین۔ دو کل رات کو پکڑے گئے ہیں۔'' اس نے ترمیم کی۔
''اوہ..... پاکستان کی پولیس فاسٹ ہے۔'' وہ تحسینی انداز میں بولی تھی۔
''ہاں اگر پشت پہ بھاری ہاتھ ہو.....'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ غزارا محاورہ سمجھی تو نہیں لیکن سر ہلا دیا۔
''تو انھوں نے بتایا نہیں اُنھوں نے کیوں حملہ کیا تھا؟''
''انھوں نے خود نہیں کیا، اُن سے کرایا گیا تھا۔ وہ تو کرائے کے غنڈے تھے۔''
''اچھا.....'' وہ چونک گئی۔ ''کس نے حملہ کرایا ہے شاہ؟ کیا آپ کے کوئی دشمن ہیں؟''
شاہجہاں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھے۔ وہ اس کے ساتھ ہم قدم تھی۔ ہاتھ پہلو میں گرے ہوئے تھے۔
''نہیں۔ دشمن نہیں ہیں..... لیکن..... بننے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔''
''ہاں لیکن غنڈوں نے بتایا تو ہوگا کہ انھوں نے کس کے کہنے پر کیا ہے۔''
''ابھی نہیں.....'' شاہجہاں نے تردید کی۔ ''تفتیش چل رہی ہے۔ جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔''
''بس ایک بار معلوم ہو جائے تو دشمن بھی معلوم ہو جائے گا۔ پھر میں اُس کو اتنی سزا دوں گی، اتنی سزا دوں گی کہ وہ دوبارہ جرات نہیں کرے گا آپ پر حملہ کرنے کی۔''
''تم اسے سزا دو گی؟'' شاہجہاں نے شرارت سے دیکھا۔
''اور نہیں تو کیا۔ مجھے شادی سے پہلے بیوہ کرنے والا تھا وہ، تو کیا سزا نہیں دوں گی۔'' وہ روانی سے بولی لیکن شاہجہاں کے قدم تھم گئے۔ بیچ سڑک میں، وہ اگلا سانس نہیں لے سکا۔ غزارا نے پلٹ کے دیکھا تو وہ چکرائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟''

وہ یونہی اُسے دیکھتا رہا۔ خوف کی ایک سرد لہر اُس کے خلیوں میں پھیل گئی۔ اس نے خیال بھٹکانے کے لیے یہاں وہاں دیکھا لیکن وہ بے حد ہراساں نظر آ رہا تھا۔

غزار افکر مندی سے اُس کے قریب آئی۔

''میری بات عجیب لگی کیا؟'' اُس نے پوچھا۔ شاہجہاں جیسے دوبارہ چکرایا گیا تھا۔ یہ موضوع، یہ اُس نے آج تک نہیں کھولا تھا پھر یکا یک..... کیا یہ لڑکی..... کیا واقعی..... اُف نہیں..... اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''شاہ..... چلیں، گھر چلتے ہیں۔''

اس نے شاہ جہاں کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لیتی گاڑی کی طرف آئی۔

جب وہ گاڑی میں بیٹھ چکے اور گاڑی چل پڑی تو اس نے شاہجہاں کو شیشے سے باہر دیکھتے دیکھا۔ وہ کچھ وسوسے کا شکار تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے ہاتھ پہ رکھا۔ ذرا سا دبایا جس پر اُس نے رُخ اس کی سمت موڑا۔

''یاد ہے میں نے آپ کو بچپن میں ایک کاغذ کی انگوٹھی دی تھی.....''

شاہجہاں نے تھوک نگل کر گلا تر کیا۔ یہ سب، نہیں ہونا چاہیے، نہیں۔

''ساتھ کچھ اور بھی کہا تھا اور..... کئی سالوں تک کہتی رہی ہوں.....''

اُس رات کی چیخیں، آوازیں، شور طلاطم اب اردگرد سے اُبھر رہا تھا۔ ہوا گھٹ رہی تھی۔

''پتا نہیں کیوں، مجھے اچھا محسوس ہوتا ہے یہ سوچ کر.....'' کہتے ہی اُس نے لمبا سانس کھینچا۔ ''کہ آپ میرے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ ہم لوگ اس ہاتھ کی طرح ہیں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پیوست کیا۔ ''ایک دوسرے میں گھسے

ہوئے، ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہوئے۔"

ذرا سی ٹھوڑی اٹھا کر شاہجہاں کو دیکھا۔ شاہجہاں اگر بیٹھا نہ ہوتا، تو ضرور کانپ جاتا۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں مستقبل کی عجب سی چمک تھی اور ہونٹوں پر مان بھرا تبسم۔

"مجھے کوریہ میں کئی لڑکوں نے اپروچ کیا۔ رشتے بھیجے، سرعام گرل فرینڈ بننے کی آفر دی لیکن میں نے تھپڑ مار کر ریجیکٹ کر دیا۔ میرے دل میں (سینے پر انگلی رکھی) صرف آپ ہیں شاہ..... صرف آپ..... کوئی مجھ سے پوچھے کہ تمہیں کب محبت ہوئی؟ تو میں کہوں گی کہ جب شاہ جہاں کو پہلی بار دیکھا تھا، تب میں صرف پانچ سال کی تھی۔ اُس وقت..... میرا دل..... میرا دل چاہا تھا کہ اِس آدمی کے پاس جایا جائے۔ میں بے اختیار تھی شاہ..... بالکل بے اختیار..... یہ ناقابلِ یقین بات ہے لیکن یانگ منی جو ہر وقت بکواس کرتی ہے کبھی کبھی کچھ اچھا بھی کہہ جاتی ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ محبت ارادے سے نہیں کی جاتی کہ اس سے ہوگی، اتنی ہوگی، یہاں ہوگی، اس وقت تک ہوگی۔ محبت اللہ کی عطا ہے۔ یہ عمر دیکھ کے نہیں ملتی، نسل رنگ، ذات دیکھ کے نہیں ملتی۔ یہ نصیب سے ملتی ہے۔ جو خوش نصیب ہوتے ہیں، اُن کو اللہ کی بارگاہ سے عطا کی جاتی ہے۔ وہ کیا کہا کسی شاعر نے:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول، وہی آخر....."

کاش شاہجہاں اس ننھی سی لڑکی کو احساس دلا سکتا کہ وہ جو سوچ رہی ہے۔ وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ غزارا نے انگلیاں مزید دبائیں اور اسی طرح جانے کن خیالوں میں کھو گئی۔

✿ ..... ✿ ..... ✿

(قسط نمبر: 6)

وہ اپنی پلیٹ میں پزا نکال کر لائی تھی۔اس وقت لاؤنج میں صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھی، اپنا پسندیدہ ٹرکش ڈرامہ لگائے مزے سے کھا رہی تھی۔زید اپنے سلائس اٹھا کے روم میں چلا گیا تھا۔عفت کہیں گئی تھی جب کہ عرفان صاحب آفس میں تھے۔گھر میں اس کے باقی بہن بھائی موجود تھے لیکن لاؤنج میں فی الوقت صرف وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

ڈرامے میں کسی کردار کی کوئی پول کھل گئی تھی جس پر سارا ماحول طنطنا رہا تھا۔پس منظر میں اُبھرتے پر تجسس میوزک کی آواز سے ایک الگ ہولنا کی جھلک رہی تھی۔اسی لمحے اِس کا فون بجا جو سامنے میز پر پڑا تھا۔اس نے اسکرین کو دیکھتے ہوئے اٹھایا۔

''بعد میں بات کریں گے حلیمہ،اس وقت میں ایک ضروری چیز دیکھ رہی ہوں.....'' کہتے ہی فون کو لاوارث انداز میں صوفے پر پھینک دیا اور اسی انہماک سے ٹی وی میں گھس گئی۔

ذرا سی دیر بعد فون کی اسکرین پر ''ٹوں'' اُبھری تو اُس نے لاشعوری طور پر فون اٹھایا۔ وٹس ایپ پر حلیمہ نے کوئی تصویر بھیجی تھی۔اس نے یونہی غیر ارادی طور پر تصویر کھولی۔جب تک وہ لوڈ ہوتی،وہ اسکرین کو دیکھ رہی تھی پھر جیسے ہی وہ لوڈ ہوئی،اس نے پر سکون انداز میں نگاہ ڈالی..... پھر..... اگلے ہی پل..... وہ اسپرنگ سے اُچھل کر کھڑی ہوئی۔سر اس قدر چکرایا کہ دنیا گھومتی محسوس ہوئی۔اس نے پھرتی سے پلیٹ میز پر رکھی۔جلدی جلدی خراب انگلیوں سے حلیمہ کا نمبر ملایا۔

کچھ ہی دیر میں اٹھا لیا گیا۔

''یہ کیا بھیجا ہے تم نے؟ یہ کیا ہے؟'' اس کا ایک سانس جا رہا تھا، ایک آ رہا تھا۔

''یہ ایک بیڈ نیوز ہے آپ کے لیے.....'' حلیمہ نے واجبی ہمدردی جتائی۔

''کب.....'' خشک گلا تر کیا۔ ''کب ہوا.....؟''

''دو دن پہلے..... عجیب بات ہے آپ کو اب تک اطلاع نہیں ملی۔'' اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی حلیمہ ناخنوں کو دیکھ کے کہہ رہی تھی۔ حمنہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''شاہجہاں کہاں ہے اس وقت؟''

''شاہ بھائی تو..... پمز گئے ہیں۔ آج انھوں نے اپنی پٹی اُتروانی تھی۔ کل آفس جائیں گے ناں.....''

اس نے سُنتے ہی فون بند کیا۔ جلدی سے جوتوں میں پیر اُڑسے اور اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ اگر یہ چاروں غنڈے دو دن پہلے پکڑے گئے تھے تو اب تک وہ حامد کا راز اُگل چکے ہوں گے۔ حامد جو یہاں فی الوقت نہیں تھا لیکن شاہجہاں تو اسے پاتال سے بھی نکال سکتا تھا اور اس سے قبل کہ وہ کوئی بھیانک قدم اٹھائے، اسے شاہجہاں کو روکنا ہوگا۔

اس نے جلدی سے اپنا لباس بدلا۔ گردن میں دوپٹہ ڈالا اور پرس لیے وہ حواس باختہ انداز میں باہر آئی۔ صد شکر کے ڈرائیور گھر تھا۔ وہ گاڑی کے شیشے پر کپڑا پھیر رہا تھا۔

''جلدی کرو ڈرائیور۔ پمز چلو۔'' اِس نے پچھلا دروازے کھولتے ہی افراتفری مچائی۔ کرم دین چونکا پھر اس نے تیزی سے کپڑا پرے پھینکا اور ٹوپی درست کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

جب وہ گاڑی باہر لا رہا تھا، تب وہ شاہجہاں کو کال ملا رہی تھی جو پہلی بار تو نہیں اٹھایا گیا۔

''کیا مسئلہ ہے کبھی جو یہ آدمی میرا فون اٹھائے۔'' جھنجھلاہٹ سے کہتے اس نے دوبارہ

ملا۔اس بار پانچویں گھنٹی پہ اٹھایا گیا تھا۔''ہیلو شاہ.....کہاں ہو تم؟''اس نے تیزی سے پوچھا۔

''پمز میں ہوں۔کیا ہوا ہے؟''بے زاری بھری آواز آئی۔

''مجھے تم سے ملنا ہے۔اُدھر ہی رہنا، میں آ رہی ہوں۔''

اس نے کہتے ہی جھٹ سے فون بند کر دیا تا کہ وہ آگے سے فضولیات نہ بک سکے۔گاڑی میں بیٹھی، وہ مسلسل پیشانی سہلا رہی تھی۔گو کہ حامد ترکی میں تھا۔روازنہ اسے ای میل یا سکائپ پہ بات کرتا تھا لیکن وہ اندر سے بے حد گھبرا رہی تھی۔آج نہیں تو کل حامد کو واپس تو آنا ہی تھا۔اسے گئے دس دن ہو چکے تھے پھر کیا ہوگا؟ جس قدر شاہجہاں زخمی ہوا تھا، وہ تو اپنا درد نہیں بھولنے والا تھا۔

گاڑی پمز پہنچی تو رُکتے ہی وہ برق سی تیزی سے اُتری۔عمارت میں داخل ہونے تک وہ تقریباً بھاگتی رہی، رسپشن پہ آ کے اِس شاہ جہاں کا پوچھا تو اسے نرس نے فوراً بتا دیا کہ وہ اِس وقت ڈاکٹر عطا کے کمرے میں ہے۔

ڈاکٹر عطا سے وہ ایک دو بار مل چکی تھی۔ان کا آفس تیسری منزل پر تھا۔وہ لفٹ کی طرف بڑھی لیکن وہاں لاتعداد مریض، نرسیں اور وہیل چیئرز انتظار کر رہی تھیں۔اس نے پلٹ کر سیڑھیوں کی راہ لی۔

ایک کے بعد ایک سیڑھی پھلانگتی وہ تیسری منزل تک پہنچی تو سانس بالکل رُک رہا تھا۔ریلنگ کو پکڑے وہ گھٹنوں پر ہلکی ہلکی کانپ رہی تھی۔راہداری میں سے گزرتے لوگوں اور نرسز نے رُک کر اُس کا حال پوچھا لیکن وہ کیا بتاتی کہ یہ عمر کا تقاضا ہے۔وہ پینتیس سال کی تھی، بیس سال کی نہیں جو پھرتی سے سیڑھیاں چڑھتی پھرتی۔

وہ بمشکل ڈاکٹر عطا کے کمرے میں آئی۔دروازے کے ناب کو گھما کر اندر داخل ہوئی تو

سامنے ہی آرام دہ صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے شاہ جہاں کو دیکھا۔اس نے دروازے کی آواز سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''شکر ہے تم یہاں ہو۔ مجھے لگا تھا تم جا چکے ہو گے۔آخر میرا کوئی حکم تم مان جو نہیں سکتے۔'' ہلکے شکوے، ہلکے دوستانے آواز میں کہتے ہوئے اُس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

''لگتا ہے بھاگ کر آئی ہو۔''اس نے فون جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔''جاگرز پہنے ہیں۔''

''ہاں تو.....''اس نے پرس ڈاکٹر کی ٹیبل پر ایک طرف ڈال دیا اور بالوں میں اُنگلیاں ڈال کر خود کو کمپوز کرنے لگی۔اُس کا سانس زیر و بم میں تھا۔

شاہجہاں نے ایک نظر اُسے دیکھا پھر گھڑی کو۔

''جو کہنا ہے جلدی کہو۔ مجھے کہیں جانا ہے۔''

وہ پلٹی۔''بیٹھے تو تم پرسکون ہو۔''اس نے پھبتی سی اُڑائی پھر قدم قدم چل کر اُس کے پاس آئی۔''پٹی اُتر گئی۔ چوٹ کیسی ہے؟''اس نے شاہجہاں کے بال چھونا چاہے تو اس نے فوراً کلائی پکڑ کر جھٹک دی۔

''ہاتھ نہ چلاؤ زیادہ۔جو بات کرنی ہے وہ کرو۔''وہ خشک لہجے میں بولا۔

وہ زخمی سی مسکرائی۔''ٹھیک ہے۔''پیچھے ہوئی، میز کے ساتھ پڑا لوہے کا اسٹول قریب کیا اور اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔شاہجہاں نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے تھے۔وہ آج بھوری ٹی شرٹ اور کریم رنگ کی پینٹ میں ملبوس تھا۔بال پٹی اترنے کے باعث ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔

''میں جو کہنے جا رہی ہوں۔آئی تو تمہیں غصہ دلائے گا لیکن میں یقین سے کہتی ہوں کہ

میں اس کے پیچھے نہیں تھی۔ میرا ذرا ہاتھ نہیں۔'' وہ تمہید باندھتی ہوئی اپنی صفائی دے رہی تھی۔
''اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ سب ہونے والا ہے تو میں ایسا کبھی نہ ہونے دیتی۔ یقین کرو میرا۔ میں نے تمہارے ساتھ وقت گزارا ہے میں جانتی ہوں تمہیں۔''
''اوہ حمنہ..... تم مجھے نہیں جانتیں.....'' وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ حمنہ کی آنکھوں میں اُس کے چہرے کی اُداس اور کربناک ہنسی گھومنے لگی جسے اُس نے آنکھوں کی افسردگی میں دفنا دیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا گھٹنا چھوا۔
''جتنا جانتی ہوں شاہ..... اُسی بنیاد پر کہہ رہی ہوں۔''
''تم مجھے اس نام سے بلانا بند کرو گی؟'' وہ تلخ ہوا۔
حمنہ نے ہاتھ پیچھے کر دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ نہیں بلاتی لیکن شاہجہاں..... آئی نو کسی پر بھی اتنا بھیانک حملہ ہو جائے تو وہ اپنے حملہ آوروں کو معاف نہیں کرتا۔ تمہیں بھی نہیں کرنا چاہیے لیکن کیا تم اُسے موقع دے سکتے ہو۔'' اُس نے التجائی نظروں سے اُسے دیکھا۔
''کسے؟''
''حامد.....'' وہ روہانسی ہوئی۔ ''اس نے غصے میں آ کر تم پر حملہ کرایا ہے۔ وہ بس تمہیں سبق سکھانا چاہتا تھا اور کچھ نہیں.....''
شاہجہاں نے سینے سے ہاتھ ہٹائے، ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی۔
''کیا کہا؟ دوبارہ کہو۔''
حمنہ اُس کے انداز کو دیکھ کے لمحے لیے گھبرا گئی پھر اس نے ہمت کی۔
''یہی کہ..... اس نے تم پر غصے میں حملہ کیا ہے۔''
''مجھ پر حملہ حامد نے کرایا ہے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''تم ایسے کیوں چونک رہے ہو۔ غنڈوں نے بتایا نہیں؟'' اس نے اجڈ پنے سے پوچھا۔

''نہیں۔ یہ خلاصہ تم کر رہی ہو۔'' وہ یکدم بگڑ کے بولا۔

حمنہ کے پیروں تلے بارودی سرنگ پھٹی۔

''تمہیں..... غنڈوں نے..... تم لوگوں نے..... شٹ..... شٹ.....'' وہ کھڑی ہو کر بال نوچنے لگی۔ شاہجہاں بھی ساتھ کھڑا ہوا۔ دونوں کے چہروں پر بے یقینی تھی۔ شاہجہاں حیران تھا کہ یہ حامد نے کرایا ہے۔ حمنہ پچھتا رہی تھی کہ اُس نے پول کیوں کھول دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور تب ہی شاہجہاں نے اس کے بازو میں انگلیاں گھساتے ہوئے قریب کھینچا۔

''تو تم اب یہ کرو گی؟ طلاق نہیں لے سکتیں تو خود کو بیوہ کرو گی؟''

''نہیں نہیں۔'' وہ یکدم بوکھلا گئی۔ ''تم..... تم غلط سمجھ رہے ہو۔''

''تو صحیح کیا ہے حمنہ عرفان؟ مجھ پہ حملہ مزے میں کرایا ہے تم نے؟'' اس نے گرفت مزید سخت کی۔ حمنہ کے دل تک ٹیس پہنچی۔ گوشت اُس کی انگلیوں کے نیچے پگھلا جا رہا تھا۔

''دیکھو شاہجہاں.....'' اس کی آنکھوں میں آنسو در آئے۔ ''میں نے نہیں کرایا۔ حامد نے مجھے بتائے بغیر کرایا ہے اور صرف..... صرف تمہیں ڈرانا تھا..... اس کا تمہیں مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا.....''

''ڈرانا؟ تمہیں لگتا ہے وہ دو چٹکیوں کا آدمی مجھے ڈرا سکتا ہے؟''

''آئی ایم سوری.....'' وہ رو پڑی۔ ''میں اُس کی طرف سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ اسے معاف کر دو۔ وہ دوبارہ نہیں کرے گا۔ میں اسے سمجھا دیتی اگر وہ مجھ سے ذرا سا بھی..... کیا تم میرا بازو چھوڑ سکتے ہو؟'' سلاست سے کہتی وہ ہمت ہار گئی۔ شاہجہاں یکدم جیسے خواب

سے چونکا تھا اور اسے احساس ہوا کہ واقعی حمنہ کی ہڈی تک درد گیا تھا۔

اس نے بازو چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے گوشت سہلانے لگی۔

''حامد نے بے وقوفی کی ہے۔ میں جانتی ہوں۔ تم اُسے کچھ نہ کہنا۔ پلیز.....''

''ہونہہ..... پلیز..... یونو مس عرفان.....'' کچکچا کے کہتا وہ ذرا قریب ہوا۔ ''تم وہی آدمی deserve کرتی ہو۔ کاہل، پیٹھ پہ وار کرنے والا۔ ایک بزدل اور احمق انسان.....''

حمنہ کے دل پر چھریاں چلیں۔

''وہ ترکی میں ہے ناں؟'' اس نے یکدم پوچھا۔

''تم اسے کچھ نہیں کرو گے.....'' اس نے انتباہ کیا۔

''محترمہ وہ ترکی گیا ہی نہیں ہے۔ پاکستان میں ہے۔ اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔''

حمنہ کے جبڑے سمٹ گئے۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

شاہ جہاں ہنس پڑا۔ ''ٹھیک ہے۔ جا کے چیک کر لو اُس کے گھر میں، وہ اُدھر ہی ہے۔ وہ تمہیں ایک فیک تصویر بھیج کر یہ یقین دلا چکا ہے کہ وہ ترکی میں ہے حالانکہ میں نے خود دو دن پہلے اُسے جی سیون میں دیکھا تھا۔''

''جھوٹ ہے.....'' آنسوؤں سے لبالب آنکھوں سے وہ شاہجہاں کو دیکھ رہی تھی۔

''گڈ فار یو لیکن میرا درد سر یہ نہیں ہے۔ میرا درد سر یہ ہے کہ جب تک وہ مجھ سے معافی نہیں مانگ لیتا۔ میں اُسے معاف نہیں کروں گا۔ تو ایک کام کرو ڈیئر فور سڈ وائف.....'' چبا چبا کے کہتا وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ''اُس سے کہو مجھ سے معافی مانگے۔ اگر اُس نے نہیں مانگی تو اگلی گرفتاری..... اُس کی ہوگی۔''

حمنہ کا سانس رُک چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کے اور حامد کے تعلقات سے شاہجہاں

اچھی طرح واقف تھا اور جس طرح اُس نے جان بوجھ کر شاہجہاں کو جلانے کے لیے حامد سے تعلقات رکھے تھے، ایک شوہر ہونے کے ناتے، وہ اس طرح، ایک اچھا بدلہ لے سکتا تھا۔ حامد کی گرفتاری ایک ڈی سی کی گرفتاری تھی اور نہ صرف اُس کی ذاتی عزت جا سکتی تھی بلکہ کریئر بھی جا سکتا تھا اور اتنا علم تو اسے بھی تھا کہ حامد اسے چھوڑ سکتا ہے، جاب نہیں چھوڑ سکتا۔

☆.....☆.....☆

جانے کتنے تھکن سے اِس نے حامد کے گھر کی بیل بجائی تھی۔ بالوں اور میک اپ کی طرح جسم بھی بکھرا ہوا تھا۔ وہ جس کی حفاظت کے لیے ماری ماری پھر رہی تھی۔ وہ اسے کتنا بڑا دھوکا دیے بیٹھا تھا۔ اس کا دل چھریوں سے کٹ رہا تھا۔ اعصاب بے حد بوجھل تھے۔

اسی لمحے دروازے کے پیچھے قدموں کی آواز آئی..... وہ سن سکتی تھی، یہ قدم..... یہ چاپ پھر دراز ے کا لاک ''click'' ہوا..... یہ آواز بھی..... پھر ناب گھوما..... یہ آواز بھی..... پھر دروازہ چوکھٹ سے الگ ہوا اور.....

وہ سامنے کھڑا تھا۔

ننگے پیروں سے اُس کی نگاہ اُس کی منہ تک گئی جس میں برش پکڑا ہوا تھا۔ ٹوتھ پیسٹ کا جھاگ ہونٹوں اور دانتوں پر لگا تھا۔ وہ دانت صاف کر رہا تھا۔ ☆

''تت..... تم؟'' وہ ہکلایا تو ذرا سی جھاگ باہر اُچھلی۔ اس نے فوراً آستین سے ہونٹ پونچھے۔

''خوش آمدید..... نہیں۔ خوش آمدید تو آنے والوں کو کہا جاتا ہے۔ تم تو گئے ہی نہیں تھے۔ ہے ناں؟'' تول تول کے کہتی وہ اُسے طنزیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

حامد کے جبڑے سمٹ گئے۔ حمنہ نے بے زاری سے اُسے ہلکا سا دھکا دیا اور اندر چلی آئی۔ صوفے پر پرس پھینکتے ہی وہ کچن کی طرف بڑھی۔ ذرا جھک کے فریج کا دروازہ کھولا، پانی

کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ حامد دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

بوتل اٹھاتے ہی اُس کی نگاہ فریج میں پڑی چیزوں پر گئی جن کو دیکھ کے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کھانا اسٹور کیا گیا ہے۔ اس نے گہرا سانس لیا اور سیدھی ہو کر بوتل کھول لی۔ جب تک وہ پانی پیتی، حامد نے سنک میں کلی کی، منھ صاف کیا۔

''listen.....'' وہ تیزی سے قریب آیا۔

حمنہ نے ایک زوردار چماٹ اُس کے چہرے پر ماری۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔

''lier.....'' وہ پھنکاری جب کہ وہ گال پر ہاتھ رکھے، بے یقینی سے اِسے دیکھ رہا تھا۔

''میں تمہاری سیکیورٹی کے لیے لور لور پھر رہی ہوں۔ ایک ایک کی منتیں کر رہی ہوں اور تم.....تم جھوٹے مکار آدمی.....'' وہ قریب آئی، اُس کے کالر پکڑے۔ ''تم مجھے بہلا پھسلا کر اِدھر ہی بیٹھے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ کیوں جھوٹ بولا مجھ سے ہاں؟''

حامد کے تیوری چڑھ گئی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے حمنہ کی کلائیاں پکڑ لیں۔ ''حد میں رہو.....''

''کیوں رہوں؟ میں نے تم پہ اعتبار کیا اور تم نے؟ کیا کرتے رہے ہو تم یہاں پہ؟ کون آتا رہا ہے تمہاری سہولت کے لیے؟ کوئی اور لڑکی ہے ناں؟'' اس نے ہاتھ چھڑائے اور حواس باختہ انداز میں فلیٹ کا جائزہ لینے لگی۔

''کہاں ہے۔ کدھر چھپائی ہے۔ میں دس دن نہیں آئی تمہارے پاس، کسی کو تو رکھا ہوگا نہ تم نے.....کہاں ہے۔ نکلو باہر، تم جو بھی ہو.....باہر آؤ.....'' ہذیانی انداز میں چیختی وہ کمرے میں آئی اور بستر، تکیوں کو دیکھا۔ وہ سیٹ تھے۔ وہ اسی طرح واشروم گئی۔ وہ بھی درست تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے الماریاں کھولیں۔ پٹ ٹک ٹک بجنے لگے۔

''تم کیا کر رہی ہو۔ ہوش میں ہو۔ کوئی بھی نہیں ہے۔''

''پھر کس ماں کے لیے جھوٹ بولا ہے تم نے مجھ سے؟'' وہ الماری کو زور سے بند کرتی اُس کی طرف آئی۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا پاگل ہوگئی ہو۔

''کسی کے لیے بھی نہیں۔ اس وقت کوئی فلائٹ نہیں ملی مجھے۔ اس لیے واپس آ گیا۔''

''میں نے کیا کہا تھا؟ کہاں چلے جانا؟ شہر سے باہر جانے کا کہا تھا ناں۔ کیوں نہیں گئے ہاں؟''

''میں ایک لڑکا نہیں ہوں حمنہ۔ ایک آفیسر ہوں۔ میری جاب ہے۔ کام ہوتا ہے مجھے۔ یوں آناً فاناً میں ملک چھوڑ کر چلا جاتا ہے؟''

''نہیں جا سکتے تھے تو پھر pretend کیوں کیا؟ مجھے کیوں کہا کہ جا رہے ہو؟''

''صرف تمہیں تسلی دینی تھی تاکہ تم پریشان نہ ہوں۔ اس لیے۔''

''جھوٹ مت بولو مجھ سے.....'' وہ سرخ آنکھوں سے غرائی۔ ''تم نے میرا مان توڑا ہے۔ میرا اعتبار۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ کم آن.....''

''جھوٹے ہو، مکار، فریبی، دھوکے باز۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

حامد نے گہرا سانس لے کر خود کو معتدل کیا۔

''دیکھو حمنہ..... میں نے جھوٹ نہیں بولا تم سے۔ میری جاب کی نوعیت ایسی نہیں کہ میں جھٹ پٹ ملک چھوڑ دوں۔ میں ایک سرکاری آفسر ہوں۔ میں نے صرف تمہیں پرسکون رکھنے کے لیے ایسا کیا۔''

''تم نے جھوٹ بولا ہے۔ ٹھیک کہتا ہے شاہجہاں۔ میں تم جیسا کاہل، احمق اور بزدل

انسان ہی deserve کرتی ہوں۔ یہ میری کم نصیبی ہے کہ مجھے کوئی مرد ایسا نہیں ملتا جس میں مردانگی ہو۔"

"کیا کہا؟" حامد کی پیشانی پر بل پڑے۔

"جو تم نے سُنا۔ تم بھی ایک جھوٹے اور فریبی ہو۔ ٹاکسک مرد۔"

"toxic....." حامد نے طنز سے ہنکار بھرا۔ "یونو وہاٹ حمنہ آلو یو سو مچ۔ آئی مین اٹ لیکن تم جیسی عورتیں ہر چلتے پھرتے مرد کو ٹاکسک بول سکتی ہیں پتا ہے کیوں؟ کیوں کہ تم لوگ خود ترسی کا شکار ہو۔ اپنی ذات کی ستائی ہوئی ہو، اس لیے ہر مرد ٹاکسک لگتا ہے۔ خود سے نکلو گی، اپنی زہر کی بھرمار دیکھو گی تب معلوم ہوگا کہ ٹاکسک مرد کیا ہوتا ہے۔"

"مجھ جیسی عورتیں....." وہ احمقانہ انداز میں ہنس پڑی۔ "صحیح کہا۔ میں ہی ٹاکسک ہوں۔ تو ایک کام کرتے ہیں۔ الگ ہو جاتے ہیں۔ کیا خیال ہے۔ تمہیں مجھ جیسی ٹاکسک لڑکی کے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔ ہے ناں؟"

"یہی مسئلہ ہے تمہارا۔ جذباتی ہو جاتی ہو۔ ذرا سی عزت نفس مجروح ہو جائے، رشتے توڑنے پر آجاتی ہو۔"

"تو ٹھیک ہے ناں۔ lets break up....." وہ کمال سہولت سے بولی۔ "نہیں رہ سکتے تو الگ ہو جاتے ہیں۔"

"بند کرو بکواس، بس بہت ہو گیا۔" حامد کا ضبط ٹوٹا۔

"بکواس نہیں ہے یہ۔ تم میرے لائق ہی نہیں ہو۔ جھوٹے فریبی اور احمق ہو تم....."

"مجھے کو سنا بند کرو۔" وہ غصے سے کانپا۔

"کیا کر لو گے؟ ہاں۔ بریک اپ تو کر نہیں سکتے۔ مفت میں جسم جو مل رہا ہے۔ کیوں کرو

گے تم۔ ہاں.....''

''میں کر سکتا ہوں۔ مجھے گھنٹہ فرق نہیں پڑے گا۔'' وہ دہشت ناک لہجے میں بولا۔

''تو کرو ناں۔ کس نے روکا ہے تمہیں۔ کرو بریک اپ.....''

''یہ آخری فیصلہ ہے؟'' اس نے بے لچک لہجے میں پوچھا۔

''ہاں.....''

''او کے۔ لیٹس بریک اپ.....'' حامد نے پرسکون انداز میں کہا۔ ''اس فلیٹ میں موجود اپنا سارا سامان لے جائیں مسز شاہجہاں اور دوبارہ مجھے شکل مت دکھایئے گا اپنی ورنہ نوچ ڈالے گا یہ احمق، کاہل اور بزدل آدمی.....'' زہر سے پھنکارتا وہ اس پر ایک کراہت بھری نظر ڈالتا واش روم میں گھس گیا۔

اُس کا سر گھوم رہا تھا۔ آہستہ سے وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جسم سے جان نکل رہی ہو۔

☆.....☆.....☆

سامان لیے جب وہ گھر آئی تو لاؤنج میں عفت بیگم نے اُسے روک لیا۔

''کہاں گئی تھیں؟ زید پوچھ رہا تھا۔'' انھوں نے سامان کو سرسری نظر سے دیکھا۔

''جہنم میں گئی تھی۔ اُسے جانا ہے تو وہ بھی جا سکتا ہے۔'' رکھائی سے جواب دیتی وہ بغیر رُکے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اپنے پیچھے دروازہ کسی دھماکے سے بند کیا۔ پرس فرش پہ پھینکنے کے بعد وہ بستر پر اوندھی گر گئی اور رونے لگی۔ جتنی زور سے، جتنی ہچکیوں سے وہ رو سکتی تھی۔ وہ روئی۔

عفت بیگم نے دروازے پہ آ کے اُس سے مخاطب کرنا چاہا لیکن وہ دستک نہیں دے سکیں

کیوں کہ اندر سے اُس کے زار و قطار رونے کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً وہ شاہجہاں سے بھڑ کے آئی ہوگی یا پھر اُس حامد ذلیل سے گھپلا ہوا ہوگا۔ اور یہ کونسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ وہ جب بھی کسی سے لڑ کے آتی، اسی طرح دروازہ بند کر کے کئی گھنٹوں تک روتی رہتی پھر خود ہی ٹھیک ٹھاک ہو کر شام میں نکل آتی تھی۔ آج بھی نکل ہی آئے گی۔

انھوں نے سانس نکالا اور الٹے قدموں پلٹ گئیں۔

☆.....☆.....☆

وہ، عمران اور عرفان صاحب سلیمان صاحب اور طاہرہ بیگم کے کمرے میں موجود تھے۔ شاہجہاں سلیمان صاحب کے پاس بیٹھا، اُنھیں غنڈوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ پولیس کے معاملات عمران نے دیکھے تھے، وہ جان گیا تھا کہ حامد نے سب کرایا ہے۔ وہ اپنی بہن کو روک نہیں سکتا تھا لیکن اپنے بہنوئی کی عزت کو خاک میں ملانے سے بچا سکتا تھا۔

اس لیے اُس نے عرفان صاحب کو شامل مدعا کیا اور دونوں شاہجہاں کے ساتھ مل کر حویلی چلے آئے تا کہ یہ معاملہ مزید نہ بگڑے اور سچائی معلوم ہونے پر حمنہ کے کردار پر کوئی حرف آئے۔

''تو تم کہنا چاہتے ہو غنڈوں نے تمہیں کوئی اور سمجھ کے حملہ کیا تھا؟'' سلیمان صاحب نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا لیکن فی الوقت یہ معاملہ اس کے ازدواج کا تھا۔

''ہاں بابا۔ ایسا ہی ہوا ہے۔ اُن کو جس بندے کے لیے بھیجا گیا تھا وہ میں نہیں تھا، کوئی اور تھا۔ اُنھیں اندھیرے میں غلط فہمی ہوگئی۔ ایسا انھوں نے خود پولیس اسٹیشن میں اعتراف کیا ہے۔'' اس نے ایک اور جھوٹ گھڑا۔ طاہرہ بیگم کی پیشانی پر بل تھے جب کہ سلیمان صاحب

کی شکیہ نظریں اُس کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں۔

عرفان اور عمران نے البتہ ندامت سے سر جھکایا ہوا تھا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو شاہجہاں؟''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا بابا.....'' اس نے زبان کی لڑکھڑاہٹ پہ قابو پایا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ کوئی مجھ پر حملہ آور کیوں ہوگا۔ آپ خود سوچیں۔''

''لیکن بیٹا..... اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو؟ تب بھی وہ موالی یہی کہتے؟'' طاہرہ بیگم رکھائی سے بولیں۔

''ماما..... وہ جس کو بھی مارنے آئے تھے، اُس کو صرف زخمی کرنے کی نیت تھی۔ اُنھیں مجھ پہ شک ہوا تو انھوں نے غلط فہمی میں مجھے مارا۔ وہ کسی اور کو.....''

''کس کو؟'' سلیمان صاحب نے درشتی سے پوچھا۔

''جی؟ کیا ہوا بابا؟''

''میں پوچھ رہا ہوں۔ دوسرا کس کو مارنے آئے تھے؟'' انھوں نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔ شاہجہاں ایک لمحے کشمکش کا شکار ہوا، اس نے گڑبڑا کر عمران کو دیکھا جس پر سلیمان صاحب کی پیشانی تن گئی۔

''وہاں کیوں دیکھ رہے ہو۔ ہمیں جواب دو۔''

''وہ جو نیا منیجر آیا ہے ناں تایا۔ وہ لمبا سا آدمی جسے دو مہینے پہلے ہائیر کیا تھا۔ اُس کا جھگڑا ہوا تھا مال میں کسی سے۔ اس بندے نے پھر غنڈے..... بھجوائے..... اور.....''

''لیکن وہ تو شاہجہاں سے کئی انچ لمبا ہے عمران۔''

''بابا تو کونسا اُس کو منیجر کا مجسمہ دکھایا گیا ہوگا یا انچی ٹیپ دے کر ناپا گیا ہوگا یہ اونچائی ہے، یہ چوڑائی ہے۔'' وہ جھنجھلا کر بولا۔ سلیمان صاحب نے پتلیاں سکوڑیں۔

''تم کیوں بگڑ رہے ہو؟ میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔''

''بابا..... تصویر دکھائی گئی ہوگی اُس کو اور تصویر میں کسی کے قد کاٹھ کا کیا پتا لگ سکتا ہے۔'' وہ اُکتاہٹ سے کہتے ہوئے سر جھٹکنے لگا۔ سلیمان نے بے زاری سے سانس نکالا۔

''المیہ ہے یہ بھی۔ کل کو کسی کو مار دیں گے پھر کہیں گے پہچانا نہیں ہم نے.....''

''امی بابا..... آپ مجھ پہ چھوڑ دیں یہ سب..... اب میں ٹھیک ہو گیا ہوں تو میں خود ہی دیکھ لوں گا سب کو۔ اُن کو اُن کے کیے کی سزا ضرور ملے گی، اس کا بھروسہ رکھیں مجھ پر۔ میں نے گارڈز بھی رکھوائے ہیں اپنے لیے اور پارکنگ کی سیکیورٹی بھی بڑھا دی ہے۔ ایسا دوبارہ نہیں ہوگا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔''

''مجھے تو یہ جان کر تسلی ہو رہی ہے کہ تمہارا کوئی خفیہ دُشمن نہیں ہے۔ اگر کوئی نکل آتا تو پھر مشکل ہوتی۔ اللہ نے تمہیں رکھ لیا۔ اللہ تیرا شکر۔'' طاہرہ بیگم نے ممونیت بھرا سانس لیا۔

''اگر نکل بھی آتا تو کیا..... مجھ سے پنگا اُسے تباہ کر دیتا۔ میری آل اولاد پر کوئی حملہ کرائے اور میں چھوڑ دوں۔ میں ریٹائر ہوا ہوں۔ مرا نہیں ہوں۔'' سلیمان صاحب نے اشتعال سے جتایا۔ شاہجہاں نے اُن کی آنکھوں میں پپتا کی تڑپ دیکھی تھی۔ ایک ایسے مرد کا عکس جو فیملی کے لیے برگد کے پیڑ جیسا ہوتا ہے۔

اس نے اپنائیت سے اُن کا ہاتھ دبا دیا۔

☆.....☆.....☆

جب وہ باہر نکلا تو عمران اور عرفان بھی عقب میں تھے۔ وہ تیز تیز چل رہا تھا۔

''اپنی بہن کو آسان لفظوں میں سمجھا دینا کہ اپنے حرکتیں ٹھیک کر لے۔ اُس نے مجھ بہت کمزور سمجھا ہوا ہے۔ میں چپ ہوں کیوں کہ وہ میرے بچے کی ماں ہے لیکن.....'' چلتے چلتے وہ رُکا۔ عمران بھی ساتھ ٹھہر گیا۔ وہ ذرا سا اُس کی طرف مڑا۔ آنکھوں میں انتباہ تھی۔

''میں اپنی کرنی پہ آیا تو تم، تمہارا باپ اُسے تباہی سے بچا نہیں پاؤ گے۔ اُسے کہو، شاہجہاں کا صبر نہ آزمائے ورنہ تباہی صرف اُس کے حصے میں آئے گی..... سمجھ گئے؟''

عمران نے بودہ سا سر ہلا دیا۔

اس نے کوٹ کے بٹن بند کیے اور پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا راہداری میں آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز سے اُس نے آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے زخم پوری طرح تندرست نہیں ہوئے تھے لیکن وہ زیادہ دیر تک آرام کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ آرام دماغ اور جسم کو ناکارہ کر دیتا ہے۔

جب غزارا نہیں ہوتی تھی تب اس کے لیے حویلی میں گھنٹہ بھر ٹھہرنا بھی جان جوکھوں کا کھیل تھا لیکن یہ گیارہ دن اُس نے کمال سہولت سے گزارے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اُکتایا تھا نہ گھبراہٹ کا شکار ہوا تھا۔

آج اتنے دنوں بعد آفس آ کے اِسے سکون ملا تھا۔ جسم اپنی پہلی سی روٹین میں واپس جا کے شانت ہو جایا کرتا ہے۔ جیسے اس کا ہوا تھا۔ اپنی سربراہی نشست پر براجمان وہ لیپ ٹاپ کھولے، گیارہ دن کے تمام معاملات کا جائزہ لے رہا تھا۔ منیجر، سیکرٹری، سٹاف ہیڈ ہر دوسرا افسر صبح سے بریفنگ دینے کے لیے اُس کے آفس کے چکر لگا رہا تھا۔

ایک بجے تک وہ بے حد مصروف رہا، اس کے بعد اس نے بریک لیا اور کھانا کھانے لگا۔

شیشے کے پاس اس کی تپائی تھی، دو کرسیوں والی تپائی جس پر کھانا دھرا تھا۔ وہ چھری کانٹے سے اسٹیک توڑ رہا تھا جب سیکرٹری اندر آیا۔

''سر.....'' اس نے ادب سے مخاطب کیا۔ ''کوئی حامد صاحب ملنے آئے ہیں آپ سے.....''

''حامد.....'' وہ کچھ ٹھٹکا لیکن جلد ہی یاد آ گیا۔ ''بھیج دو اندر.....''

سیکرٹری سر ہلاتا ہوا پلٹ گیا۔

یعنی مس حمنہ عرفان نے بروقت راضی کر لیا تھا، اپنے بوائے فرینڈ کو..... اُس نے محظوظ انداز میں سوچا۔ کچھ دیر گزری تھی جب آفس کا دروازہ کھلا اور حامد اندر آیا۔

شاہجہاں نے پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا۔ حامد پُراعتماد انداز میں کھڑا تھا۔ سیاہ پینٹ اور نیلی شرٹ پہنے، آستین فولڈ کیے۔ بال نفاست سے سجائے وہ سنجیدہ نظروں سے اِسے دیکھ رہا تھا۔ وہ قابلِ رشک تھا۔ شاہجہاں نے اعتراف کیا۔

حامد اسی طرح قدم اٹھائے آگے آیا اور تپائی کی دوسری کرسی کھینچ لی۔ حالانکہ شاہجہاں نے اُسے بیٹھنے کا نہیں کہا تھا۔

''کھانا کھاؤ.....'' اُس نے پیشکش کی۔

''نہیں۔ شکریہ۔ میں کھا کر آیا ہوں۔'' اُس نے ہاتھ جھلا کر منع کیا۔

آج وہ پہلی بار شاہجہاں کو براہِ راست دیکھ رہا تھا۔ اس سے قبل اس نے شاہجہاں کو جہاں دور سے دیکھا تھا یا پھر تصویروں میں یا پھر حمنہ کے تلخ تبصروں میں۔ یہ آدمی خوبصورت تو نہیں تھا نہ ہی اس میں کوئی قابلِ رشک بات تھی لیکن پھر بھی، کچھ تھا جو اسے شاہجہاں کے مقابلے کمزور بنا رہا تھا۔ اُس کی شخصیت کا سحر تھا یا پھر اُس کے مزاج کا عکس، کچھ تھا جو اسے اس آدمی

میں عجیب لگا تھا۔

''آفس اچھا ہے آپ کا.....'' کچھ دیر بعد اس نے توصیفی انداز میں تبصرہ کیا۔

''شکریہ.....'' اس نے سر نیہوڑا۔ وہ گداز کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ مارگلہ کی پہاڑیاں دھوپ میں سِک رہی تھیں، فضاؤں سے دھند چھٹ چکی تھی، برگ و بار نکھرے ہوئے لگ رہے تھے۔

''مسٹر شاہجہاں.....'' حامد نے گلا کھنکھار کر کہنا شروع کیا۔ ''میں نے جو کیا، میں اُس کے لیے شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بغض اور عداوت اپنی جگہ لیکن اس سطح تک نہیں گرنا چاہیے تھا مجھے۔ آئی نو..... بڑی دیر سے مجھے ریلائز ہوا لیکن..... میں..... میں دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے غلط کیا.....''

شاہجہاں نے پانی کا گلاس اٹھایا، چند گھونٹ لیے۔

''میں مزاجاً ایسا نہیں ہوں لیکن مجھے غصہ آ گیا تھا۔ شاید میں..... میں کچھ زیادہ ہی بہک گیا تھا۔'' وہ ندامت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ شاہجہاں نے سوچا کہ لوگ کبھی سیدھی سیدھی معافی نہیں مانگتے، ہمیشہ اپنے فعل کی وضاحتیں دیتے ہیں اور اپنی غلطیوں کو جسٹیفائی کرتے ہیں۔

''ایک بات پوچھوں؟'' اس نے کہا۔

''پوچھیں ناں.....'' وہ بے تکلف سا ہوا۔

''کیا.....'' شاہجہاں نے سٹیک پر چھری رگڑنا شروع کی۔ ''کسی کی محبت تمہیں، کسی کی جان لینے کے لیے مجبور کر سکتی ہے؟''

حامد کی مسکراہٹ بھک سے غائب ہوئی۔

"کیا مطلب؟" خوفزدہ سا وہ کرسی پر سیدھا ہوا۔ شاہجہاں نے کاٹا ہوا ٹکڑا منہ میں رکھا اور چبانے لگا۔

"محبتیں....." نوالہ منہ میں روک کے اُس نے کہا۔ "کسی کی جان آسانی سے لے سکتی ہیں لیکن..... یہ معلوم کرنا بے حد مشکل ہے کہ کب محبت کے لیے جان لی جا رہی ہے اور کب ذاتی بغض کے لیے....."

حامد نے خشک گلا تر کیا۔ آنکھوں میں عجب سا خوف تھا۔

"تم ایک کسان کے بیٹے ہو۔ پرائمری تک گاؤں کے اسکول میں پڑھا۔ مڈل اور سیکنڈری کے لیے شہر آئے، یہاں ماموں کے یہاں رہے۔ ظالم ممانی سارے کام کرواتیں، اپنے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھواتیں تم سے۔ تمہارا باپ اُنھیں پیسے اور غلہ بھیج بھیج کے تھک جاتا لیکن اُن کی ڈیمانڈ ختم نہیں ہوتی تھی۔"

وہ کہہ رہا تھا جب کہ حامد سانس روکے سن رہا تھا۔

"پھر جیسے تیسے کر کے تم نے میٹرک پاس کیا اور ماموں کے گھر سے نکل کر کالج کے ہاسٹل میں پناہ لی۔ ماسٹرز تک تم چھ سال ہاسٹل میں رہے پھر سی ایس ایس کی تیاری کی۔ دو بار رہ گئے، تیسری بار اپنی محنت، اپنے بل بوتے پر آفسر بنے..... تمہارا باپ تب تک مر چکا تھا۔ ماں تو پہلے ہی نہیں تھی۔ چار بہنیں بیاہی تم نے۔ دو بھائی تا حال لاہور میں زیر تعلیم ہیں۔ اگر میں تمہاری زندگی پر نظر ڈالوں تو تم نے ایک practical زندگی گزاری ہے پھر کیا وجہ ہے حامد کہ تم نے اپنی ذاتی زندگی کو ایک واہمے اور ایک سراب کے لیے لگا دیا۔"

وہ یک ٹک بیٹھا تھا جیسے پتھر کا مجسمہ ہو۔

"حمنہ ایک شادی شدہ عورت، نو سالہ بچے کی ماں ہے۔ تم اٹھائیس سال کے لڑکے ہو، وہ

تم سے بڑی تھی اور پھر میں اسے طلاق بھی نہیں دینا چاہتا تھا لیکن پھر بھی تم اُس کے خواہاں تھے۔ ایک پریکٹیکل آدمی اس قدر کیسے بہک سکتا ہے میں سمجھ نہیں پا رہا۔'' وہ ہنس پڑا۔ حامد کو لگا سارا جہاں اُس پہ ہنس رہا تھا۔

''تم سوچ رہے ہو گے میں تمہارے بارے میں اتنا کیسے جانتا ہوں۔'' اس نے نظر حامد کے چہرے پر ڈالی جہاں بیک وقت کئی سوالات تھے۔ ''میں نے تمہاری ہسٹری نکلوائی تھی۔ آخر مجھے بھی تو جاننا تھا کہ میری بیوی کس کے ساتھ اپنی تنہائیاں بانٹتی ہے۔''

وہ اسی طرح مسکرا کے بولا۔ حامد کو محسوس ہوا، اس مسکراہٹ کے پیچھے ایک کرب بھی ہے۔ ایک شوہر کا کرب..... شاہجہاں نے برتن پیچھے دھکیلے، نیپ کن اٹھا کر ہونٹ صاف کیے۔

''تم میرے آفس آئے، تم نے معافی مانگی۔ اچھا کیا۔ ایک آفسر کو یہی زیب دیتا ہے کہ وہ سر اٹھائے بھی، سر جھکائے بھی۔ تم نے سر جھکا کر، اپنی غلطی کا اعتراف کیا، میں سر اٹھا کر تمہیں معاف کرتا ہوں۔''

وہ اسے تپانے والے انداز میں دیکھتا ہوا کھڑا ہوا۔

''یقیناً یہ ہماری آخری ملاقات تھی مسٹر حامد۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم سے مل کر اچھا لگا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے جو کہا، وہ سن کر مجھے بے حد اچھا لگا۔ اب میں چاہوں گا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور دوبارہ مجھے اپنی شکل نہ دکھاؤ۔'' اس نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے، ایسا کرنے سے کندھے اکڑ گئے اور اُس کی وجاہت مترشح ہوئی۔

حامد جو خاموشی سے سُن رہا تھا، دھیرے سے کھڑا ہوا۔ دونوں کا قد یکساں تھا۔ نہ انچ زیادہ، نہ کم۔ وہ برابری کی سطح پر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''شکریہ۔'' کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولا اور اسے دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا

لیکن جانے سے قبل وہ ٹھہرا، پلٹ کر اِسے دیکھا جو ہنوز پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اب میں سراب کے تعاقب میں نہیں بھاگ سکوں گا مسٹر شاہجہاں۔ میں آپ کی بیوی سے بریک اپ کر چکا ہوں۔''

شاہجہاں کے جبڑے سمٹ گئے۔ چہرے پر ایک رنگ سا گزر گیا۔ حامد اس کو الوداعیہ نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا جب کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ ذرا سی ہلنے کی طاقت بھی نہیں تھی اِس میں۔

☆.....☆.....☆

''کیا وجہ ہے حامد کہ تم نے اپنی ذاتی زندگی کو ایک واہمے اور ایک سراب کے لیے لگا دیا.....''

اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے، وہ مسلسل یہی سوچ رہا تھا۔ شاہجہاں کی باتیں بیک وقت نصیحت، کاٹ، ہمدردی، طنز اور دوستانہ انداز میں چوٹ کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک ایسی دوائی کی طرح جو کڑوی تو بہت تھی لیکن افادیت بخش تھی۔

فلیٹ پہنچ کر اس نے سیدھا کمرے کا رُخ کیا جہاں ایک میز پر اس نے کچھ شاپنگ بیگز رکھے تھے۔ یہ وہ سامان تھا جو حمنہ نے اسے دیا تھا۔ وہ اسے واپس کرنا چاہتا تھا۔ اگر کسی انسان کی یاد دماغ سے نکالنی ہو تو اُس سے وابستہ ہر چیز کو تلف کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس نے یہی سوچا اور فون نکال کر حمنہ کا نمبر ملایا۔ گھنٹیاں جا رہی تھیں، یعنی تا حال وہ بلاک نہیں ہوا تھا۔

آخری گھنٹی بعد کال اٹینڈ ہوئی۔

''مجھے تمہارا سامان واپس کرنا ہے۔ شام چھ بجے میں کورین ریستوران میں تمہارا انتظار

کروں گا۔ سامان لینے آجانا اور پلیز، جو میں نے دیا ہے وہ بھی واپس کر دینا۔"

اس نے رکھائی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

حمنہ جو دوسری طرف تاحال کمرے میں بند تھی، فون کو کان سے ہٹایا تھا۔ اسے شدید رونا آرہا تھا۔

☆.....☆.....☆

عفت پریشان تھی کہ حمنہ کمرے سے باہر کیوں نہیں آرہی۔ اسے چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ اتنی دیر بعد تو عبادہ سلیم بھی نکل آئی تھی۔ اسے آجانا چاہیے۔ کمرے کے باہر راہداری میں ٹہلتی، وہ اضطراب سے ناخن چبا رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ زید بھی تھا جو دروازے پر مسلسل دستک دے رہا تھا۔

"مام.....آپ ٹھیک ہیں؟ آنسرمی۔"

عرفان صاحب پیچھے صوفے پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ اُن کا بڑا بیٹا اور بہو بھی فاصلے سے کھڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی حمنہ کی گیلی آواز آئی تھی کہ وہ ٹھیک ہے لیکن زید کی بے چینی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

"مام.....آنسرمی۔ اوپن دی ڈور۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اسی اثنا حمنہ کا بڑا بھائی اُس کی سمت بڑھا اور اسے شانوں سے تھام لیا۔

"زید.....بیٹا چلو روم میں چلتے ہیں۔ وہ باہر آجائیں گی۔" اس نے اسے بہلاتے ہوئے کہا۔

"بٹ اُنھیں کیا ہوا ہے؟ کیا وہ مجھ سے ناراض ہیں؟" زید نے ہچکی لی پھر اپنے شانے چھڑا کر واپس دروازے کے پاس آیا اور سینے کے بل لیٹ کے دروازے کے نچلے درز سے اندر جھانکنے لگا۔

''مام..... سوری آئی ایم سوری..... پلیز باہر آجاؤ.....'' وہ اپنے ہاتھ کی ننھی انگلیاں درز سے اندر گھسا رہا تھا جو ناخن سے آگے نہیں جا رہی تھیں۔

عفت بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔ انھوں نے پلٹ کر اپنے شوہر کو دیکھا۔

''عرفان صاحب آپ دروازہ توڑ دیں۔ اُسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔ اتنی دیر تو کبھی نہیں لگاتی وہ۔''

''اچھا ہے ناں۔ ایک ہی دفعہ میں جان چھوٹ جائے ہماری۔'' رکھائی سے کہتے وہ تیز تیز قدم اٹھاتے وہاں سے چلے گئے۔ عفت بیگم دھکدھا گئیں، انھوں نے بیٹے کو دیکھا۔

''تم بھی یہی کہو گے؟''

''میں دیکھتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔'' وہ تسلی دیتا ہوا دروازے کی سمت بڑھا مگر اس سے پہلے کہ وہ ناک کرتا، دروازہ میں کلک کی آواز اُبھری اور پٹ چوکھٹ سے جدا ہوا۔ زید تیزی سے اٹھا کھڑا ہوا۔

''مام.....'' وہ چلایا اور برق سی تیزی سے حمنہ کے گلے جا لگا۔

وہ مجسمے کی طرح چوکھٹ میں ایستادہ تھی۔ چہرہ سپاٹ تھا، بالکل سپاٹ۔ آنکھیں بے حد سوجی ہوئی تھیں، حلقے یوں عریاں تھے جیسے سمو کی میک اپ تھوپا ہو۔ رف سی پینٹ پہ اُس نے کُرتا پہن رکھا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

''مام..... why did you locked yousrelf in room'' زید چہرہ اونچا کر کے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ عفت بیگم اُس کے قریب آئیں۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔'' وہ اسے رنجیدگی سے دیکھ رہی تھیں۔

''امی.....'' وہ خشک لہجے میں بولی۔ ''زید کا خیال رکھیں، میں آتی ہوں۔'' اور نرمی سے

زید کو خود سے الگ کر کے وہ راہداری میں آگے بڑھ گئی۔

''آخر کیا ہو جاتا ہے اس لڑکی کو؟'' انھوں نے تھکن سے تبصرہ کیا۔

☆.....☆.....☆

کورین ریستوران میں آج وہ گیارہ دن بعد آئی تو اسے حسبِ معمول بہت بھیڑ ملی۔ ہر کرسی بھری ہوئی تھی۔ آج وہ خود کھانا بنانے میں مشغول تھی۔ پاکستانی اور نیم پاکستانی بھی باقی شیف کے ساتھ اُس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ جو اس کے کھانے اور ریسپی کے مداح تھے، وہ کبھی کبھار اِس کو بلوا لیتے تصویر کھینچنے یا تعریف کرنے کے لیے اور وہ دوڑی دوڑی آجاتی۔ یہی کوریہ کی ثقافت ہے کہ پیشے کی جگہ پر سب سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔

حامد یہاں کئی بار آچکا تھا لیکن اکیلے۔ وہ اپنی مخصوص کونے والی کرسی پر براجمان ہوتا جس کے اِردگرد جوسیون (joseon) فنِ تعمیر کی عارضی دیواریں ایستادہ تھیں جیسے بدھ مت کے پیروکاروں کے محلوں میں چھوٹے چھوٹے دریچے بنے ہوتے تھے۔ سامنے کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے کچن تھا اور ویٹرز وہیں سے کھانا لے کر آتے تھے۔

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے وہاں تھا۔ ویٹر اُس کا آرڈر جو سوپ تھا، سرو کر کے جا چکے تھے۔ وہ تب سے اُسی کی سُڑکیاں لے رہا تھا۔ شاپنگ بیگز اِس نے کرسی کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

غزارا اس سے ایک نشست دور مہمانوں سے مل رہی تھی۔ حامد اس لڑکی کو ہمیشہ نوٹس کرتا تھا، یہ کورین تھی لیکن اس میں کچھ ایسا تھا جو اِسے محظوظ کرتا تھا۔ اُس کے بات کرنا کا انداز یا پھر اُس کی اتنی ملاوٹ وگھلاوٹ؟ وہ اُسے دیکھتے یہی سوچ رہا تھا کہ اسی کشمکش میں اِسے جمنہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ وسط میں کھڑے ہو کر اطراف میں طائرانہ نگاہ ڈال رہی تھی۔ اس نے ذرا سا ہاتھ اونچا کیا تو وہ اِسے دیکھ کے سیدھا اس طرف چلی آئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ

بیگ تھا جس کے اندر سے کپڑے اور سامان اُگل رہا تھا۔

''یہ لو.....'' اُس نے میز کے اوپر بیگ رکھا، اور جھک کے کرسی سے حامد کا لایا ہوا بیگ اٹھایا، تب ہی وہ رُک گئی۔ جب تک حامد بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ اسے دیکھنے لگی، حقارت سے..... پھر ذرا قریب آئی، اسی لمحے مہمانوں سے بات ختم کر کے غزارا اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تمہاری انگوٹھی.....'' اُس نے بائیں ہاتھ کی اُنگلی سے انگوٹھی نکالنے کی کوشش کی لیکن انگلی موٹی ہونے کے سبب وہ پھنس گئی۔ اس نے اذیت سے اُسے کھینچنے کی کوشش کی، تب ہی حامد نے ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کی انگلی پکڑ لی۔

''میں آپ کے لیے کچھ لاؤں سر.....'' غزارا نے جھانک کے کہا۔ اسی لمحے حمنہ پلٹی، وہ قریب کھڑی مسکرا کے دیکھ رہی تھی لیکن حمنہ..... مسکرا نہیں سکی۔ وہ اس چہرے کو ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔

''نہیں، ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ شکریہ.....'' حامد نے بروقت کہا اور حمنہ کی انگلی سے انگوٹھی نکال کر اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا لیکن وہ ہاتھ نہیں کھینچ سکی۔ وہ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کئی سالوں سے کوئی انسان نہ دیکھا ہو۔

''آپ.....'' غزارا بغور اسے دیکھتی قریب آئی۔ ''آپ حمنہ آپی ہیں ناں؟'' اس کی آنکھوں میں بے پناہ اپنائیت تھی۔ ''عرفان ماموں کی بیٹی۔ آپ وہی ہیں ناں؟''

حمنہ کا سانس ڈوبنے لگا۔ اس نے حلیمہ سے سرسری سا ذکر سُنا تھا کہ وہ کسی ریستوران میں کام کرتی ہے لیکن وہ یہ والا ہوگا، اسے معلوم نہیں تھا۔ مہندی رنگ کی شرٹ پہ ایپرن پہنے وہ لڑکی، چھوٹی سی غزارا نہیں تھی جسے وہ کمبل دے کر صوفے پہ پھینک دیتی تھی۔ وہ اس کی ہم قد

تھی۔ہم جسامت تھی۔وہ، وہ اب ایک پروان چڑھی لڑکی تھی۔

''ہاں یہ حمنہ ہی ہیں۔آپ کون؟'' حامد الجھا۔

''میں غزارا یانگ ہو۔ان کی پھوپھو کی بیٹی ہوں۔'' وہ بہت چاہت سے کہہ رہی تھی۔ حامد ایک لمحے کے لیے کچھ بول نہ سکا۔یعنی یہ لڑکی، یہ وہی تھی جس کے پیچھے شاہجہاں۔اوہ خدایا۔

''تو تم واپس آ گئیں غزارا شاہجہاں؟'' حمنہ احمقانہ انداز میں ہنس پڑی۔

''آپ نے مجھے پہچان لیا؟'' غزارا نے آگے بڑھ کر اُسے چھونے کی کوشش کی۔''آپ کیسی ہیں حمنہ آپی ہم پندرہ سال بعد مل رہے ہیں۔''

حمنہ نے بے دردی سے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔''مجھے ہاتھ مت لگاؤ لڑکی۔مجھ سے دور رہو۔'' وہ غرائی۔

غزارا کانپ کے پیچھے ہوئی۔

حمنہ کا سانس تیز ہوا، اس کو بے حد رونا آ رہا تھا۔دل عجیب سے بے رحمی میں گھرا جا رہا تھا۔اُس نے ایک آخری نظر غزارا پہ ڈالی پھر کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر ارادہ بدل دیا۔ اس پہ ایک پرعزم سی نظر ڈال کر وہ پیر بجاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

اس نے پلٹ کر حامد کو دیکھا۔

''آپ کون ہیں؟ آپ کو نہیں پہچانا میں نے۔''

''میں۔'' حامد گڑبڑا گیا۔''میں، میں اُس کا دوست ہوں۔میں چلتا ہوں۔خدا حافظ۔'' نگاہ بچا کے وہ سامان لیے، جلدی سے وہاں سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

گھر آ کر وہ دوبارہ کمرے میں بند ہو گئی۔ اس کے اعصاب پھٹ رہے تھے۔ کندھوں اور ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑی جا رہی تھی۔ کھڑکی کے قریب آ کے اُس نے بالوں میں ہاتھ ڈالے۔

''کیوں؟ کیوں شاہ آخر کیوں؟'' وہ حواس باختہ انداز میں بال نوچنے لگی۔ ''کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں تم، کیوں تم اتنے خوش قسمت ہو اور میں..... اللہ میں کیوں اتنی بدنصیب ہوں؟''

وہ فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ چوبیس گھنٹے سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ اذیت کی یہ حد تھی کہ پورا جسم، ایک ایک بند یہ کرب محسوس کر رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے گرد بازو باندھے اور آگے پیچھے جھولنے لگی۔

تو اس لیے امی کہہ رہی تھیں اُسے دیکھنے کا۔ وہ..... وہ ایک ساحرہ ہے۔ ہاں، وہ ایک ساحرہ ہے جس نے شاہجہاں کو پندرہ سال سے حواس باختہ کیا ہوا ہے۔ کتنے چلن چلے اِس نے، کتنی سازشیں کیں۔ کس کس طرح سے اُس شخص کے گرد جال بنا لیکن وہ، اس کا نہیں تھا۔ اس کا نہیں رہا تھا۔

وہ اتنا دور ہو کر بھی صرف اُس کی تھی اور وہ اتنا پاس ہو کر بھی، اس کی نہیں رہی تھی۔ غزارا کا وعدہ تو پورا ہو رہا تھا ناں؟ پندرہ سال بعد، وہ آ چکی تھی۔ وہ وعدہ نبھانے آ چکی تھی۔ کس کا نقصان ہو رہا تھا؟ کون گھاٹے میں جا رہا تھا؟

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے شاہ؟ کیسے؟'' وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ ''کیسے؟ تم..... تم اتنی آسانی سے کیسے اپنی محبت کو حاصل کر سکتے ہو؟ میں نہیں کر سکی۔ نہ تمہاری محبت، نہ حامد کی پھر تم..... تم کیسے کر سکتے ہو؟''

وہ شیطانی انداز میں کہے جارہی تھی۔ آنکھوں کے بٹن تیزی سے دائیں بائیں گھوم رہے تھے۔

''شاہجہاں تمہیں بھی میں کسی کا نہیں ہونے دوں گی۔ کسی کا نہیں۔ اب دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔'' وہ محظوظ سی مُسکرائی۔ دوسری طرف اپنی اسٹڈی میں بیٹھا شاہجہاں، راکنگ چیئر پر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

''میں نے آپ کی بیوی سے بریک اپ کرلیا ہے۔''

اب کیا ہوگا؟

☆.....☆.....☆

اِس اتوار کو زوبیا کے بھائی کی شادی تھی۔ اُس کے پاس شادی کے کپڑے نہیں تھے۔ وہ جناح سپر جا کے اپنے لیے ایک جوڑا خرید لے لائی تھی جو پاکستانی ڈریس تھا۔ چونکہ وہ ولیمے میں مدعو تھی، اس لیے اِس نے پیچ کلر کی تنگ آستینوں اور چوڑی دار پاجامے والی فراک خریدی تھی۔ اِس کے ساتھ شاپنگ کے لیے زوبیا گئی تھی اور یہ رنگ غزالہ نے خود چُنا تھا۔

جوتوں میں اُس نے ہیلز خریدے تھے اور جیولری میں ایک عدد نیکلس جس کے ساتھ کانوں میں پہننے کے لیے چھوٹی چھوٹی جھمکیاں تھیں۔ اپنی شاپنگ کو وہ بستر پر پھیلائے دیکھ رہی تھی۔ ساتھ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ یہ پاکستانی جوڑا کیسے carry کرے گی۔

''اچھا جوڑا ہے۔'' اُسے پشت پہ شاہجہاں کی آواز سُنائی دی۔ وہ پلٹی۔ شاہجہاں ہاتھ میں چائے کا مگ تھامے، ایک ہاتھ پینٹ کی پاکٹ میں ڈالے کھڑا تھا۔

''مگر اسے پہننا تھوڑا مشکل ہوگا۔''

''لیکن تم شادی میں پینٹ شرٹ بھی تو نہیں پہن سکتی۔'' وہ صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

''وہی تو۔اس لیے تو یہ لائی ہوں۔'' اس نے سر جھٹکا اور سارا سامان الماری میں رکھ دیا پھر وہ شاہجہاں کے پاس آئی اور اسکے سامنے میز پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔

''ایک بات بتانی تھی شاہ۔'' اس نے تمہید اباندھی۔

''کیا؟'' وہ متوجہ ہوا۔

''میں نے اُس دن ریستوران میں حمنہ آپی کو دیکھا تھا۔''

شاہجہاں کا گھونٹ منہ سے نکلتے نکلتے رُک گیا۔اس نے بڑی مشکل سے کڑوی کافی نگلی۔ غزارا گھٹنوں کے درمیان ہاتھ دیے، ٹانگیں جھلاتی متوحش نظر آرہی تھی۔

''میں نے اُنھیں گلے لگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں لگیں۔انھوں نے ایسے (ہاتھ لہرا کے دکھایا) میرا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا کہ میں اُنھیں ہاتھ نہ لگاؤں۔جب میں چھوٹی تھی تب وہ بہت نک چڑھی تھیں، وہ اب بھی ہیں۔وہ ذرا نہیں بدلیں۔''

''اُس نے.....'' شاہجہاں نے محتاط سی نگاہ اٹھائی۔''تمہیں..... پہچان لیا تھا؟''

''ظاہر ہے۔ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔بس میں اس لڑکے کو نہیں پہچان سکی جو اُن کے ساتھ تھا۔''

''لڑکا؟'' شاہجہاں چونکا۔

''ہاں۔وہ کسی لڑکے کے ساتھ تھیں لیکن وہ تیار ہو کے نہیں آئی تھیں۔کافی خراب حالت تھی۔''

شاہجہاں نے گہرا سانس لیا۔تو یہ لڑکی، کسی اور کے ساتھ involve ہو چکی تھی۔

''ایک بات پوچھوں شاہ؟'' غزارا نے تجسس اُبھارا۔

''پوچھو۔'' وہ بدستور محتاط تھا۔

''مجھ سے سب لوگ ابھی تک نفرت کیوں کرتے ہیں؟ کیا کوئی کسی سے اتنے سال تک نفرت کرسکتا ہے؟'' اُس کی آنکھوں میں اُداسی تھی۔ لہجے میں کرب تھا۔ شاہجہاں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو پر رکھا تا کہ اُس کی anxiety کم ہو۔ وہ مسلسل پیر جھلا رہی تھی۔

''ایک بات یاد رکھنا یانگ شی کچھ لوگ، ساری عمر نفرت کرتے ہیں۔ پندرہ سال، کچھ بھی نہیں ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔''

''لیکن شاہ..... کوئی نفرت کے لائق بھی تو ہوناں۔ میں نے ان سب کا کیا بگاڑا ہے۔'' وہ افسردہ تھی۔

''کبھی کبھی ہم کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے اور پھر بھی ہم نفرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا کوئی قصور نہیں ہوتا لیکن ہم مجرم بن جاتے ہیں۔ یہ دُنیا ایسی ہی چلتی ہے پرنسز۔ بے سبب محبت اور بے سبب نفرت کے ساتھ۔''

''عجیب ہے۔'' وہ دور خلا کو گھورنے لگی۔ ''سب عجیب ہے۔ یہ دُنیا ہی عجیب ہے۔''

''عجیب ہے ناں؟ تو چھوڑ دو اِسے سوچنا اور اچھا اچھا سوچو۔'' شاہ جہاں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا جس پر وہ مسکرائی اور اپنے چہرے کے آگے زور زور سے ہاتھ جھلائے۔

''کسی برے خیال کو کوئی حق نہیں ہونا چاہیے کہ میرا روشن دن خراب کرے۔''

''بالکل۔'' شاہجہاں مسکرا دیا۔ اسی لمحے دروازے کی چوکھٹ میں حلیمہ پھسلتے پھلستے بچی، وہ بھاگ کر آئی تھی۔ چہرے کے ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

''شاہ بھائی۔'' وہ نیم ہذیانی انداز میں بولی۔

شاہجہاں نے غزارا کی پشت سے اُسے دیکھا۔ وہ ستی ہوئی لگ رہی تھی۔ شاہجہاں کھڑا ہو گیا۔ غزارا بھی اٹھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے کپ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ..... وہ.....'' حلیمہ نے خشک گلا تر کیا پھر آنکھوں سے کچھ اِشارہ کیا جسے شاہجہاں نہیں سمجھ سکا۔

''کیا ہوا ہے حلیمہ؟ تم اتنی گھبرائی کیوں ہو؟'' وہ اُس کے پاس آئی۔

''کچھ نہیں یانگ شی.....'' وہ زبردستی مُسکرائی۔ ''تم بیٹھو، تمہیں بتاتی ہوں۔ شاہ بھائی آپ باہر جائیں وہ..... وہ زید آیا ہے ناں۔ آپ سے ملنے۔ آپ مل لیں اُس سے۔''

شاہ جہاں پر پوری حویلی آن گری۔

''تم آؤ، تمہیں ایک اور بات بتانی ہے۔'' وہ غزارا کو تھام کر ٹیرس پہ لے گئی۔ شاہ جہاں اپنی جگہ نصب ہو کر رہ گیا تھا۔ زید کے آنے کا مطلب، حمنہ کا آنا اور پھر.....

اس نے گریبان کا اوپری بٹن کھول دیا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

حمنہ نے صرف زید کو بھیجا تھا۔ اُس کے سامان کے ساتھ۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں اپنا بیگ کھول کر کپڑے نکال رہا تھا۔ الماری کے پٹ وا تھے جس میں خالی ہینگر لٹک رہے تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ چوں کہ ابھی تک گھر والوں کو علم نہیں ہوا تھا، اس لیے کوئی اُس سے ملنے نہیں آیا تھا۔

شاہجہاں نے دروازے کی دہلیز سے اُسے دیکھا پھر وہ ماندہ ماندہ قدم اٹھائے اُس کی طرف چلا آیا۔ وہ ننھے ہاتھوں سے ہینگر میں ٹی شرٹ ڈال رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سُن کر اس طرف دیکھا۔ شاہجہاں لب بھینچے اُسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے ہینگر نیچے رکھا اور پورے رُخ سے مڑا۔

''ویلکم کریں ڈیڈ..... اب آپ کا چیمپ آپ کے ساتھ رہے گا۔ مام نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔'' وہ پوری مسکراہٹ کے ساتھ اطلاع دے رہا تھا اور شاہجہاں کو لگ رہا تھا جیسے

کوئی اُس کے قدموں سے زمین کھینچ رہا ہو۔

ڈیڈ..... ڈیڈ..... اگر یہ لفظ غزارا کے کانوں میں پڑا تو وہ کیا کرے گا؟ وہ کیسے غزارا کو جواب دے گا۔ حمنہ نے اُس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ یقیناً وہ اب انتقام لینے والی تھی، لیکن حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ بہادری سے سامنا کر سکتا۔ وہ ڈر رہا تھا۔ ہاں..... اس وقت شاہجہاں سلیمان بے حد ڈرا ہوا تھا۔

اس نے ٹوٹتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے زید کے ننھے ہاتھوں کو تھاما۔

''اگر میں اپنے چیمپ سے کچھ مانگوں تو کیا وہ مجھے دے گا؟'' اس نے مان سے اُسے دیکھا۔ ڈھیلی ٹی شرٹ، ڈھیلی پینٹ اور سر پہ اُلٹی کیپ جس کی اسٹریپ سے اُس کے بال نکل رہے تھے۔

''کیوں نہیں ڈیڈ..... مانگیں ناں.....'' زید نے فرمابرداری سے کہا۔

''کیا تم.....'' اس نے بمشکل ہمت جمع کی۔ سانس ٹوٹ رہا تھا۔ ''کیا میری جان تم مجھے کچھ دنوں کے لیے ڈیڈ کی بجائے کچھ اور کہہ کر بلا سکتے ہو؟''

زید کے ننھے دماغ میں ہل چل ہوئی۔ ''مطلب ڈیڈ نہ کہوں؟''

شاہجہاں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سب کے سامنے نہیں کہنا، تنہائی میں کہہ سکتے ہو۔''

''پھر سب کے سامنے کیا کہوں؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''جو مرضی آئے لیکن ڈیڈ نہیں کہنا، سب کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ گھبرا کے کہہ رہا تھا۔ اُس کا دل منوں بوجھ تلے کچلا جا رہا تھا۔ زید نے لب گول کر کے، چہرہ اٹھایا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر، پھر وہ مسکرایا۔

''مسٹر شاہ کیسا رہے گا؟'' وہ چمک کے بولا تو شاہجہاں کی پیشانی ڈھیلی ہو گئی۔ تاثرات میں نرمی جھلکی۔

"ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔"

"تو کیسا لگا میرا آنا آپ کو مسٹر شاہ؟" زید نے ناز سے لہرا کر پوچھا۔

"پہلے یہ بتاؤ تم ہو کون؟" یہ غزارا کی آواز تھی، وہ دروازے میں کھڑی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ شاہجہاں سٹپٹا کر کھڑا ہوا۔ زید بھی چونک گیا۔ وہ ابھی ابھی آئی تھی، اُس کے پہلو میں حلیمہ بھی تھی جو آنکھیں چراتے ہوئے چھپ رہی تھی۔

"بتائیں ناں شاہ..... مجھے آپ لوگوں نے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ کون ہے یہ بچہ؟ کیا میں اِس سے پہلے ملی ہوں؟" وہ گھٹنے پکڑ کر رکوع کی حالت میں جھک کے زید کو دیکھنے لگی۔

"آپ پرنسز ہیں ناں؟" زید اُس کی طرف مڑا۔ وہ سحر زدہ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"پرنسز؟" وہ ٹھٹکی۔

"ہاں۔ آپ نے مسٹر شاہ کے ساتھ ڈانس کیا تھا، جب آپ چھوٹی تھیں۔ آپ کی تصویر لگی ہے۔ ہمارے آڈیٹوریم کی دیوار پہ۔ مسٹر شاہ نے بتایا کہ آپ اُن کی کزن ہیں۔ you are exactly like a princess....."

"کیا اُس دیوار پہ ابھی بھی میری تصویر ہے؟" اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں۔ مسٹر شاہ نے دیکھی تھی، کیوں مسٹر شاہ؟" زید نے پلٹ کر باپ کو دیکھا جو اس کی بات پر تھکا سا مسکرایا تھا۔

"ہاں۔"

"لیکن تم ہو کون۔ تعارف کرواؤ اپنا۔" وہ ہنوز جھکی ہوئی تھی۔

"یہ زید ہے۔ حمنہ آپی کا بیٹا۔" حلیمہ نے پشت سے فوراً لقمہ دیا۔ غزارا سیدھی ہوئی۔

"حمنہ آپی کی شادی ہو گئی ہے؟"

''ظاہر ہے۔'' حلیمہ احمقانہ انداز میں ہنسی۔

''کس سے ہوئی ہے؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کوئی..... آؤٹ آف فیملی تھا.....'' اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

''مگر مام کی شادی.....'' زید نے کہنا چاہا جب ہی حلیمہ نے ٹوک دیا۔

''ایسے نہیں کہتے زید۔ مانا کہ تمہارے بابا اور ماں ساتھ نہیں رہتے، لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ تم یہ بات سب کو بتاؤ۔ اپنے پیرنٹس کے تعلقات کا اشتہار نہیں لگاتے۔''

زید نے پشیمانی سے سر جھکا دیا۔ ''آئی ایم سوری.....''

شاہ جہاں لب بھینچے کھڑا تھا۔ دل چھریوں تلے کٹ رہا تھا۔ غزارا جز بز تھی۔

''اب جاؤ، جا کے کھیلو..... میں تمہارا سامان ان پیک کر دوں گی۔''

زید نے سر ہلایا اور غزارا کے پہلو سے نکل کر باہر چلا گیا۔ غزارا نے اُسے جاتے دیکھا پھر حلیمہ کو پھر شاہجہاں کو.....

''اس کے پیرنٹس کیوں ساتھ نہیں رہتے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''حمنہ آپی بہت arrogant ہیں یا نگ شی..... وہ ہر وقت اپنے شوہر سے لڑتی رہتی ہیں۔ بات بات پہ ماں باپ کے گھر بیٹھ جاتی ہیں جس کی وجہ سے یہ بچہ بہت ڈسٹرب رہتا ہے۔ اس لیے کہیں بھی شروع ہو جاتا ہے۔ تم پریشان نہ ہو، وہ عادی ہے اس سب کا۔ جلد ہی وہ کزنز میں گھل مل جائے گا تو سب بھول جائے گا۔ تم آؤ میرے ساتھ، ہم چل کر تمہاری شاپنگ دیکھتے ہیں۔'' اس نے غزارا کا بازو تھاما اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

شاہ جہاں ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا۔

☆.....☆.....☆

وہ ٹیرس پہ ٹہل رہا تھا۔ کان سے فون جڑا تھا جس پر حمنہ کو گھنٹیاں جا رہی تھیں لیکن وہ اٹھا نہیں رہی تھی۔ وہ بہت مضطرب تھا، اسے ہر حال میں حمنہ سے بات کرنی تھی۔ دوسری طرف حمنہ میز پر فون رکھے، بجتی ہوئی گھنٹیوں کو سُن رہی تھی۔ وہ برگر کھا رہی تھی اور بے حد محظوظ ہو رہی تھی۔ یقیناً وہ شاہجہاں کی زندگی میں طوفان لا چکی تھی۔

نیچے لان میں زید باقی کزنز کے ساتھ مل کر فٹ بال کھیل رہا تھا۔ شاہجہاں کا فون دسویں بار بھی نہیں اٹھایا گیا تو اُس نے ضبط سے فون دبوچ لیا۔ غصے سے اُس کی شریانیں اُبھر رہی تھیں۔ ریلنگ پر ہاتھ رکھے وہ اپنے بیٹے کو دیکھے گیا۔

تو کیا اسے اب اعتراف کرنا تھا؟ ہر جرم، ہر گناہ ہر بے وفائی قبول کرنی تھی۔ تو کیا وقت آ چکا تھا؟ دو ماہ بعد، وہ غزارا شاہجہاں عُرف یانگ شی کو بری طرح گھائل کرنے والا تھا؟ تو کیا وہ تیار تھا؟

"نہیں....." اس نے بے ساختہ کہا۔ وہ تیار نہیں تھا۔ وہ فرد جرم عائد ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کم از کم تب تک تو بالکل بھی نہیں، جب تک غزارا کے والد رہا نہیں ہو جاتے۔ وہ ایک غم دے کر، اُس لڑکی کو دوسری خوشی دینا چاہتا تھا۔ ایک ایسی خوشی جس کے سہارے وہ باقی ماندہ زندگی گزار سکے۔

ہاتھوں میں فون دبائے، وہ ریلنگ پر بازو رکھے بے حد لاغر لگ رہا تھا۔ جسم کی ساری توانائی جیسے نچڑ گئی تھی۔ اسی لمحے اس کا فون بجا، اس نے تیزی سے اٹھا کر کان سے لگایا۔

"حمنہ میری بات سنو، مجھے تم سے ملنا ہے ابھی اسی وقت....."

"سر میں بول رہا ہوں....." قاسم نے انکشافی انداز میں کہا جس پر اُس نے کان سے فون ہٹا کر اسکرین دیکھی۔ وہ حمنہ کی نہیں، اس کی سیکرٹری کی کال تھی۔ اس نے پیشانی مسل کر

واپس فون کان سے جوڑ دیا۔

''ہاں قاسم بولو.....''

''سر آپ کو کوریا آنا ہوگا۔ یہ کمپنی والے مجھ سے نہیں سنبھل رہے۔'' وہ چڑے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''کیا کر رہے ہیں وہ؟''

''اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں سر.....آپ آجائیں ناں، آپ کو دیکھ کے یہ وکیل بھی الرٹ ہو جائے گا۔'' اُس نے کوفت سے کہا۔

''تو ساری گڑبڑ وکیل کر رہا ہے۔'' اس نے پیشانی سہلائی۔

''اسے لالچ لگ گیا ہے سر۔ اور پیسوں کے لیے ڈھیلا پڑ رہا ہے۔''

''ہوں۔ ایسا ہی ہونا تھا۔ لوگ مجبوریوں کا فائدہ بہت خوبی سے اٹھاتے ہیں۔'' وہ طنز سے ہنس دیا پھر اس نے پیشانی سے انگلیاں ہٹائیں۔ ''ٹھیک ہے قاسم۔ میں آتا ہوں۔ تم وکیل سے بحث مت کرنا۔''

''جی سر۔''

اس نے یخ سانس نکال کر فون بند کر دیا۔

شاہجہاں نے وکیل پر نظر رکھنے کے لیے قاسم کو کوریہ بھیجا تھا۔ اُس کے ساتھ وہی وکیل تھا جو یانگ ہو کا کیس لڑنے کی ہامی بھر چکا تھا۔ جب پچھلی بار شاہجہاں دبئی سے یکا یک لندن چلا گیا تھا، وہ اسی وکیل سے ملنے، اس کو یانگ ہو کا کیس سونپنے گیا تھا جس کے لیے اُس نے ڈالرز میں خطیر رقم مانگی تھی۔

اس نے کمپنی اور قانون دونوں کے ساتھ مفاہمت کرانے کی کوشش کی۔ لیکن کمپنی کا کیس

مضبوط تھا، یانگ ہونے کا ٹریکٹ توڑا تھا۔ وہ رہا ہو بھی جاتا تو اسے عدالت میں کئی ملین وان خرچ کرنے پڑ سکتے تھے جس کے لیے غزارا کمار ہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کے لیے بے حد مشکل ہوگا، اس لیے اس نے پسِ پردہ وکیل کے سارے اخراجات اٹھا لیے تھے۔

وہ براہِ راست یانگ منی کو پیسے دے کر عدلیہ میں خرچ نہیں کروا سکتا تھا، گو کہ اس طرح اس کا پیسہ کم خرچ ہو جاتا لیکن وہ ایک غیر ملکی تھا۔ یانگ ہو کے ساتھ اس کا حسب نسب بھی کوریہ میں وضع نہیں ہوا تھا۔ دوسرا یانگ منی، اس سب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اُس کی موجودگی میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے غزارا کو فوراً بھنک لگ سکتی تھی۔ اس لیے اِس نے وکیل کا سہارا لیا۔ اس طرح وہ مدد بھی کر لے گا اور غزارا کو بھنک بھی نہیں پڑے گی۔

اس کا جانا ہی ٹھیک تھا۔ اب کیس میڈیا اور عوام کے سامنے آ چکا تھا۔ بیرونی ممالک کی ساری نظریں اس پر پڑ گئی تھیں۔ ایسے نازک معاملات میں وہ کسی طور پر اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر یہاں زید سے دوری، فی الوقت اُسے کئی خرابیوں سے بچا سکتی تھی۔ اس کا نہ ہونا ہی بہتر تھا۔ جب وہ واپس آ جائے گا تب یانگ ہو یقیناً رہا ہو چکا ہوگا۔ اس صورت غزارا کو اپنی سچائی بتانا، اندوہناک نہیں ہوگا۔

اس نے سوچا اور سامان پیک کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

''یقین نہیں آ رہا..... شاہ مجھے بتائے بغیر لندن چلے گئے ہیں۔''

وہ حلیمہ کے کمرے میں فرش پر بیٹھی، میز پر کہنیاں ٹکا کر ہاتھوں میں چہرہ بھرے کہہ رہی تھی۔ حلیمہ سامنے ایل ای ڈی کو درست کر رہی تھی جس کی کیبل میں جانے کیا خرابی آ گئی تھی کہ چینل آ کے نہیں دے رہے تھے۔

''پہلی بار تھوڑے ہی گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو جا کے واپس بھی آ جاتے تھے اور ہمیں پتا نہیں چلتا تھا۔''

''شاہ ایسا تو نہیں کرتے۔ مجھے تو بتا دیتے ہیں۔'' وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔ گلابی سپیدرنگت پر اس وقت کوفت اور غصے سوار تھا۔ حلیمہ نے کیبل درست کی تو چینل چلنے لگے۔ وہ ریموٹ لیے، پیچھے آ گئی اور اُس کے پیچھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

غزارا نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور میز پر پڑے رامین کھانے لگی جو اِس نے خصوصی طور پر خریدے تھے۔ وہ حیران تھی کہ اُسے اپنے پسندیدہ رامین CSD میں ملے تھے۔ کوریہ میں تو ہر دُکان میں مل جاتے ہیں۔

برتن پر منہ جھکائے وہ چاپ سٹک میں گھنگریالے نوڈلز بھرتی پھر منہ میں ڈال لیتی۔ حلیمہ بے زاری سے چینل بدل رہی تھی پھر اس نے سرد آہ بھری۔

''پاکستان میں کچھ اچھا لگتا ہی نہیں۔ مجھے نیٹ فلیکس ہی دیکھنا پڑے گا۔''

وہ عام چینل سے ہٹ کر نیٹ فلیکس پہ گئی۔ وہاں مختلف سیریز نظر آ رہی تھیں۔ انگریزی، کورین، جاپانی، چائنیز وغیرہ..... وہ ایک کورین ڈرامے کی طرف چلی گئی اور اسی لمحے دروازے میں صدف آن کھڑی ہوئی۔

''میڈم..... آپ کو چھوٹی میڈم، بڑی بیگم صاحبہ اور منجھلی بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔'' اُسی ازلی کوفت سے وہ بولی۔ دونوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنا پیغام سُنا کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

''کس کی بات کر کے گئی ہے۔ ایک تو یہاں کسی کو نام سے نہیں بلایا جاتا ہے۔'' غزارا نے چڑ کے کہا۔

''تائی، چچی اور امی..... تینوں آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔'' حلیمہ نے ڈرامہ چلاتے ہوئے کہا۔

''اب اِن کو کیا کام پڑ گیا؟'' وہ کوفت سے پیالہ پیچھے دھکیل کر بولی پھر ٹشو اٹھا کر منھ صاف کیا اور اسی طرح باہر چلی گئی۔ راہداری میں اُس نے بالائی ریلنگ سے جھانک کر نیچے دیکھا تو لاؤنج خالی تھا۔ کہاں تھیں وہ؟ وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اسے یاد آیا وہ سب ایک ہی جگہ مجلس لگاتی ہیں۔ طاہرہ بیگم کے کمرے میں، تو وہ اُس سمت چلی آئی لیکن ابھی وہ لابی مڑ کر اُس راہداری میں داخل ہی ہوئی تھی کہ اُسے اپنے کمرے سے متعدد آوازیں آئیں۔

اس کے کمرے میں کون تھا؟ وہ چونک گئی پھر تیز تیز اس طرف بڑھی۔ دروازے پر ٹھہری تو دیکھا کہ اندر تینوں موجود تھیں۔ طاہرہ بیگم وسط میں کھڑی تھیں۔ روشنا اپنی بہن کے ساتھ بستر پر متمکن تھی۔ کرن البتہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہنس رہی تھی۔ بہن کی ایک لڑکی جو تیرہ چودہ سال کی تھی، وہ اس کی موم بتیوں کو اٹھائے الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے بلایا تھا مامی؟'' وہ ذرا ٹھٹکتی ہوئی اندر آئی۔ طاہرہ بیگم نے پلٹ کر دیکھا۔

''ہاں..... وہ..... یہ روشنا کی بہن ہے۔ حسن ابدال سے آئی ہے۔ کچھ دنوں میں اِس کے پتے کا آپریشن ہے۔ پہلے بھی کئی بار آ چکی ہیں۔'' مروت سے تعارف کراتی وہ کمینگی سے مسکرائیں۔ روشنا اور اس کی بہن نے جل کر پہلو بدلا۔

''سلام.....'' غزارا رسماً جھکی۔

''یہ ہے، تیری بھگوڑی نند کی بیٹی۔'' روشنا کی بہن اسما نے ناک چڑھائی۔ غزارا نے اپنی ماں کے لیے یہ لفظ سُنا تو جبراً مسکرا دی۔ اگر وہ اس عورت کے ساتھ اکیلی ہوتی اور یہ لفظ بولتی تو اسے پتے کے ساتھ گردے کا بھی علاج کرانا پڑ جاتا۔

''ہونہہ..... منگولوں کی اولاد پیدا کی ہے۔ دیکھو تو۔ وہ ارتوغل غازی میں آتے ہیں، ایسی

ہی آنکھیں ہوتی ہیں اُن کی موریوں میں چھپی ہوئیں۔"

غزارا نے طاہرہ بیگم کو دیکھا پھر کرن کو جو زیرِ لب مسکراہٹ دبا رہی تھیں پھر وہ کھل کر مسکرائی۔

"طبیعت کیسی ہے مولیان ایمو (بدتمیز آنٹی) آپ کی؟" اس نے نہایت خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ ٹھنک کے بولی۔

"ٹھیک ہی رہے تو بہتر ہے۔ ہمارے کوریہ میں تو اس بیماری سے کوئی نہیں بچتا۔" وہ ہنسنے لگی۔

"کیا مطلب؟ کیا اول فول بک رہی ہو؟" روشنا نے برا مانا۔ "پتے میں پتھری ہے ان کے اور کچھ نہیں ہے۔"

"میں کب کہہ....."

"اچھا یہ سب چھوڑو....." طاہرہ بیگم جھنجھلائیں۔ "غزارا.....اسما بہن جب بھی آتی ہیں، اس کمرے میں ٹھہرتی ہیں۔ تم اپنا سامان یہاں سے نیچے والے گیسٹ روم میں شفٹ کر دو۔ جب تک یہ یہاں ہیں، اس کمرے میں رہیں گی۔"

"کیا مطلب؟" وہ بوکھلا گئی۔

"میری بہن اس کمرے میں رہتی ہے۔ سُنا تم نے۔ اس لیے اس فوراً سے پہلے خالی کرو۔" روشنا نے حکمیہ انداز میں کہا۔

"لیکن میں کیوں خالی کروں۔ ان کو گیسٹ روم میں رکھیں ناں۔ ویسے بھی مہمان گیسٹ روم میں رہتے ہیں۔"

"تو ہم مہمانوں کو ہی گیسٹ روم میں بھیج رہے ہیں۔" طاہرہ بیگم دو بدو بولیں۔ غزارا پہلے تو نہیں سمجھی پھر جیسے چونک پڑی۔ طاہرہ بیگم استہزائیہ انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

''مامی میں اس کمرے میں دو مہینے سے رہ رہی ہوں۔ اس کو میں نے مشکل سے کوزی.....''

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اب ہمیشہ اس حویلی میں رہو گی؟'' انھوں نے تیزی سے بات کاٹی۔

''ارادے تو اس کے یہی ہیں بھابھی بیگم.....'' کرن نے طنز سے تاڑا۔

''خوش فہمیاں ہیں اس کی.....'' طاہرہ بیگم کہنے لگیں۔ ''ہم شاہجہاں کی وجہ سے کچھ کہتے نہیں ہیں تو محترمہ خود کو اس گھر کا فرد سمجھنے لگی ہے۔ چوہے کی ذات دیکھو، چوہے کی اوقات دیکھو۔''

''چوہیا بھابھی بیگم..... چوہیا کہیں.....'' روشنا ہنس کے بولی۔ غزارا کا دل یکبارگی دھڑکا، آنکھوں میں گرم آنسو آئے لیکن اُس نے خود پہ ضبط کیا۔ کمرے کے باہر دیوار کے ساتھ نصب فالتو کرسی پر زید بیٹھا، فون پہ گیم کھیل رہا تھا۔ اُس کے فون کی زوں زوں اندر تک آ رہی تھی۔

''مامی اس کو سمجھیں۔ یہ کمرہ میرے لیے بہتر ہے۔ میں نیچے نہیں رہ سکتی۔''

''کیوں؟'' کرن نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''کیوں کہ یہاں آکسیجن اچھی آتی ہے۔ روشنی ہوتی ہے مجھے.....''

''تمہیں آدھی رات کو اٹھ کے شاہجہاں کے کمرے میں جانے میں آسانی ہوتی ہے۔'' طاہرہ بیگم نے اِس کی بات اپنے معنوں میں مکمل کی۔

''ہا.....'' روشنا نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا کہہ رہی ہیں بھابھی بیگم، آدھی رات۔ شاہجہاں؟''

''سچ کہہ رہی ہوں۔ اپنی ماں کے نقشے قدم پر چل رہی ہے یہ۔''

''میری ما کو بیچ میں نہ لائیں.....'' اس نے دھیرے سے انتباہ کی۔

''تو کہہ دو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ تم شاہجہاں کے کمرے میں نہیں جاتی ہو۔''

''میں جاتی ہوں لیکن جیسا آپ سوچ رہی ہیں، ویسا کچھ نہیں کرتی۔'' وہ بے اختیار رو پڑی۔ آج شاہجہاں نہیں تھا۔ اُس کی غیر موجودگی کا فائدہ طاہرہ بیگم ہمیشہ اٹھاتی تھیں۔

''بند دروازوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم اور ویسے بھی تم چاہے خود کو کتنا پاک صاف بنالو۔ ہو تم ایک بھاگی ہوئی ماں کی بیٹی۔ ایک چھنال کی بیٹی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی تمہارے اندر فحاشی کا عنصر تو ہوگا ہی.....''

''میری ما کے بارے میں ایسی بات مت کریں۔'' وہ گڑگڑا سی گئی۔

''اچھا۔ ہمارے بات نہ کرنے سے حقیقت بدل جائے گی؟'' انھوں نے زہر سے گھورا۔

''ما پاپا نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ انھوں نے نکاح کیا تھا۔''

''ہاں۔ بھاگ کر۔ ہمارا منھ کالا کر کے۔''

''اس کے کیا ہی منھ لگ رہی ہیں بھابھی بیگم۔ جانے دیں۔ پھر شکایتیں لگائے گی شاہجہاں سے۔ آپ ہی کا کردار برا بن جائے گا۔ اس کے من بھر آنسوؤں کو تو دیکھو، یہی ٹسوے شاہجہاں کے آگے بہائے گی اور سو سو ہمدردیاں بٹورے گی۔ ویسے بھی اس جیسی نازک چھینک سے ٹوٹنے والی لڑکیاں صرف ٹسوے بہانا ہی تو جانتی ہیں۔'' روشانے ناک چڑھا کر بے زاری سے کہا۔

غزارا نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔ آنسو ٹپ ٹپ ٹھوڑی سے نیچے لڑھکنے لگے۔

''اب بند کرو یہ تماشا اور اپنا سامان شفٹ کرو نیچے۔ ہم تمہارے نوکر نہیں لگے جو یہ کام بھی

کر کے دیں گے۔" طاہرہ بیگم نے تلخی سے سر جھٹکا اور اس پر ایک بری نظر ڈال کر باہر چلی گئیں۔
زید نے اُنھیں جاتا دیکھ..... "شی از سولاوڈ....." پھر کان کھجا کر واپس گیم میں گھس گیا۔

☆.....☆.....☆

اس نے سارا سامان بلکتے ہوئے نکالا اور سسکیاں لے لے کر پیک کیا۔ بار بار وہ آستین سے آنکھیں رگڑتی پھر کوئی سامان اٹھا کر بیگ میں ڈال لیتی جو وہ لائی تھی۔ ساری چیزیں پیک کرنے کے بعد وہ دونوں بیگ گھسیٹے ہوئے نیچے گیسٹ روم میں لے آئی۔
سامان سیٹ کرنے کے بعد اس نے حسبِ عادت موم بتیاں جلائیں، کھڑکیاں کھول لیں پھر وہ کمرہ اسی طرح چھوڑ کر باہر لان میں چلی گئی جہاں شاہجہاں اُس دن بیٹھا تھا۔ وہ اُسی بینچ پر بیٹھ گئی۔ دل دکھ کی گہرائیوں میں گرا ہوا تھا۔
والدین اپنے بچوں کی برائی سن لیا کرتے ہیں لیکن بچے اپنے والدین کی برائی کبھی نہیں سُن پاتے۔ چاہے وہ ماں باپ سے ناراض کیوں نہ ہوں، وہ کبھی برداشت نہیں کرتے کہ اُن کے والدین کو کوئی برا کہے اور پھر جب اُن میں سے کوئی ایک زندہ نہ ہو تو وہ ہر برا لفظ برچھی کی چبھتا ہے۔ جیسے اسے اس وقت چبھ رہا تھا۔
آج سورج تیز تھا۔ چھن کر پڑتی شعاعوں میں اُس کا عکس جیسے بہار کی چٹخی ہوئی کلی کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ گود میں رکھے ہاتھوں کو مسلسل "ہاتھ دھونے والے" انداز میں رگڑ رہی تھی۔ آنسو گالوں پر پھسل رہے تھے۔
زید نے اُسے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا پھر وہ اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ اس کے سامان نکالنے تک وہ کمرے کے ساتھ نیچے فرش پر اکڑوں بیٹھا بظاہر گیم کھیل رہا تھا لیکن وہ انتظار کر رہا تھا کہ وہ کب باہر آئے گی پھر جب وہ لان کی سمت گئی تو وہ بھی پیچھے پیچھے چلا آیا۔

اس وقت وہ کبھی ایک کونے میں جاتا، کبھی دوسرے۔ کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ظاہر کر رہا تھا اس کی طرف دھیان نہیں ہے۔ وہ اس کے بنچ کے پاس بھی آیا لیکن غزارا نے محسوس نہیں کیا۔ وہ اسی طرح یہاں وہاں جھانکتا پھولوں والی کیاریوں کی طرف بڑھ گیا۔ رنگے برنگے پھولوں پر تتلیاں اور شہد کی مکھیاں اُڑ اُڑ کر بیٹھ رہی تھیں۔ اُس نے پیلا پھول توڑا پھر پلٹ کر غزارا کو دیکھا۔

اُس نے آج سفید رنگ کی ٹخنوں تک آتی کاٹن کی سیدھی فراک پہنی تھی جس پر چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔ زرد، سرخ، نیلے اور گلابی ..... زید اُس کے ڈریس کو دیکھتے ہوئے پھول توڑ رہا تھا پھر اُس نے ایک ایک کر کے سارے پھولوں کی ڈنڈیوں کو اکھٹا کیا اور نیچے سے گھاس کی لمبے لمبے کھڈر کھینچے اور ڈنڈیو کے گرد لپیٹ لیے یوں کہ وہ چار پھولوں کا گچھا بن گیا۔

ان کو لیے وہ ہچکچاتا، چھوٹے قدم لیتا اُس کے پاس آیا اور پھولوں کو نمائشی انداز میں اس کے عین چہرے کے آگے پکڑ لیا۔ غزارا نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھائیں۔

"Dont cry,I dont like crying princess....." وہ چھوٹی سی ناک سکوڑ کر بولا۔

غزارا نے ایک لمحے اس بچے کو دیکھا جو ڈھیلی سی سیاہ ٹی شرٹ اور سیاہ ہی پینٹ میں ملبوس تھا، سر پہ پی کیپ اُلٹی پہن رکھی تھی۔ اسے فکرمندی اور ہمدردی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اُداس سی مسکرائی۔

"شکریہ....." اس نے پھول پکڑ لیے۔

"یور آر بیوٹی فل ..... یور آئیز ....." وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ غزارا نے ہنس کر

آنکھیں پونچھ لیں۔ وہ جانتی تھی وہ بہلانے کے لیے کر رہا ہے۔ اس نے زید کی کلائی پکڑ کر پاس بٹھا دیا۔

''کتنے سال کے ہو تم؟''

''نو سال کا ہوں.....'' اس نے سر پہ ٹوپی درست کی کہ کوئی اسے چھوٹا نہ سمجھے۔

''نو سال کے ہو اور اتنے سمجھدار ہو۔ کس نے سکھایا ہے یہ سب؟''

''بابا نے..... وہ کہتے ہیں لڑکیوں کو رلاتے نہیں ہیں۔ اُن کے دل بہت نازک ہوتے ہیں۔''

''اچھا۔ لیکن تم نے تو مجھے نہیں رُلایا۔''

''مگر روتا ہوا دیکھا تو ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''ہر روتی لڑکی کو چپ کراتے ہو تم؟''

''نہیں۔'' وہ جیب سے فون نکالنے لگا۔ ''صرف پرنسز کو.....''

''تم مجھے پرنسز کیوں کہتے ہو؟ میں پلے میں پرنسز بنی تھی، اس لیے۔''

''پتا نہیں.....'' اس نے شانے اُچکائے۔ وہ گیم کھول رہا تھا۔

غزارا اس معصوم بچے کو دیکھنے لگی۔ اس کے باپ نے کتنی اچھی باتیں سکھائی تھیں۔ اس گھر میں باقی بھی بچے تھے، سب کتنے بے زار و بے نیاز رہتے تھے اور ایک یہ تھا جو پھول لایا تھا۔ اس نے جھک کے پھولوں کو سونگھا۔ جانے کیوں، اسے شاہجہاں کی یاد آ گئی۔

اور زید..... اُس نے باپ کی غیر موجودگی میں باپ کا فرض نبھایا تھا۔ اُن کی پرنسز کو ہنسایا تھا۔

اُس کی گیم کی زوں زوں کی آواز آئی تو اس نے ذرا سا سر جھکا کر اُس کی اسکرین پہ

دیکھا۔ ''کونسی گیم کھیل رہے ہو؟''

زید نے گیم کا نام لیا۔ وہ چونکی۔

''تم یہ گیم کھیلتے ہو؟''

''ہاں..... میں اور بابا..... ہم دونوں کھیلتے ہیں.....''

''اچھا..... کتنا اسکور ہے تمہارا؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ون تھرٹی.....'' وہ اسکرین میں گھسا ہوا تھا۔

''بس.....'' وہ مایوس ہوئی۔

''یہ مشکل گیم ہے پرنسز۔ اتنے پوائنٹس بنانا بھی بڑی بات ہے۔'' وہ جیسے برا مانا تھا۔

''بس کرو، اب اتنی بھی مشکل نہیں ہے۔'' اس نے چھوٹے لڑکے کو چھیڑا۔

''اچھا اتنی آسان ہے تو تم کیوں نہیں کھیل لیتیں..... play and show me.....'' اس نے فون اس کی طرف بڑھا کر للکارتے لہجے میں کہا۔ غزارا نے مسکرا کر اس کے بال بکھیرے۔

''تم تو برا مان گئے۔ میں تو ایسی کہہ رہی تھی۔''

''there is a huge difference between spkeaing and doing.....''

وہ اسے جتاتا ہوا بولا پھر اسکرین میں گھس گیا۔ وہ مسکرانے لگی۔

''بابا کا اسکور 180,000 ہے۔ مجھے بس اُن سے زیادہ کرنا ہے۔''

''کیوں۔ ninja سے زیادہ نہیں کرنا۔ اُس سے ڈرتے ہو؟''

''میں کیوں ڈروں گا؟'' زید نے خفگی سے گھورا۔

"see girl,you are taking me light....."

"تم ڈرتے ہو میرا مقابلہ کرنے سے....."

"میں نہیں ڈرتا۔ میں ninja سے بھی....." وہ روانی سے بولتے بولتے رُکا۔ یکدم چونک کر غزارا کو دیکھا۔

"what did you just say?....."

"مسٹر زید ninja میں ہوں۔ سرپرائز۔" وہ ہونٹوں پر بڑی مسکراہٹ لائے بولی۔ زید نے اُسے کچھ دیر دیکھا پھر منہ ٹیڑھا کر کے ہنکارنے لگا۔

"ہونہہ..... ہونہہ..... ہونہہ....." پھر وہ زور سے ہنس پڑا۔ غزارا کی مسکراہٹ ناگواری سے سمٹ گئی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اوکے مس ninja میں نے مان لیا ہے۔" وہ ڈرامائی انداز میں کہتا سر جھٹکنے لگا۔ غزارا کو تپ چڑھ گئی۔ اِس نے تیزی سے زید سے فون چھینا۔

"میری گیم....." اس نے مذمت کی تو غزارا نے اس کے ہاتھ پر چپت ماری۔

"دور ہو۔ تمہیں میں ابھی اپنا اکاؤنٹ کھول کے دیتی ہوں۔"

اس نے عزم سے کہتے ہوئے اپنے اکاؤنٹ کا یوزر نیم اور پاسورڈ ڈالا۔ کچھ دیر نیٹ لوڈ ہوتا رہا پھر اس کا اکاؤنٹ لاگ ان ہو گیا۔ اس نے اسکرین نمائشی انداز میں زید کے منہ کے آگے پکڑی۔

"دیکھو..... کون ہے یہ....."

زید نے بھنویں سکوڑ کر اکاؤنٹ کو دیکھا پھر اس پہ چمکتے ہوئے اسکور کو، اس کی پتلیاں پھیل

گئیں۔اس نے تیزی سے غزارا کو دیکھا پھر واپس اسکرین کو۔اس کے چہرے پر بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

''اب آیا یقین.....'' غزارا نے شانے کڑائے۔

اس نے بجھے چہرے کے ساتھ فون لے لیا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔ایک لڑکی مجھ سے آگے ہے۔'' وہ پودوں کو دیکھتے ہوئے افسوس سے کہہ رہا تھا۔غزارا کھل کر ہنس پڑی، اتنی کہ اس کو سانس چڑھنے لگا۔

وہ اس کا اکاؤنٹ کھول کر رشک سے اسکور اور لیولز دیکھ رہا تھا جو اسے ابھی پار کرنے تھے۔غزارا جب سنبھلی تو اس نے بازو پھیلا کر اُس کے کندھوں کے گرد حائل کیے۔

''پارٹنر.....تم چاہو تو میں تمہیں ان لیولز کو کراس کرنے کے راز بتا سکتی ہوں۔''

زید نے گردن موڑ کر اسے دیکھا، آنکھوں میں ایک شیطانی سی چمک تھی۔

''آر یو شور.....''

اس نے لب دبا کر تیز تیز سر ہلایا۔

''بتاؤ پھر.....'' وہ تیار ہوا۔

''ایک شرط پر.....'' غزارا نے بے نیازی دکھائی۔

''کیا؟''

''تم جب جب مجھے روتا ہوا دیکھو گے، میرے لیے پھول لاؤ گے۔'' اس نے ہتھیلی کھول کر سامنے رکھی۔''بتاؤ منظور ہے یہ شرط؟''

زید کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا۔یہ لڑکی اگر ہر وقت روتی رہی تو؟ پھر معاملہ مشکل ہو جائے گا۔اس کو پھولوں کی کھیتی کرنی پڑ جائے گی لیکن شاہجہاں سے گیم میں آگے نکلنا بھی ایک

خواب تھا جسے وہ ہر حال میں پورا کرنا چاہتا تھا اور یہ ایک اچھا موقع تھا کہ مینور سے سیکھا جائے کھیلنا۔

اس نے غزارا کی ہتھیلی پر ہاتھ مارا۔ ''او کے.....''

غزارا مسکرائی اور اس کے قریب کھسک کے اس کے فون میں دیکھتے ہوئے سمجھانے لگی کہ کیسے کھیلنا ہے۔ کب کونسا سپاہی چننا ہے اور کس ہتھیار کا کس زاویے سے استعمال کرنا ہے۔ وہ سر ہلا ہلا کر سُنتا رہا۔

جب سب سمجھ چکا تو غزارا کو دیکھ کے پرعزام انداز میں مسکرایا۔

''اب دیکھنا میں کیسے بابا کو ہراتا ہوں۔''

✿ ..... ✿ ..... ✿

(آخری قسط)

اگر چاند حسین نہ ہوتا اور زمین زادوں کو اس قدر مستعجب و متحیر نہ کرتا تو ادبِ اُردو اس کی تشبیہات و استعارات و تماثیل سے بھرا ہوا ہوتا؟ نہیں ناں؟

بات یہ ہے کہ زمین پر چاند کی کئی شکلیں ہیں، انسانی روپ میں بھی اور غیر انسانی روپ میں بھی..... جب کوئی حد سے حسین لگے تو ''چاند'' کہلانے کا مستحق بن جاتا ہے۔

جیسے وہ بنی تھی۔

پیچ رنگ کی وہ فراک اُس پر یوں کھل گئی تھی جیسے صبح کی نسیم میں، گدلے پانی کا کنول اور وہ اُسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی نے بس اسی سمت دیکھنے کا سحر پھونک دیا ہو اور وہ سُن، ساکت مجسمہ بن گیا ہو۔ پلکیں نہ جھپک رہی تھیں اور نہ ہی کھلی آنکھوں میں مسلسل تاڑنے کی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ جسم احساسِ درد سے ماورا ہو گیا تھا۔

آج چار دن بعد وہ واپس آیا تھا۔ کوریہ سے..... یانگ ہو کی شنوائی کل تھی، پہلی و آخری شنوائی۔ اُسے رہائی کی وعید سنا دی گئی تھی۔ آج سے پندرہ دن بعد اُس کی رہائی تھی۔ عدالت نے اُسے بری کر دیا تھا۔ سارے الزام واپس لے لیے تھے۔ کچھ پیسوں کی کرامات تھیں اور کچھ تعلقات کا حرص، عدلیہ جہاں کا بھی ہو، بک جاتا ہے۔

وہ غزارا کو بتائے بغیر آیا تھا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ رات میں زوبیا کے بھائی کا ولیمہ تھا جس میں وہ جا رہی تھی۔ گیسٹ روم میں نیم اندھیرا تھا۔ شیشے کے مقابل لگے اسٹینڈ پر غزارا کی موم بتیاں جل رہی تھیں جن کی سوندھی سوندھی خوشبو سے

کمرہ معطر تھا۔ گیسٹ روم کا آئینہ گداز تھا۔ جس کے کناروں پر میک اپ لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ وہ سر سے پیر تک منعکس تھی۔ شاہ جہاں ڈریسنگ روم کے دہانے پر کھڑا اسے محویت سے دیکھ رہا تھا۔

وہ گردن میں نیکلس پہن رہی تھی جس کی ہک وہ پشت پر جوڑ نہیں پا رہی تھی۔ وہ تیار ہو چکی تھی لیکن ہیلز اور نیکلس رہتے تھے۔ اُسے کشمکش میں دیکھ کے شاہجہاں قدم قدم چل کر اُس کے پاس آیا اور ہک بند کرنے کے لیے اُس کی انگلیوں کو چھوا جس کے لمس سے وہ چونک گئی۔

''شاہ..... آپ.....'' اس نے نیکلس چھوڑ دیا اور پلٹ کر اُسے دیکھنے لگی۔ ''آپ کب آئے؟ نہ جاتے وقت بتاتے ہیں نہ آتے وقت.....'' وہ خوشی سے شکوہ کر رہی تھی۔

''اگر بتا کر آؤں گا تو تمہارے چہرے پر یہ چمک بھری خوشی کیسے دیکھوں گا؟'' شاہجہاں ذرا سا مسکرایا۔

''اچھا جی۔ بہت تیز ہیں آپ۔'' وہ ٹھنک کے بولی۔ شاہجہاں ہنس دیا۔ کمرے میں موم بتیوں کی بھینی بھینی خوشبو سکون بخش ماحول ترتیب دے رہی تھی۔

''کمرہ بدلا ہے؟''

''ہاں۔'' ایک ٹھنڈا سانس نکالا۔ ''روشنا مامی کی بہن غالباً اُسی روم میں رہتی ہیں ناں۔ اس لیے میں نیچے آ گئی۔ یہ بھی اچھا ہے۔ میں نے اپنے موڈ کے مطابق اسے بھی سجا لیا ہے۔''

شاہجہاں نے ایک طائرانہ نظر اطراف میں دوڑائی پھر سر ہلایا۔ ''ہوں۔'' اور پلٹ کر اس کی گردن کو دیکھا۔ نیکلس اُس کے گلے میں ڈھیلا سا جھول رہا تھا۔

''بند نہیں ہو رہا؟''

''پاکستانی گہنے بند کرنا نہیں آتے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''لاؤ، میں بند کر دیتا ہوں۔'' اُس نے نرمی سے پیشکش کی تو غزارا نے رُخ موڑ لیا۔ شاہجہاں نے نیکلس کی دونوں طرف کی ہُک کو تھام لیا۔ اس کی اُنگلیاں اُس کی گردن کی پشت سے مس ہو رہی تھیں۔

ہُک بند ہوئی تو شاہجہاں نے پلکیں آئینے کی طرف اٹھائیں۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' غزارا نے نیکلس کو چھو کر پوچھا۔

''بہت اچھا۔'' وہ ایک قدم پیچھے ہوا۔ ''مگر تم نے یہ رنگ کیوں لیا ہے؟ کچھ سرخ نہیں لیا۔''

''سرخ۔'' وہ جیسے ٹھٹک گئی۔ ''ام نہیں۔''

''کیوں؟''

''میں نے سُنا ہے پاکستانی شادیوں میں سُرخ رنگ ضروری ہوتا ہے۔'' وہ پلٹ کے سنگھار میز سے لپ اسٹک اٹھالی۔ ''سب کچھ نہ کچھ سرخ پہنتے ہیں۔ زوبیا کے بھائی کی شادی کے لیے میں نے جان بوجھ کر کچھ سرخ نہیں خریدا۔ پتا ہے کیوں؟'' لپ سٹک لبوں پر رگڑتے ہوئے اُس نے شاہجہاں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جو اُلجھن سے دیکھ رہا تھا۔

''کیوں کہ میں یہ آپ کے لیے پہننا چاہتی ہوں شاہ۔''

شاہجہاں کے پیروں تلے بارودی بم پھٹا۔

''کامدار لہنگا، زری والا جس میں گہری گہری کلیاں ہوں گی۔ گھونگھٹ لوں گی میں، سینے تک، کسی کو آپ سے پہلے شکل نہیں دکھاؤں گی۔ یا نگ منی کو بھی نہیں۔ سرخ لپ سٹک لگاؤں گی، کاجل لگاؤں گی۔ مہندی لگاؤں گی۔ اپنے ہاتھ پہ آپ کا نام لکھواؤں گی جسے آپ ڈھونڈیں گے۔'' شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

شاہ جہاں اُسے کرب سے دیکھ رہا تھا۔ ننھے خواب، ننھے سپنے، کتنی نازک..... کتنی حساس تھی وہ لڑکی۔

''زوبیا نے بتایا ہے سب۔ پتا ہے شاہ.....'' وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ ''میں آپ کے لیے بھرپور اہتمام کروں گی۔ جشن سے آپ کا استقبال کروں گی۔'' فراک کے کونے پکڑ کر وہ ذرا جھکی جیسے شہزادیاں جھکتی ہیں۔

شاہ جہاں کا دل کچلا جا رہا تھا۔

''تم اتنا سب سوچ کے آئی ہو؟''

''ہاں۔ بالکل۔'' اُس نے ڈھٹائی سے کہا۔ وہ زخمی سا مسکرایا۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی سچائی جاننے کے بعد کیا محسوس کرے گی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکی، اِس کا ردعمل کیا ہوگا۔ کیا وہ سب سہہ جائے گی؟

''پہنائیں گے؟'' اُس نے ہاتھوں میں پکڑے جوتوں کی طرف اِشارہ کیا تو وہ خیالوں سے چونکا۔ شاہجہاں قدم قدم چل کے اُس کے پاس آیا اور اس کے ہاتھوں سے جوتے لے لیے پھر وہ گھٹنے کے بل بیٹھا، اُس کا پیر فراک کے نیچے سے نکالا اور اسے جوتا پہنایا پھر اسی طرح دوسرے پیر میں بھی پہنا دیا۔

جب وہ گھٹنا جھاڑ کر کھڑا ہوا تو دیکھا۔ غزارا اُس کے ہم قد ہوگئی تھی۔ اسے مشکور اور سراہتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''شکریہ۔'' وہ بولی۔

شاہجہاں محض مسکرا دیا۔

☆.....☆.....☆

زوبیا کے بھائی کی شادی پنڈی کے ایک اوسط درجے کے ہال میں تھی۔ ہال کی اندر کی ساکھ سجاوٹ زیادہ دیدہ زیب نہیں تھی۔ غیر مخلوط ہال کے درمیان میں ٹھوس قسم کے پردے عائد کیے گئے تھے جس کے ایک طرف خواتین تھیں اور دوسری طرف مرد۔ بچے البتہ دونوں طرف بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔

عورتوں کی سمت ایک چبوترا تھا جس پر مسندیں اور کرسیاں رکھی گئی تھیں جہاں دلہن گلابی رنگ کے لہنگے میں بڑی سی شال لیے بیٹھی تھی۔ اُس کے دونوں طرف دو صحت مند عورتیں تیز میک اور زرق برق لباس پہنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ ادھیڑ عمر خواتین کرسیوں پر متمکن تھیں۔ سلامیاں دینے والے اور ملنے والوں کے لیے دلہن کے پاس ذرا سی جگہ چھوڑی گئی تھی۔

مسندوں کے پس منظر میں پردوں، مصنوعی پھولوں اور برقی قمقموں کی مدد سے خوبصورت سجاوٹ کی گئی تھی۔ اوپر سے بارہ لائٹوں والا فانوس لٹک رہا تھا جس نے ہر چیز چمکا ڈالی تھی۔ کیمرہ مین وہیں موجود تھا، کیمرہ کندھے پر لادے، مووی بنا رہا تھا۔

زوبیا اسے پارکنگ تک لینے آئی تھی۔ وہ شاہجہاں سے بھی ملی تھی پھر ولیمہ ختم ہونے کا وقت دریافت کرتے ہی وہ غزالا کو چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ زوبیا کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔ پہلے اُس کے بابا سے پھر بہنوں سے ملی۔ ایک ایک کر کے زوبیا نے اُسے فخر سے ایک ایک رشتہ دار سے ملایا۔ وہ بظاہر تو گرمجوشی سے مل رہی تھی اور ڈی جے کے چلائے مدھم میوزک کو انجوائے کر رہی تھی لیکن وہ تہہ دل عجیب سی اجنبیت کا شکار تھی۔ زوبیا کے علاوہ وہاں سب ناآشنا تھے پھر زوبیا کو سو کام تھے۔ وہ اسے ایک پرتعش صوفے پر بٹھا کر چلی گئی جو چبوترے کے سامنے پڑا تھا۔

چھ کرسیوں کی میزیں ہال میں جا بجا لگی ہوئی تھیں جہاں لوگ رنگ برنگ چمکیلے بھڑکیلے لباس

زیب تن کیے بیٹھے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ کئی چہرے اُس کو دیکھ رہے ہیں، وہ اور زیادہ کنفیوز ہونے لگی۔ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے اِس نے فون نکال لیا اور اسکرین پہ جھک گئی۔

کچھ دیر گزری تھی جب زوبیا اس کے پاس آئی۔

''آؤ..... کھانا کھل گیا ہے۔ کھانا کھاتے ہیں۔'' اس نے غزارا کو ہاتھ دے کر اٹھنے میں مدد دی۔ وہ فراک کے پلو پکڑے، دوسری طرف گئی جہاں کونے میں ایک میز لگی تھی۔ وہاں تین اور لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔

''یہاں بیٹھ کے کھانا کھاؤ۔ میں آتی ہوں۔ بھائی نے بلایا ہے۔''

''دلہا بولوز وبیا.....'' ایک ہنس مکھ سی لڑکی نے ٹوکا۔ وہ ہنس پڑی۔

''ہاں۔ دلہا بلا رہا ہے۔ آتی ہوں۔'' وہ غزارا کے کندھے دبا کر اسے کرسی پر ڈال گئی اور خود وہاں سے چلی گئی۔ وہ سنبھل کر سیدھی ہوئی اور فہمائشی انداز میں مسکرا کے لڑکیوں کو دیکھا جو اسے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

پھر سارا کھانا باتوں میں ہی گزر گیا۔ وہ کون ہے۔ کوریہ کیوں گئی؟ واپس کیوں آئی؟ اُردو کیسے آتی ہے؟ کیا وہ کورین ڈرامے دیکھتی ہے؟ کیا وہ کسی سے ملی ہے؟ وہی حلیمہ والے سوال۔ اس نے رُک رُک کر سب کے جواب دیے اور کھانا بھی کھا لیا جو بریانی، بروسٹ، مٹن قورمہ اور پاستے پر مشتمل تھا۔

ہونٹ ٹشو سے تھپتھپاتی وہ کھڑی ہوئی تو اسے دور سے زوبیا آتی دکھائی دی۔ اُس نے آج سنہری جوڑا پہنا تھا جس پر اُس نے سرخ رنگ کا ہار اور جھمکے پہنے تھے۔ وہ ہیلز فرش پہ پٹخ کے آ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا جو سیاہ کوٹ سوٹ میں ملبوس بار بار اپنی ٹائی درست کر رہا تھا۔ وہ چونکی، غیر مخلوط ہال میں آدمی کیا کر رہا تھا؟

''اس سے ملو زوبیا۔ یہ میرا بھائی ہے یعنی دلہا۔ اور بھائی یہ غزارا شاہجہاں ہے۔ میری دوست۔ میں نے بتایا تھا ناں؟'' اُس نے ابرو اٹھا کر اشارہ کیا۔ لڑکا کچھ جز بز ہوا پھر ہمت سے مسکرایا۔

''سلام..... کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ شادی کی بہت بہت مبارک باد۔ اللہ آپ کی شادی میں برکت ڈالے۔''

''شکریہ۔ آمین۔'' وہ بولا۔ ہال میں برتنوں اور کھانا چبانے کی آوازیں چل رہی تھیں۔ لوگ بے حد باتیں کر رہے تھے۔ وہ کونے میں نہ ہوتے تو ممکن نہیں تھا کہ ایک دوسرے کو سن سکتے۔

''میں نے سُنا ہے آپ نے پسند کی شادی کی ہے؟'' غزارا نے بے تکلفی سے پوچھا۔

لڑکا پہلے شرما گیا پھر مسکرا کر سر نیہوڑا۔ ''ایسا ہی ہے۔ ہم کالج دوست ہیں۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اوہ.....'' اِس نے ابرو اٹھائے۔ ''اچھی بات ہے۔ میرا ماننا ہے شادی ہمیشہ پسند کی ہونی چاہیے۔ جو وقت پسندیدہ شخص کے ساتھ گزر سکتا ہے، کسی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔''

''یہ تو ہے۔'' زوبیا نے حمایت کی۔

''محبت کو پانا اس دنیا کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔'' لڑکے نے فخر سے کہا۔

''مگر پتا ہے غزارا۔ اس کی محبوبہ بیوی اس کے ہاتھ سے نکلنے والی تھی۔ بڑی مشکل سے یہ صاحب روک پائے ہیں اُس کو۔'' زوبیا نے بھائی کے بازو پکڑ کر چھیڑا۔ لڑکا اُداسی سے مسکرا دیا۔

''کیا مطلب؟'' غزارا نے دلچسپی لی۔

''میری بھابھی جو ہیں۔ اُن کی شادی اُن کے گھر والے نہیں کر رہے تھے، کیوں کہ یہ موصوف جاب لیس تھے۔ انھوں نے دن دگنی، رات چوگنی محنت کی جاب کے لیے۔ کئی شہروں، اسامیوں اور شعبوں کے چکر کاٹے۔ تب جا کر اِن کو نوکری ملی۔ جیسے نوکری ملی، ویسے ہی چھوکری مل گئی۔''

غزارا ہنسنے لگی۔ لڑکا دھیما دھیما مسکرا رہا تھا۔

''بھابھی تو ویٹ کر رہی تھیں اس کا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کہیں اور شادی کبھی نہیں کرتیں۔ وہ تو بس یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ بندہ محنت کرتا ہے اُن کے لیے یا نہیں۔''

''اور انھوں نے جلدی جلدی نوکری ڈھونڈ لی؟''

''وہی تو۔ کتنا بے صبرا ہے ناں یہ۔''

''ایسی بات نہیں.....'' لڑکے نے تردید کی۔ ''میں بالکل بے صبرا نہیں ہوا۔ میں تو بس سوچ رہا تھا کہ زندگی کا کیا بھروسہ..... ہمیں کب کیا ہو جائے، کون جانے۔ یاد نہیں آپی، شمس۔ ہمارا ایک کزن۔ اُس کا انتقال پچھلے سال اپنی شادی والے دن ہوا تھا۔ ایکسیڈینٹ میں۔ میں بس گھبرا رہا تھا کہ انسان خوشیاں چاہتا۔ دل خوشیاں چاہتا ہے لیکن ہم اُسے لٹکائے جاتے ہیں، پتہ نہیں کیوں، شاید ہم ڈرتے ہیں یا پھر ہم نے بے وجہ اپنے لیے مسائل کا انبار کھول رکھا ہے۔ ہر چیز کو ملتوی کرتے رہتے ہیں۔ کل کریں گے، پھر دیکھیں گے۔ زندگی کا کیا اعتبار۔ آج جو ہے، کل نہ ہو۔ کون جانے؟''

لڑکا اپنی عمر سے بڑی باتیں کر رہا تھا۔ غزارا سکتے سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''پریشان نہ ہوں غزارا۔ اس کے اندر کبھی بزرگوں کی روح آ جاتی ہے۔'' زوبیا نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''تم جاؤ۔ جا کے مردوں میں بیٹھو۔ دیکھو کتنی عورتوں نے نقاب کھینچ رکھے

ہیں ٹھیک سے کھا بھی نہیں پا رہیں۔'' زوبیا نے اُسے ہلکا سا دھکا دے کر پرے کیا پھر وہ غزارا کی طرف پلٹی لیکن اس کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ بالکل فق۔ وہ چکرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ زوبیا نے فکرمندی سے اُسے دیکھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

اس نے پتھریلی پلکیں اٹھائیں۔ ''مجھے جانا ہوگا۔''

''ہوں؟''

''مجھے جانا ہوگا ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔'' وہ پراسرار انداز میں بڑبڑائی اور زوبیا کے ہاتھ سے بازو چھڑا کر بیرونی دروازے کی طرف بھاگ گئی۔ فراک کو پہلوؤں سے پکڑے وہ روتے ہوئے بھاگے جا رہی تھی۔ ہال کی تیسری منزل سے نیچے، وہ کئی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی آئی تھی۔ باہر آ کر وہ رُک گئی۔ آنسوؤں کی وجہ سے آنکھیں بہت دھندلا رہی تھیں۔

اُس نے زور زور سے رگڑ کر اپنی آنکھیں صاف کیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ پارکنگ میں صرف مہمانوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کچھ اکا دکا لوگ تھے جن کا ہجوم یہاں وہاں ہو رہا تھا۔

وہ فراک کے پلو اٹھا کر پارکنگ سے نکلی۔

اسے شاہجہاں کے پاس بروقت پہنچنا تھا۔ اسے پرپوز کرنا تھا۔ نکاح کا پیغام دینا تھا۔ وہ دیر نہیں کر سکتی تھی۔ زندگی کا کیا اعتبار۔ کیا بھروسہ؟ وہ اپنے مسائل میں نہیں اُلجھ سکتی تھی۔ پارکنگ کے باہر ایک گلی تھی۔ وہ اس کی طرف لپکی۔ رات کے اندھیرے میں آسمان پر بجلیاں چمک رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے۔

اسے معلوم نہیں تھا وہ کہاں جا رہی ہے، وہ بس بھاگتی گئی۔ گلی سے سڑک، سڑک سے دوسری سڑک۔ کچھ دور جا کے، وہ ہانپنے لگی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک پول

کا سہارا لیا اور زور زور سے سانس خارج کرنے لگی۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ وہ بے اختیار کھانسنے لگی۔ اسے بھاگنا نہیں چاہیے۔ اس نے خود کو سمجھایا۔

اُدھر رہ کر خود کو متعدل کیا پھر پلٹ کر یہاں وہاں دیکھا۔ وہ کہاں تھی، اسے کچھ علم نہیں تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ کس سمت آ گئی تھی، اسے پتا نہیں چل رہا تھا۔ فون پہ بار بار زوبیا کی کال آ رہی تھی جس کو اٹھانے کا وقت اس کے پاس نہیں تھا۔

اس سڑک پر گاڑیاں رواں تھیں۔ وہ پول سے دور ہٹ کر فٹ پاتھ پر آئی پھر وہاں سے اُتر کر تھوڑا آگے گئی تا کہ ٹیکسی کو روک سکے۔ ایک ایک گاڑی زن سے گزر رہی تھی۔ تند و تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ بادل ٹکر ٹکر آسمان پر جمع ہو رہے تھے۔ اس کے بال جوڑے سے نکل آئے تھے، اب گردن پر جھول رہے تھے۔

اس نے ہاتھ جھلا کر کئی گاڑیوں کو اشارہ کیا لیکن وہ نہیں رُکیں۔ وہ اسی سڑک کے کنارے آگے چلنے لگی۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ جسم بے جان ہو رہا تھا۔ چند قدم آگے چل کر وہ رُک جاتی، کسی گاڑی کو دیکھتی پھر اسی طرح چلتی۔ مسلسل ایک کلومیٹر چلنے کے بعد اس کے پہلو میں ٹیکسی آ کر رُک گئی۔

''کہاں جانا ہے میڈم..... صدر میٹرو، راجا بازار؟'' بوڑھے ڈرائیور نے سر نکال کر پوچھا۔ وہ تیزی سے پیچھے آ کر بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

''ایف سکس سیکٹر چلیں۔ اسلام آباد۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ڈرائیور نے ایک نظر اس کے روتے، گھبرائے چہرے کو دیکھا پھر جی میڈم کہا اور ٹیکسی چلا دی۔

وہ شاہجہاں کو بتائے گی کہ وہ اُس سے کتنا پیار کرتی ہے۔ اُس کے لیے سارے کوریہ کو ٹھکرا کر آئی ہے۔ وہ کتنے دلوں کو روند کر، کتنی اذیتوں کو جھیل کر آئی ہے۔ وہ ایک ایک بات بتائے

گی، ایک ایک حرف جو آج تک نہیں بتایا۔ جو چھپایا تھا۔ فون کی سکرین پر چسپاں اُس کی تصویر کو وہ بے ساختہ چومنے لگی۔

''آرہی ہے تمہاری یانگ شی شاہ..... میں آرہی ہوں۔'' آدھی روتی، آدھی ہنستی وہ بالکل پاگل لگ رہی تھی۔ کم از کم ڈرائیور کو یہی لگا تھا۔ ''گاڑی تیز چلاؤ کاکا..... مجھے جلدی ہے۔'' وہ بولی۔

''خیریت ہے میڈم؟ سب ٹھیک ہے ناں؟ آپ بہت پریشان لگ رہا ہے۔'' ڈرائیور کو فکر تھی۔

''نہیں کاکا میں پریشان نہیں ہوں۔ میں خوش ہوں۔ خوشی میں رو رہی ہوں۔ جس چیز کو میں نے آج تک لٹکایا تھا اس انتظار میں کہ صحیح وقت آئے گا تو کروں گی۔ میں ملتوی کیے جا رہی تھی۔ آج معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز کا صحیح وقت ''ابھی'' ہوتا ہے۔ ذرا سی تاخیر بھی بہت دیر کر دیتی ہے۔ بہت دیر۔''

''میں کچھ سمجھا تو نہیں ہوں لیکن اللہ تمہاری مدد کرے۔''

پنڈی سے اسلام آباد کی سڑک پر گاڑی ڈالتے ہوئے ڈرائیور نے کہا۔ وہ مسکرا دی۔

اب سڑکیں بڑی، کشادہ، روشن اور پر ہجوم تھیں۔

☆.....☆.....☆

جب وہ ایف سیکٹر پہنچی تو اسے یاد آیا کہ اس نے پھول تو خریدے ہی نہیں۔ پرپوز کرنے کے لیے پھول تو لازمی شرط ہے۔ انگوٹھی وہ کوریہ سے لائی تھی لیکن پھول..... وہ ذرا سی آگے ہوئی۔

''کاکا..... پھولوں والی دُکان کے پاس گاڑی روک دیں، مجھے کچھ پھول لینے ہیں۔''

''جو آپ کا حکم میڈم.....'' بوڑھا ڈرائیور تابعداری سے بولا اور گاڑی پھولوں والی دکان

کے پاس روک دی جو اس وقت روشنیاں، خوشبوؤں اور رنگوں میں نہائی ہوئی تھی۔ دکان کے باہر لاتعداد پھول بکوں میں رکھے ہوئے تھے۔ بڑے، چھوٹے ہر طرح کے بکے۔ کچھ تو گلدانوں میں تھے اور کچھ ڈھیری کی شکل میں.....

وہ ٹیکسی سے اُتری اور اپنے پسندیدہ پھولوں کو تلاش کرنے لگی۔ کچھ لوگ وہاں حسبِ معمول پھولوں کا سودا کر رہے تھے۔ اس نے دھیان نہیں دیا کہ کون ہیں، البتہ انھوں نے اسے ایک نظر دیکھ کر سب دیکھ لیا تھا۔

اسے سرخ گلاب چاہیے تھے۔ کالے کاغذ میں لپٹے۔ مگر اسے نظر نہیں آئے۔ وہ شاپ کے اندر آئی۔ وہاں ایک لڑکا پھولوں پر چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

''سنیں..... مجھے سرخ گلاب چاہیے۔ ملیں گے؟'' اِس نے پوچھا۔ لڑکا مسکرایا۔

''کیوں نہیں میڈم۔ ابھی دیتا ہوں۔'' اس نے اسپرے کی بوتل ایک طرف رکھی اور دکان کے کونے میں چلا گیا، وہاں سے وہ دو بکے اٹھا کر لایا۔ ایک سفید رنگ کا، دوسرا سنہرے رنگ کا۔ دونوں میں غنچوں والے گلاب ترتیب سے بندھے تھے۔

''یہ لیں.....'' اس نے نمائشی انداز میں بکے اُس کی طرف بڑھائے۔

''مجھے کالے ریپر میں چاہیں۔ کیا کالا ریپر ملے گا؟'' اس نے عاجزی سے پوچھا۔ وہ دکاندار کو تنگ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لڑکے نے سر نیہوڑا۔

''کیوں نہیں۔ ابھی ڈال کے دیتا ہوں۔''

اس نے پھول کاؤنٹر پر رکھے پھر اگلی طرف گیا، جھکا، نیچے سے ایک بڑا سا چارٹ نکالا۔ اسے کون کی شکل میں لپیٹا پھر سنہرے بکے سے ایک ایک کر کے گلاب اُس میں رکھنے لگا۔ لڑکے نے کتنی مہارت سے بیس گلاب اس بکے میں سجا لیے تھے۔ لپیٹی ہوئی جگہ پر لڑکے نے

سنہری ڈوری باندھی، پھر اوپر سیاہ bow لگائی اور اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ لیں میڈم۔ خوش؟''

اس نے مسکرا کے بکے پکڑا۔ ''بہت شکریہ۔'' اور پرس سے پیسے نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیے لیکن لڑکے کے اٹھانے سے پہلے وہ باہر آ گئی۔ ٹیکسی والا سیٹ پر بیٹھا، دکان کو گھور رہا تھا۔ وہ پھریری سے آگے آئی اور دروازہ کھینچا۔

''کہاں جا رہی ہو یانگ شی؟ مجھ سے نہیں ملو گی؟''

وہ رُکی۔ پلٹ کر دیکھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے، نرمی سے مسکراتی حمنہ اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سیدھی ہوئی۔

''حمنہ آپی آپ؟''

''سرخ گلاب.....'' حمنہ نے بکے کی طرف دیکھا۔ ''سرخ گلاب تو تب خریدے جاتے ہیں جب کسی سے اظہارِ محبت کرنا ہو یا کسی کو.....'' وہ رُکی، لہجہ پراسرار ہوا۔ ''پرو پوز کرنا ہو۔''

غزارا نرمی سے مسکرا دی۔ ''ٹھیک کہا آپی۔ میں کسی کو پرو پوز کرنے والی ہوں۔''

''کس کو؟''

''شاہ کو.....'' وہ ہلکی سی شرمائی۔ حمنہ کی پیشانی تن گئی۔

''تم میرے شوہر کو پرو پوز کیسے کر سکتی ہو یانگ شی؟''

''جی؟'' آسمانوں پر بجلی شدت سے چمکی۔

''شاہ جہاں میرا شوہر ہے۔ کیا اُس نے تمہیں نہیں بتایا؟'' حمنہ نے واجبی افسوس سے اُس کو دیکھا۔ غزارا کے چہرے پر ایک رنگ آ کے گزر گیا۔

''آپ کی شادی.....تو.....تو آؤٹ آف فیملی ہوئی تھی ناں؟''

''ہیں؟ یہ کس نے بتایا ہے تمہیں۔ میری شادی شاہجہاں سے ہوئی تھی۔ یہ دیکھو۔''
اُس نے فون میں پہلے سے نکالی ہوئی اپنے نکاح اور ولیمے کی تصویر اُسے دکھائی۔ کچھ لمحے وہ اس تصویر کو دیکھتی رہی پھر اس نے خوفزدہ سی نگاہیں اٹھا کر حمنہ کو دیکھا جو محظوظ انداز میں مسکرا رہی تھی۔
غزارا کا سانس رُک گیا۔

☆.....☆.....☆

حمنہ اسے حویلی کے سامنے ڈراپ کر کے چلی گئی تھی۔ وہ پچھلے پندرہ منٹ سے حویلی کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ بارش تیزی سے برس رہی تھی۔ موٹی موٹی بوندوں کی مسلسل بوچھاڑ میں وہ غلط جگہ نصب مجسمے کی طرح بھیگی چلی جا رہی تھی۔ فراک کی کلیوں کی نچلی سطحیں کیچڑ سے لت پت تھیں۔ میک اپ بہہ چکا تھا۔ بال کھل کر نم لٹوں کی مانند گردن سے چپکے ہوئے تھے۔
وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سڑک پر بہتے پانی کو دیکھ رہی تھی جس پر بارش کے قطرے گر رہے تھے اور چھینٹیں اس کے بازوؤں اور فراک پر پڑ رہی تھیں۔
شاہجہاں.....اس نے کراہ کر سانس لینے کی کوشش کی.....سانس نہیں آ رہا تھا.....دل کی دیواروں سے خون پلٹ پلٹ کر شرارے مار رہا تھا۔ سینہ ایک دم جلنے لگا تھا لیکن آج اِس نے دل نہیں سہلایا.....آج اس نے زور سے آکسیجن نہیں کھینچی.....
وہ بے جان قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ آہستہ سے آہنی دروازہ دھکیلا اور چھوٹے قدموں سے اندر آئی۔ پورچ کی ٹھوس اینٹوں پر پانی کی بوندیں پٹخی جا رہی تھیں۔ حویلی کی منعکس روشنیاں بارش کو مسرتوں میں لپیٹ رہی تھیں۔ کیسا رومانوی منظر تھا لیکن وہ کہیں نہیں

تھی، غزالا شاہ جہاں کہیں کی نہیں رہی تھی۔

فراک نم ہونے کی وجہ سے اور بھاری ہوگئی تھی۔ وہ بمشکل قدم اٹھا رہی تھی۔ دوپٹہ جانے کہاں رہ گیا تھا، اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ نہ زماں میں تھی نہ مکاں میں..... بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئی تو حمنہ کی باتوں کو جھٹک رہی تھی۔ دل مان نہیں رہا تھا، دماغ سب مان چکا تھا لیکن دماغ کی کون سُنتا ہے؟

وہ دل کی ملکہ تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا حمنہ نے جھوٹ بولا ہے۔ شاہجہاں ایسے کیسے کر سکتا ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اٹوٹ محبت۔ وہ کیسے دھوکا دے سکتا ہے؟ نہیں۔ یہ سراسر فریب تھا۔ سراسر کذب تھا۔

گھر والے کھانا کھا رہے تھے۔ اوپن ڈائنگ سے چمچوں پلیٹوں اور باتوں کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ ڈائنگ کی مشرقی دیوار شیشے کی تھی جو پوری لاؤنج میں کھلتی تھی۔ وہ جیسے ہی وہاں نمودار ہوئی۔ حلیمہ جس کا رُخ اُس کی طرف تھا، اس کی نظر پڑ گئی۔

''یانگ شی.....'' وہ چمچ منہ تک لے جاتے جاتے رُک گئی۔ سب نے اس کی آواز پر چونک کر اُس سمت دیکھا۔

وہ لاؤنج کے وسط میں گومگو کھڑی تھی جیسے گوشت کا ایک ڈھیر ہو۔ بھیگی فراک سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور سانس ناہموار۔

شاہجہاں یکدم پریشان ہو کے اُس کے پاس آیا۔

''یانگ شی..... تم خود کیوں آ گئیں۔ میں نے کہا تھا ناں میں لینے آؤں گا۔ لیکن تم سُنتی نہیں ہو۔ دیکھو کتنی بھیگ گئی ہو۔ اب بیمار ہوگئی تو، جاؤ جا کے روم میں کپڑے بدلو اور.....''

''حمنہ آپ کی بیوی نہیں ہے ناں؟'' اِس نے چکرائی ہوئی پلکیں اٹھائیں۔ وہ جو روانی

میں کہہ رہا تھا، اس سوال پر پوری حویلی اُس کے سر آن گری۔

''ہمم؟'' وہ جیسا خواب سے جاگا۔

''حمنہ آپی کی بیوی نہیں ہیں ناں؟'' اس بار اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ ڈائننگ میں کھانا کھاتے لوگ یکدم رک گئے۔ سب نے سراسیمہ نظروں کا تبادلہ کیا۔

شاہجہاں کچھ بول نہیں سکا۔

''انھوں نے کہا کہ آپ نے دس سال پہلے شادی کر لی ہے۔ زید..... یہ چھوٹا لڑکا آپ کا بیٹا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے مجھ سے رابطہ بھی اسی لیے توڑا تھا۔ وہ کہتی ہے..... وہ کہتی ہے..... آپ نے پسند کی شادی ہے..... اپنی ..... اپنی ..... مرضی سے اُسے چُنا تھا۔'' وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

اوہ حمنہ..... یہ تم نے کیا کر دیا۔ یہ ایسے تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ابھی تو نہیں، ابھی تو وقت تھا..... اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں..... باہر زور سے بادل گرج رہے تھے۔ بجلیوں کی چمک کھڑکیوں کے پردوں پر گر رہی تھی۔

''Climax کا وقت آ گیا ہے بھابھی بیگم..... چلیں، مزہ لیتے ہیں۔'' روشنا نے سفا کی سے کہا اور پھر کھانا کھاتے سب لوگ اٹھ اٹھ کر لاؤنج میں آئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

''شاہ..... مجھے جواب دیں۔ چپ کیوں ہیں؟ مجھے سچ سچ بتائیں۔ آپ نے شادی نہیں کی ناں۔ آپ ابھی تک میرا انتظار کر رہے ہیں ناں۔ حمنہ آپی نے بھیانک مذاق کیا ہے میرے ساتھ۔ آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہے ناں۔''

وہ کرب میں اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس کے لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ سر جھکا ہوا تھا۔

''میں نے پندرہ سال سے محبت کی ہے آپ سے۔ میرے ایک ایک بندنے، ایک ایک خلیے نے چاہا ہے آپ کو۔ میں آگ کا دریا پار کر کے آئی ہوں۔ مجھے میرے شاہ پہ پورا بھروسہ ہے۔ حمنہ آپی نے جو دکھایا، جو بولا۔ وہ سب deep fake تھا۔ Edited تھا۔ کمپیوٹر کا زمانہ ہے، کوئی بھی کسی کے ساتھ بھی تصویر مخلوط کر سکتا ہے۔ انھوں اپنی بھی کی ہوگی۔ میرا شاہ ایسا نہیں ہے۔ آپ نے مجھ سے محبت کی ہے۔ مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اور کوئی بھی انسان اپنا وعدہ.....''

''یہ سچ ہے یا نگ شی.....'' شاہجہاں نے اُس کی کلائیاں پکڑ لیں۔ ''حمنہ میری بیوی ہے اور زید ہمارا بچہ۔''

بادل زور سے گرجے۔ بجلی پوری قوت سے چمکی.....

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔

''یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے دس سال پہلے ہی شادی کر لی تھی۔''

''ایک اور جھوٹ.....''

''اسی لیے تم سے رابطہ بھی توڑا تا کہ تم مجھے اپروچ نہ کر سکو.....''

''بکواس ہے.....''

''میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ تم میرے بارے میں ایسا سوچو۔''

''چپ ہو جائیں شاہ۔ چپ ہو جائیں۔'' وہ سسکنے لگی۔

''میں Paedophile نہیں تھا۔ میں نے صرف ایک ہمدرد کی طرح ٹریٹ کیا تھا تمہیں۔''

(وہ تم سے پندرہ سال چھوٹی ہے۔ تمہارے لیے بالکل بہن جیسی ہے وہ۔)

غزارا نے سسکتے ہوئے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اس کے دل میں ٹیس اٹھنے لگی تھی۔

''تمہیں اس وقت ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ میں صرف وہ سہارا بنا تھا۔''

(جب دل ٹوٹ جاتے ہیں تو heal ہو جاتے ہیں لیکن recover نہیں ہوتے۔)

''تم مجھے دوست کہہ سکتی ہو، مجھے اپنا مینٹور کہہ سکتی ہو لیکن تم مجھے.....'' وہ رُکا۔ کرب سے اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ ''تم مجھے اپنا ''شوہر'' نہیں کہہ سکتیں۔''

آکسیجن ختم ہو گئی تھی۔ دھڑکن رُک گئی تھی۔ سارا جہاں لٹ گیا تھا۔ غزارا عرف یانگ شی تباہ ہو گئی۔

(تم ایک عمر کو پہنچ چکے ہو، سینتیس سال کافی ہوتے ہیں کہ مرد کو پختہ کرنے کے لیے۔ تمہارا بیٹا اُس کے چھوٹے بھائیوں جیسا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ تم اتنی کم عمر اور نوخیز لڑکی سے شادی کا سوچو۔ کیا تمہارے اندر ذرا شرم حیا نہیں ہے۔)

''تمہاری محبت جیسی بھی ہے۔ جو بھی ہے۔ اُسے بھول جاؤ۔''

(یعنی مر جاؤں؟)

''کوریہ میں اچھے لڑکے ہیں۔ تم ان میں سے کسی سے شادی کر لینا۔''

(غزارا نے آنکھیں میچ لیں۔ درد بڑھ رہا تھا)

''میں، میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں۔ میں وہ تمہیں کبھی نہیں دے سکتا، جو تمہیں چاہیے۔ I can't be your husband۔ میرا ایک بچہ ہے۔ ایک بیوی ہے۔ ہم اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہاں۔ میں مانتا ہوں وہ مجھ سے ناراض ہے لیکن ہم بہت جلد اکھٹے ہو جائیں گے۔''

(اگر کوئی اس وقت غزارا سے پوچھتا؛

"Doe's Cheating and rejection hurts?"

تو وہ کہتی:

("NO,it kills."

"میں تمھیں خود بتانا چاہتا تھا۔ اچھا ہوا، حمنہ نے میرا کام کر دیا۔ یانگ شی تم سمجھدار ہو گئی ہو۔ مجھے تم پہ فخر ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں ایک اچھا شوہر اور ایک بہترین ساتھی ملے گا۔ یہاں تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم چلی جاؤ، جہاں سے آئی ہو۔ لوٹ جاؤ۔ پلیز۔"

(اگر کوئی اس وقت شاہجہاں سے پوچھتا۔"Is it hurting?"

تو وہ کہتا:

("No,It's Bleeding."

شاہجہاں نے اُسے دھیرے سے پیچھے کیا اور بغیر اُسے دیکھے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر چلا گیا۔

وہ نقش کالجر بن کھڑی رہی اُس کھلاڑی کی طرح جو بہت دور سے دوڑ کر آیا ہو۔ جس کے جسم میں کھڑے ہونے کی سکت نہ ہو، جس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی ہوں۔

"سن لیا؟ ہو گئی تسلی؟" طاہرہ بیگم نے اسے کندھے سے پکڑ کر موڑا۔

وہ چپ تھی..... بالکل چپ.....

"تمہیں کیا لگا ہمارا شاہجہاں تمہارے لیے پندرہ سال انتظار کرتا رہے گا؟" روشانے پھبتی اڑائی۔ "بچپن کا وعدہ تھا بے وقوف لڑکی۔ بچوں کو بہلانے کے لیے ایسے وعدے کیے جاتے ہیں۔"

"اور اسے دیکھو۔" کرن نے مداخلت کی۔ "یہ سچ مچ آ گئی۔ منہ اٹھا کر کہ شاہجہاں اس

سے شادی کرے گا۔"

"ہمدردی کو محبت سمجھی تھی۔ بچوں کو تو لوگ پیار کرتے تو کیا ان سے شادی بھی کر لیتے ہیں۔" طاہرہ بیگم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھاگی ہوئی ماں کی بیٹی کو اتنے لمبے خواب دیکھنا زیب نہیں دیتا۔" روشنا طنز سے بولی۔

غزارا سینہ ٹھوک کے زور زور سے سانس نکالنے لگی۔ دل کی ٹیس اب بائیں بازو، کندھے اور گردن تک جا رہی تھی۔ اس کا جسم جکڑا جا رہا تھا۔

"میں نے بہت اذیت سہی ہے شاہ۔"

"حمنہ ناراض ہوئی ہے اس سے۔ میاں بیوی میں ناراضیاں آ ہی جاتی ہیں۔ تمہیں کیا لگا، وہ علیحدہ رہتے ہیں تو تمہاری گنجائش نکل آئے گی؟ میری لاش پر تم اُس کی زندگی میں آ سکتی تھیں غزارا..... میری لاش پر۔ میرے جیتے جی تم میرے بیٹے کی بیوی کبھی نہیں بن سکتی تھیں۔" طاہرہ بیگم نے سفاکیت سے چھاتی پیٹ لی۔

"شاہ جیسا کوئی نہیں۔"

"کیا ہوا گر بیوی ناراض ہے۔" روشنا نے طاہرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ناراضگیاں تو چلتی ہیں تو کیا چلتے پھرتوں سے دوسری شادی کر لیں پھر تو ہمارے مردوں کو بھی کر لینی چاہیے۔"

"میں شاہ سے شادی کروں گی۔ میرا وعدہ ہے۔"

"ماں پہ گئی ہے ناں۔ ماں بھی تو سر کڑائے بھاگ گئی تھی۔ من مانیاں تو خون میں ہیں ان کے۔"

غزارا کا درد اب گھٹنوں اور ٹخنوں میں پھیل گیا تھا۔ سانس اب اٹکنے لگا تھا۔ پھیپھڑوں کا

زور ختم ہو گیا تھا۔

بہر سو جلوہ دلدار دیدم

''من مانیاں نہیں بھابھی بیگم۔ باغی ہیں یہ۔ کمینی خصلت ہیں۔'' کرن نے کہا۔

''ارے۔ گالیاں نہ دو۔ شکل تو دیکھو اس کی۔ کیسی معصوم۔ جیسے کل پیدا ہوئی ہو۔ مزے سے اٹھ کر آ گئی کہ شاہجہاں شادی کر لے گا۔ تم لوگ ہی رہ گئے ہو شادی کے لیے اب۔ سارا زمانہ ختم ہو گیا۔'' روشنا نے ناک بھوں چڑھائی۔

''شاہ کے پاس پکستان چلی جاؤ یانگ شی.....'' اس کا فون بج رہا تھا۔ یانگ منی کی کال آ رہی تھی۔ ''شاہ، تمہاری مدد کرے گا۔ دل کے درد کو دل کا طبیب چاہیے ہوتا ہے۔''

بہر چیزے جمال یار دیدم

''جب میں بیس سال کی ہو جاؤں گی تو پاکستان آ کر آپ سے شادی کروں گی۔''

''اب سر جھکائے کیوں کھڑی ہے؟ دفع ہو جا یہاں سے۔''

''افسوس کر رہی ہے بھابھی بیگم۔''

''میرے پاس صرف ایک سال ہے۔''

''افسوس کو کچھ نہیں بچا صاحب زادی۔ ماتم کرو۔ ماتم۔''

''میں نے ہر لمحے آپ کو سوچا ہے۔'' ماضی کی بازگشت اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ سینے کو مکوں سے ٹھوک رہی تھی۔ یہیں کہیں سانس اٹکا تھا۔ یہیں کہیں۔

نماز زاہدان محراب و منبر

''جس کا بھرم لے کر تم یہاں آئی تھیں۔ وہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں۔ اس لیے اپنا سامان پیک کرو اور الٹے قدموں لوٹ جاؤ یہاں سے اور دوبارہ کبھی اپنی شکل مت دکھانا۔ دفع ہو جاؤ

یہاں سے....." طاہرہ بیگم نے اُسے دھکا دیا۔

"ہاں..... ہاں نکلو یہاں سے....." روشنا نے بھی جھٹکا۔ وہ محض ایک قدم آگے گئی..... پھر قدم لڑکھڑائے، جسم کانپا، اس نے زور سے سانس کھینچا لیکن سانس نہیں آیا۔ اس نے دل کو زوردار گھونسہ مارا، کاش ایک، کاش ایک نس چل جائے۔ ایک روجل اٹھے، ایک شرارہ پھوٹ جائے لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ستون کو پکڑنا چاہا لیکن نہیں پکڑ سکی۔ اس کا دل کچل گیا، شریانیں ٹوٹ گئیں۔ توازن یوں بگڑا کہ وہ ڈگمگائی اور اس زور سے چکرائی کہ پورے قد سے فرش پہ آن گری۔

بادل ہیبت سے گرجے، بجلی کڑک کے کوندی اور غزارا شاہجہاں نے آخری سانس لیا۔ کلائی میں بندھی اُس کی گھڑی نو بج کر سینتیس منٹ پر تھم گئی تھی!

نماز عاشقان بہ دار دیدم.....!

☆.....☆.....☆

آج وہ پھر گودام میں بے ہوش ہوئی تھی۔ وہ سیمنٹ کے گودام میں بوریاں گننے اور لادنے کا کام کرتی تھی۔ دھول سے اٹی، سیمنٹ سے بھری بوریاں جب ایک دوسرے پر لاد کر اونچے اونچے ٹھیکریاں بنادی جاتی تھیں تو گودام میں دھول بھر جاتی تھی جس کی وجہ سے اسے سانس نہیں آپاتا تھا۔ وہ ماسک لگاتی تھی لیکن پھر بھی ہر پندرہ منٹ بعد وہ باہر نکل کر زور زور سے سانس لیا کرتی تھی۔

بسا اوقات جب ٹرک آجاتے تھے اور بوریاں لوڈ کرنی ہوتی تھیں، وہ کئی گھنٹوں تک اندر رہتی جس کی وجہ سے اس کا سانس پھولنے لگ جاتا تھا۔ دوبار اسی طرح وہ بے ہوش ہوئی تھی

جس پر منیجر اسے فیکٹری کے میڈیکل روم لے جایا کرتا تھا۔ وہاں اسے آکسیجن لگتی، ڈرپ لگ جاتی اور اُس کی طبیعت ٹھیک ہو جاتی۔ منیجر جانتا تھا کہ وہ اتنی کڑی مشقت صرف اپنے باپ کی رہائی کے لیے کر رہی ہے اور کہیں نہ کہیں اسے یانگ ہو سے ہمدردی تھی۔ اس لیے اتنی ناسازی کے باوجود، وہ اس لڑکی کو کام کرنے دے دیا کرتا تھا۔

لیکن آج جو وہ بے ہوش ہوئی تو میڈیکل روم سے بھی ہوش میں نہیں آئی۔ مجبوراً منیجر کو اسے ایمولینس منگوا کر قریبی ہسپتال لے جانا پڑا۔ وہ اس وقت وارڈ میں ایڈمٹ تھی۔ آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا۔ ہاتھ کی پشت پر ڈرپ کی سوئی ٹھونسی ہوئی تھی جہاں سے زرد مائع اُس کے شریانوں میں دھیرے دھیرے اُتر رہا تھا۔

ڈاکٹر اس کے سینے پر سٹیتھوسکوپ کا میڈل لگائے، پھیپھڑوں کی آواز سُن رہا تھا۔ وہ کارڈیولوجسٹ تھا جو اس کا علاج پچھلے دس سال سے کر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر منھ سے ماسک ہٹایا۔

''میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر۔ پلیز میرا سینہ دبانا بند کریں۔'' اُس نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''مجھے دیکھنے دو مس یانگ شی..... اس دفعہ تم ٹھیک نہیں ہو.....'' وہ تشویش سے کہہ رہے تھے۔ وہ ہنس پڑی۔

''کیا اب تم مجھے یہ کہو گے کہ میں جاب چھوڑ دوں، صحت پر توجہ دوں؟''

''نہیں..... اب میں یہ کہوں گا کہ تم زیادہ سے زیادہ وقت اپنے دوستوں، گھر والوں اور اُن کے ساتھ گزارو جو تمہیں اچھے لگتے ہیں۔'' وہ سٹیتھوسکوپ کانوں سے ہٹا کر کلپ بورڈ میں نتھی اُس کی رپورٹس کو دیکھنے لگے۔ وہ اس بات پر ذرا سی چونک گئی۔

''کیا مطلب؟'' اس نے تکیہ سے انچ بھر سر اٹھایا۔

''مس یانگ شی۔آپ کو یہ بات تحمل سے سُننا ہوگی۔''انھوں نے پیشہ ورانہ سنجیدگی اختیار کی۔

''بولیے۔سن رہی ہوں۔''اس نے خود کو تیار کیا۔

''دس سال سے جو آپ کے دل میں سوراخ تھا۔وہ کچھ ملی میٹر پھیل گیا ہے اور جس مقدار سے آپ نے کام کر کے اپنی صحت کو نظر انداز کیا ہے۔آپ کا یہ ننھا دل،اب زیادہ نہیں دھڑک سکے گا۔مجھے معاف کرنا لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کے پاس محض ایک سال کا عرصہ ہے پھر یہ دل،یہ دل مردہ ہو جائے گا۔''

اس کا سر زور سے تکیے پر گر گیا۔ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ ہمدردی سے اسے دیکھا۔

''میں نے کہا تھا آپ سے کہ آپ کے دل میں اتنی طاقت نہیں ہے،جتنا آپ اس سے کام لے رہی ہیں۔آپ نے میری ایک نہیں سُنی۔ایک سال،ایک سال بھی شاید زیادہ ہے۔دل جس رفتار سے دھڑک رہا ہے،ای سی جی رپورٹ جو دکھا رہی ہے۔مجھے معاف کرنا لیکن تمہارا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔اتنا کمزور کہ تم زور سے ہنسو گی بھی تو سانس رُک جائے گا۔''

وہ چھت کو کھوکھلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔اِس نے تو کبھی نہیں سوچا تھا کہ دل اس حد تک ناتواں ہو جائے گا۔دل،دل تو ایک مضبوط عضو ہے۔زندگی کو متحرک رکھتا ہے۔پورے جسم کو محنت و جاودانی سے خون مہیا کرتا ہے۔کیا یہ بھی کمزور ہو سکتا ہے؟

سائنسی طور پر.....ہاں

روحانی طور پر.....ہاں

جسمانی طور پر.....ہاں

جذباتی طور پر.....ہاں

جب ہاں ہی جواب تھا تو پھر اسے خوش فہمی کیسے ہو گئی کہ وہ ٹھیک ہے؟خود کو کٹہرے میں

کھڑا کر کے وہ پوچھ رہی تھی۔ کیوں یانگ شی؟ کیا اتنی جلدی دل کا تباہ ہو جانا اچھی بات ہے؟

''زیادہ مت سوچو۔ خوش رہنے کی کوشش کرو۔ اُداسی اس کے لیے مزید خرابی لا سکتی ہے۔

''ڈاکٹر نے سمجھایا۔ وہ بے آواز رو پڑی تھی۔ آنکھوں کے کونوں سے آنسو تکیے میں جذب ہونے لگے تھے۔

ڈاکٹر نے ہمدری سے سر جھٹکا پھر پلٹ کر دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔

''ڈاکٹر.....'' اس نے دھیرے سے پکارا۔ وہ جاتے جاتے رُکا۔

''جی مس یانگ شی.....''

''کیا آپ میری ای مو سے یہ بات راز رکھ سکتے ہیں؟''

''کیا مجھے یہ راز رکھنا چاہیے؟'' ڈاکٹر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''میری ای مو کو نہ بتائیں کہ میرے پاس صرف ایک سال ہے۔ بابا کا ہرجانہ بھرنے کے لیے بھی ایک سال ہے۔ ہم دو دو غم نہیں پال سکتے ڈاکٹر۔ پلیز میری مدد کریں۔'' وہ گڑگڑائی۔ نظریں تا حال چھت کو گھور رہی تھیں۔

''وہ آپ کا غم بانٹ سکتی ہیں۔''

''اُن کے پاس اپنے بہت غم ہیں۔ وہ میرے غم سے مزید پریشان ہوں گی۔'' اس نے کہا جس پر ڈاکٹر نے ٹھنڈا سانس نکالا۔

''ٹھیک ہے۔ میں اُن سے نہیں کہتا لیکن اپنی صحت کے بارے میں آپ کو سنجیدہ ہونا پڑے گا مس یانگ شی۔'' انھوں نے سختی سے نصیحت کی۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ اب کیا سنجیدہ ہونا۔ اب تو زندگی نے ایک الٹی میٹم دے دیا تھا۔ دل کے زور کو نچوڑ لیا تھا۔ اب کیا ہی بچا تھا زندگی کے لیے.....

اسپتال سے ڈسچارج ہو کر جب وہ گھر آئی تو ڈاکٹر کی ساری باتیں دماغ میں چل رہی تھیں۔ایک سال، پیاروں کے ساتھ وقت، دوستوں کے ساتھ وقت..... یانگ منی دوڑ دوڑ کر اس کے کھانے کو کچھ بناتی رہتی تھی تا کہ وہ کچھ کھا سکے۔لیکن وہ بمشکل کوئی نوالہ لیتی پھر ایک گھونٹ پانی پی کر لیٹی رہتی۔

اُس دن یانگ منی نے رامین بنائے تھے۔وہ ہاٹ پاٹ اٹھائے اس کے کمرے میں چلی آئی اور میز پر ہاٹ پاٹ رکھنے کے بعد وہ کھڑکیوں کی طرف گئی، پردے زور سے دائیں بائیں سرکا دیے۔

''اٹھ جاؤ یانگ شی ہی۔ میں نے تمہارے لیے رامین بنائے ہیں وہ بھی بیف کے ساتھ۔اٹھو اور اپنے دن کی اچھی شروعات کرو۔'' یانگ منی اس کا کمبل کھینچے، گنگناتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''رامین بنائے ہیں؟'' یانگ شی نے لمبا سا سانس کھینچا، رامین کی خوشبو کو معدے میں جذب کیا لیکن پھیپھڑے جذب نہیں کر سکے۔وہ کھانس کر رہ گئی۔یانگ منی نے فوراً اُس کی پیٹھ سہلائی۔

''آرام سے آرام سے.....تم کمزور ہو گئی ہو.....''

ذرا سی دیر سہلانے کے بعد وہ رُک گئی۔پھر اسے ہاتھ دے کر نیچے اُترنے میں مدد دی۔

نہا دھو کر جب وہ میز کے ساتھ نیچے اکڑوں بیٹھی تو یانگ منی نے چاپ اسٹک اور باؤل اُس کی طرف بڑھایا۔رامین سے دھواں اٹھ رہا تھا۔اس نے باؤل پکڑ کر چاپ اسٹک سے کئی رامین نکالے اور فوں فوں کر کے منہ میں ڈال لیے۔اسے اندر تک سکون ملا تھا۔

یانگ منی نے ایک نوالہ لیا تو رُک کر اسے دیکھنے لگی جو کتنی لاغر ہو گئی تھی۔چہرے کی دمق

اور آنکھوں کی روشنی ختم ہوگئی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں تھیں اور آنکھوں کے نیچے حلقے۔ جوٹی شرٹ اس نے پہنی تھی، اُس میں اُس کا جسم جھول رہا تھا۔

''یانگ شی.....'' اس نے چاپ سٹک چاٹ کے ایک طرف رکھے۔'' کچھ بات کرنی تھی۔''

''کروناں ای مو۔'' اُس نے کھاتے ہوئے کہا۔

''تم جاب چھوڑ دو۔ میں سنبھال لوں گی سب کچھ۔ تم بس گھر میں بیٹھ کے آرام کرو۔ جیسا ڈاکٹر نے کہا ہے۔''

''اور تم چار چار جاب کیسے کروگی ای مو؟'' اس نے پریشانی سے اُسے دیکھا۔

''میں کرلوں گی۔ میں تو صحت مند ہوں، تمہارے دل میں سوراخ ہے۔ تمہیں اپنا خیال رکھنا ہے۔''

''سوراخ سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے پیسے کما کے اپا کو باہر نکالنا ہے بس۔'' وہ عزم سے بولی تو یانگ منی نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''یانگ شی..... ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہیں کسی گہرے صدمے یا شاک سے بچانا ہوگا مجھے۔ تمہارا دل گہرا صدمہ نہیں سہہ سکتا۔ اس میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ اس لیے میری بات مانو، گھر ہی رہو۔ باہر لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اوپا کے بارے میں۔ وہ تمہیں تکلیف دیتے ہیں مجھے پتا ہے۔ اس لیے جتنا گھر میں رہوگی، اتنی جلدی تندرست ہوگی۔''

''لیکن ای مو۔ اپا کی رہائی بھی تو کرنی ہے۔ تمہاری جاب سے تو بس گھر کا خرچ ہی چل سکتا ہے۔'' اس نے ہاتھ کھینچ لیے اور واپس رامین کھانے لگی۔

یانگ منی کے دل نے کہا یہی تو مسئلہ ہے۔ چار چار نوکریوں سے گھر کا خرچ نکلتا ہے۔ وہ

اوپا کا خرچ کیسے نکالے گی۔ کمپنی کو ہرجانے کی قسط کہاں سے دے گی۔ وہ دنوں بری طرح مجبور تھیں۔ لیکن یہ سب یانگ شی کی جان سے زیادہ نہیں تھا۔

''یانگ شی..... تم میری پیاری بھتیجی ہوناں؟ میری ایک بات مانو گی؟'' انھوں نے پھر کوشش کی۔

''جاب نہیں چھوڑوں گی ای مو۔''

''تم پکستان چلی جاؤ.....'' وہ تیزی سے بولیں۔

وہ کھاتے کھاتے رُکی۔ ''کہاں؟''

''پکستان۔ اپنے شاہ کے پاس۔ تمہارے دل کو اُس کی ضرورت ہے۔''

''شاہ کیا کرلے گا میرے دل کو؟'' اس نے مکھی جھلائی۔

''تسکین دے گا۔ جیسے وہ دیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا مجھے کہ تمہیں ایسے لوگوں کے پاس رکھوں جو تمہیں خوش رکھ سکتے ہوں۔''

''وہ تو تم بھی رکھ سکتی ہو۔''

''رکھ سکتی ہوں لیکن میرے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔''

''لیکن ای مو۔ شاہ کو میں یاد ہوں گی۔ دس سال سے کوئی رابطہ نہیں ہوا اُس سے۔''

''تم اُسے بھول سکی ہو؟'' یانگ منی نے پوچھا۔

''میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی ای مو۔ وہ میرا دل ہے، میری دھڑکن ہے۔''

''تو پھر اپنے دل اور اپنی دھڑکن کو اُس کے طبیب کے پاس لے کر جاؤ۔ جاؤ یانگ شی، چلی جاؤ اپنے شاہ کے پاس۔''

ایسا نہیں تھا کہ وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُس نے شاہ جہاں سے وعدہ کیا تھا لیکن اپا

کی مزید سزا نے اسے کوریہ میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شاہجہاں اس کے لیے قیمتی تھا اور باپ اہم۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ کس کی مانے؟ باپ کو انصاف دلائے یا اپنے دل کو سکون؟ پھر اس نے دل پر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس لیے بقول وعدے، اسے دو سال قبل چلے جانا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں جا سکی۔

یانگ منی نے اسے مجبور کیا کہ وہ پاکستان آ جائے لیکن وہ ایک شرط پہ مانی تھی کہ وہ پاکستان میں جاب کرے گی، پیسے کمائے گی پھر اسے بھیجے گی تا کہ وہ اپا کی رہائی کے لیے پس انداز کر سکے۔

یانگ منی اس پر راضی ہوگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دس سال قبل یکا یک اس کے دل میں سوراخ کی تشخیص ہونا، اُس جدائی کا سبب بھی ہو سکتا ہے جو اسے شاہجہاں سے ملی تھی یا پھر وہ یہی لمحہ تھا جب شاہجہاں نے بے وفائی کی تھی۔ اور یقیناً یہی وجہ کاری تھی۔ وہ شاہجہاں کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ ایسی چاہ، اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس سے الگ ہو کر، اس کی خط و کتابت کے رک جانے پر ہی تو وہ زار زار ہوئی تھی۔

اور پھر دل کا طبیب ہی تو دل کا مرض ٹھیک کر سکتا ہے۔ اُس نے سوچا وہ شاہجہاں کے پاس رہے گی تو اس کے دل کو بھی تسلی ہوگی کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ دوسرا شاہ کے ہوتے، اُسے کوئی صدمہ نہیں ہو سکتا۔ اتنا تو یانگ منی کو بھی اُس ان دیکھے شخص پر اعتماد تھا جس کے لیے اپنے جسم کی دنیا یانگ شی لٹائی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

یانگ منی سوچ رہی تھی کہ اُس نے کیوں غزارا کو پاکستان بھیجا؟ کیوں اس کے شاہ کے پاس بھیجا؟

سیاہ کپڑوں میں لپٹی، منہ پر ٹشو رکھے۔ وہ پھولوں سے ڈھکے تابوت کو دیکھ رہی تھی جو حویلی کے لان میں سفید کپڑے پر پڑا تھا جس کے گرد کئی خواتین سفید و سیاہ کپڑوں میں ملبوس بیٹھی ہوئی تھیں۔ آگے پیچھے جھولتیں، سپارے پڑھتیں۔ اس کے گلے لگ کر ہمدردیاں جتاتیں۔ اگر بتیوں کی ماتمی خوشبو اور پر اسرار خاموشی کی چھیدتی چنگھاڑتی چیخیں، ہر طرف بلند ہو رہی تھیں۔

کوئی صدمہ نہیں تھا اُن کو۔ کوئی افسوس نہیں تھا اُن کو۔ وہ تو خوش تھے۔ بلا ٹل گئی تھی۔ وہ جیت گئے تھے۔ لاؤنج میں بیٹھی حمنہ عرفان پزا کھاتے ہوئے ٹرکش ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں پر بڑی مسکان تھی اور آنکھوں میں مسرت بھری چمک۔ حالانکہ ڈرامے میں کوئی موت کا منظر چل رہا تھا۔

کہا گیا تھا کہ اُسے ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ اُس نے دوا نہیں لی تھی۔ اُسے سانس چڑھ گیا تھا۔ وہ بارش میں بھیگ گئی تھی۔ کتنی ہی وجوہات تھیں جو طاہرہ بیگم اور ممانیاں تعزیت کے لیے آنی والی عورتوں کو دے رہی تھیں۔ حویلی پہ کالے کوے منڈلا رہے تھے لیکن کون دیکھ رہا تھا؟ کون دیکھ رہا تھا کہ اُس کی موت ہارٹ اٹیک سے نہیں، صدمے سے ہوئی تھی۔

ہارٹ تو اس کا دس سال سے اٹیک میں تھا۔

آنکھیں بد بدکر وہ سب کیسے بناوٹ سے ٹسوے بہا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ اسٹڈی میں کرسی پر براجمان تھا۔ سفید شلوار قمیص پہ سیاہ شال اوڑھے۔ میز پر پڑے اُن کاغذات کو دیکھ رہا تھا جو یانگ شی کی زندگی کے پچھلے دس سال کا احاطہ کر رہے تھے۔

''میں نے خود کو ایک سال دیا ہے شاہ۔''

اِس کے دائیں سمت یانگ منی بیٹھی ہوئی تھی۔ گود میں ہاتھ رکھے، سر جھکائے رو رہی تھی۔ یانگ شی کی موت پر وہ اکیلی آئی تھی۔ یانگ ہو نہیں تھا۔

''اس ایک سال میں مجھے اتنے پیسے کمانے ہیں کہ بابا رہا ہو جائیں۔''

ایک سال اُس نے خود کو نہیں دیا تھا۔ زندگی نے اُسے دیا تھا۔ وہ اپنا آخری وقت اُس کے ساتھ گزارنے آئی تھی۔

''دس سال پہلے ایک رات اچانک وہ بے ہوش ہوگئی۔'' یانگ منی نے نم آواز سے کہنا شروع کیا۔ اسٹڈی میں نیم اندھیرا تھا۔ لیمپ کی ہلکی زرد لائٹ دونوں کے چہروں پر گر رہی تھی۔ دیوار میں لگے گھڑیال کی ''ٹک ٹک'' بہت زور سے گونج رہی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

''ہسپتال لے جانے پر معلوم ہوا کہ اُس کے دل میں سوراخ ہے۔ بارہ سال تک ہمیں یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ میرے ساتھ کام کرنے جاتی تھی۔ کوریا میں بچے پالنا بہت مشکل کام ہے اور اگر آپ مقروض ہوں تو یہ ناممکن بن جاتا ہے۔ میں نے چاہا کہ وہ پڑھ جائے لیکن میں پیسے نہیں بنا سکی۔ وہ کم عمری سے میرے ساتھ کام کرنے لگ گئی تھی۔ جب دل کا مرض معلوم ہوا تو میں نے اُسے سختی سے روک دیا تھا کہ وہ کسی کام کو ہاتھ نہ لگائے لیکن میری گرتی ہوئی صحت اور قرض نے اُسے آرام کرنے نہیں دیا۔ وہ کم عمر تھی لیکن سمجھدار تھی۔ تم سے رابطہ ختم ہوا تو اُس کا سارا دھیان اپنے باپ پہ چلا گیا۔ شاید تم دونوں اُسے ایک جیسا پیار دیتے تھے۔''

شاہجہاں کے چہرے پر کرب ہی کرب تھا۔ پتلیاں ساکت تھیں اور لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

''میری یانگ شی بہت..... بہت سٹرانگ تھی۔'' یانگ منی نے ہچکی لی۔ ''ان میڈیکل

رپورٹس کے بارے میں اُس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ اگر پوسٹ مارٹم نہ ہوتا تو.....'' ایک سانس کھینچا۔ ''میں ہمیشہ، ہمیشہ لاعلم رہتی۔ وہ تم سے بہت پیار کرتی تھی شاہ۔ بہت پیار۔ میں نے دیکھی ہے۔ اُس کی لمحہ بہ لمحہ محبت۔ کاش وہ تم سے شادی کر لیتی۔ کاش اُسے ہارٹ اٹیک نہ آتا۔'' یانگ منی نے ٹشو منہ پر رکھ کر زور زور سے ہچکیاں لیں۔

گھر والوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ غزارا کی موت سے پہلے کیا ہوا تھا۔ سب کو لاعلم رکھا گیا تھا۔ اُس لمحے غزارا کو بلاشبہ ہارٹ اٹیک آیا تھا جو Medically proved تھا لیکن ہارٹ اٹیک لانے والے حالات کیسے پیدا ہوئے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ یانگ منی بھی نہیں۔

شاہجہاں نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔

☆.....☆.....☆

گھر میں تعزیت کے مہمان روز روز آ رہے تھے۔ سٹنگ روم اور لاؤنج مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ آج یانگ شی کو گئے ہفتہ ہو چکا تھا۔ یانگ ہو دو دن میں رہا ہونے والا تھا۔ شاہجہاں چاہتا تھا کہ وہ بھی پاکستان آئے، اپنی بیوی اور بیٹی کی قبر دیکھنے۔ اس لیے وکیل سر توڑ کوششوں میں لگا ہوا تھا۔

ہفتہ ہو چکا تھا۔ شاہجہاں کمرے سے باہر نہیں آیا تھا۔ اپنی یانگ شی کی موت پر وہ رویا نہیں تھا۔ پتھرا گیا تھا۔ پتھر رویا نہیں کرتے۔ پشیمانی، پچھتاوا، کرب۔ اُس کا جسم فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس احساس کو پہلے لائے، کس کو بعد میں۔

اپنے ڈریسنگ روم میں وہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا باکس کھلا تھا جس میں بچوں کے مختلف کھلونے اور چیزیں تھیں۔ یانگ شی جب کوریا گئی تھی تو بہت کچھ چھوڑ گئی تھی۔

شاہجہاں نے ان دو سالوں میں اُس کے لیے بہت کچھ خریدا تھا۔ اُس کے آناً فاناً جانے کے بعد، اِس نے وہ تمام چیزیں محفوظ کر لی تھیں۔ جب وہ واپس آئی تو اِس نے کئی بار ارادہ کیا کہ اُسے یہ سب دکھا دے مگر حالات موزوں نہیں ہو سکے۔

گلابی گڑیا۔ عید کی چوڑیاں۔ ہیئر بوز۔ بالوں کی کلپس، پنیں۔ گھڑیاں۔ جرابیں۔ بینڈز۔ میک اپ کے کیوٹ کیوٹ سامان۔ بیگز۔ اسٹوری بکس۔ قلم۔ ڈائریاں۔ رنگ۔ کیا کچھ نہیں تھا وہاں۔ کسی کا پورا بچپن آباد تھا۔

وہی شلوار قمیص اور شال اوڑھے وہ اُس تصویر کو دیکھ رہا تھا جو غزارا نے بنائی تھی۔ ایک راستہ جہاں وہ اُس کا ہاتھ پکڑے چلا جا رہا تھا۔ اِس کے ساتھ ''S'' لکھا گیا تھا یعنی شاہجہاں۔ اور اُس کے ساتھ ''Y'' لکھا تھا یعنی یانگ شی۔ کینوس کا وہ صفحہ رز رد ہو گیا تھا۔ سطح بوسیدہ ہو گئی تھی اور رنگ مٹے مٹے جا رہے تھے لیکن یانگ شی کے ہاتھوں کی تمازت آج بھی وہاں موجود تھی۔ وہ رنگوں پر انگلیاں پھیر کر اس تمازت کو محسوس کر رہا تھا کہ اِسی لمحے دروازہ سرک گیا اور وہ اندر آئی۔

اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ وہ کون ہے۔ وہ تصویر کو دیکھنے میں منہمک تھا۔

حمنہ نے اپنا بیگ اندر رکھا پھر مسکرا کر اسے دیکھتی آگے آئی لیکن اس سے قبل کہ وہ شاہجہاں پہ جھکتی، اس کی مسکراہٹ اوجھل گئی۔ غزارا کا سارا سامان شاہجہاں کے ارگرد بکھرا ہوا تھا۔ یعنی وہ مر کر بھی زندہ تھی۔

اس نے سختی سے دانت بھینچ لیے۔

شاہجہاں نے تصویر نیچے رکھی اور کچھ اور تلاش کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر سامان میں ہاتھ مار رہا تھا جب پشت پہ کھڑی حمنہ نے کچھ اسٹیکرز اٹھائے۔

''اسے ڈھونڈ رہے ہو؟'' اسٹیکرز آگے کرتے ہوئے وہ بولی۔ شاہجہاں چونک پڑا۔

''تم؟''

''چونک کیوں گئے؟ پہلی بار دیکھ رہے ہو؟'' وہ محظوظ سی مسکرائی۔ شاہجہاں نے درشتی سے اُس کے ہاتھ سے اسٹیکرز چھینے اور جلدی جلدی سامان واپس باکس میں ڈالنے لگا۔

''یانگ شی کا سامان ہے۔ تم نے ابھی تک رکھا ہوا تھا۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ کہاں۔ کہاں رکھا تھا۔''

وہ باکس اٹھا کر سیف کی طرف بڑھا تو حمنہ کا منہ شاک سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اُس نے بڑے سے سیف کا کوڈ ڈال کر اُسے کھولا اور باکس اس میں رکھ کے بند کر دیا۔ (کوڈ حمنہ نے دیکھ لیا۔)

''تم نے۔ تم نے سیف میں یہ رکھا تھا؟'' وہ صدمے سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''کیوں آئی ہو؟'' وہ پلٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔

''کیوں آئی ہوں؟ کیا مطلب۔ میرا گھر ہے۔ میں آسکتی ہوں۔'' حمنہ نے ٹھنک کے کہا۔ شاہجہاں کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر جھٹکا اور شال اُتار کے اسٹینڈ پہ ڈال دی۔ اب وہ الماری کھولے اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔

''میں واپس آ گئی ہوں۔'' اُس نے آگاہ کیا۔

شاہجہاں کا ہاتھ رُک گیا۔ اُس نے پلٹ کے حمنہ کو دیکھا جو اِسے مسکرا کے دیکھ رہی تھی۔

''میں نے سوچا اب چلے جانا چاہیے۔ تمہیں میری ضرورت ہوگی۔'' وہ قدم قدم چلتی اُس کی طرف آئی۔ ''تم ایک کٹھن حالات سے گزر رہے ہو۔ ایسے میں، میرا فرض ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔''

وہ اُس کے کپڑوں کو دائیں بائیں کرنے لگی پھر اُس نے ایک کریم رنگ کی شرٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھائی۔

''مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس کے ہاتھ سے شرٹ لے کر وہ چبا کے بولا۔

''تم ٹھیک کیسے ہو سکتے ہو۔ وہ مری ہے۔ کوئی چھوٹا غم تو نہیں اُس کا مرنا۔''

''تمیز سے بات کرو اس کے بارے میں۔'' شاہجہاں نے آنکھیں دکھائیں۔

''اس میں تمیز والی کیا بات ہے۔ مرے ہوئے کو مرا نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ شہید؟''

''اپنی زبان پہ اُس کا ذکر بھی مت لاؤ۔'' وہ دھاڑا۔

''غصہ کیوں ہو رہے ہو؟ میں نے تھوڑی مارا ہے اُسے۔'' اُس نے برا مانا۔ شاہجہاں نے اپنی مرضی کی شرٹ نکالی پھر اُسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''اگر اُس دن تم اُسے نہ بتاتیں تو وہ نہ مرتی۔ پتا نہیں تم نے اُسے کیا کیا بتایا۔ سچ جھوٹ۔ من گھڑت کہانیاں سنائی ہوں گے اُسے۔ جب ہی تو وہ سہہ نہیں پائی۔ اور پلیز Dont act like innocent۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے۔ اس سب کی ذمہ دار صرف تم ہو۔ صرف تم۔''

حمنہ دانت کچکچا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہجہاں نے ایک اچٹتی نظر ڈالی اور پلٹ گیا۔

''صرف میں قصوروار نہیں ہوں۔ تم بھی ہو۔ مت بھولو، اُس رات میں نے اکیلے کچھ نہیں کیا تھا۔ تم بھی شامل تھے۔''

وہ جو جا رہا تھا۔ یکدم رُک گیا۔

حمنہ اُس کے سامنے آئی۔

''تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی شاہجہاں صاحب۔اگر میں نے گناہ کیا تھا تو ثواب تم نے بھی نہیں کمایا۔''

''You seduced me''

''You Chose Seduction.'' وہ دوبدو بولی۔ وہ اگلا سانس نہیں لے سکا۔

''مجھے کسی سے محبت ہوگی ناں شاہجہاں تو مجھے دُنیا کا کوئی لڑکا seduce نہیں کر سکے گا۔ میں کسی سے مخلص ہوں گے ناں تو کسی کا نشہ، کسی کا حسن، کسی کی چال کسی کی seduction مجھے بہکا نہیں سکے گی۔''

''Get off my way'' اُس نے لودیتی آنکھوں سے کہا۔

''she got off your way (وہ ہٹ گئی ہے تمہارے راستے سے۔) کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ تم جیسا وحشی اُسے ڈزرو نہیں کرتا۔ جو اپنی نفسانی خواہش نہیں روک سکا۔ وہ محبت کیسے نبھا سکتا ہے۔ مجھ سے شادی کر کے، مجھ نہ چھو کر۔ تم یہ مت سمجھو کہ تم اُس کی محبت کو دوام دے رہے ہو۔ تم۔'' اس کا سینہ ٹھوکا۔ ''ایک بزدل مرد ہو شاہجہاں۔ تم نے اُس دن مجھے کہا تھا کہ میں حامد جیسا کاہل، بزدل اور پیٹھ پہ وار کرنے والا مرد deserve کرتی ہوں۔ وہ کاہل نہیں تھا۔ وہ غیرت مند تھا۔ اُس نے تم پہ کم از کم وار تو کیا اپنی عورت کے لیے اور تم نے کیا کیا؟ اپنی محبت کو چیٹ کیا۔ اُسے دھوکا دیا۔''

شاہجہاں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ گردن کی رگیں تن گئیں۔

''بزدل مرد وہ نہیں ہوتا جو سینے پہ وار نہ کر سکتا ہو۔ بزدل مرد وہ ہوتا ہے شاہجہاں صاحب

جو اپنی عورت کی غیر موجودگی میں اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔ جو اُس کے حصے کی محبت، کسی اور کو دے دے۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس کی پتلیاں پھڑ پھڑائیں۔

"نہیں جاؤں گی میں۔ اب میں اِدھر ہی رہوں گی۔ ہر لمحے تمہیں یاد دلاؤں گی کہ تم نے کیا کیا۔"

شاہجہاں نے اُسے بازو سے کھینچ کر پرے دھکیلا مگر اگلے ہی لمحے وہ اُس پر جھپٹ پڑی۔

"کیا ہوا سچائی نہیں سُن سکتے۔ اُس دن تو مجھے لیکچر دے رہے تھے، اب خود سچ نہیں سُنا جا رہا۔"

"پیچھے ہو جاؤ۔ تمہیں سنائی نہیں دے رہا؟" وہ دھاڑا۔

"نہیں۔"

شاہجہاں نے زوردار چماٹ اُس کے منہ پہ دے ماری۔ وہ بے ساختہ لڑکھڑائی۔

"اب سنائی دے دیا ہوگا۔"

حمنہ گال پر ہاتھ رکھ کے سیدھی ہوئی۔ "تم نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا ہے؟" شاک سے اُسے دیکھ رہی تھی جو پینٹ نکال رہا تھا۔ انداز میں لاپرواہی تھی۔

"ہاؤ ڈیئر یو۔" اس نے شانے سے تھام کر اُسے موڑا اور اُس کا گریبان پکڑ لیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی؟"

"خود کو قابو میں رکھو۔" اس کی کلائی پکڑ کر اُسے پیچھے کیا۔

"میں نے ساری زندگی تمہیں دی ہے اور تم نے..... تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے؟" وہ بدستور صدمے میں تھی۔

"یہ زندگی اپنی مرضی سے دی ہے میں نے مانگی نہیں تھی۔"

''تو مسٹر شاہجہاں تم ابھی بھی ٹھیک نہیں ہو گے میرے ساتھ؟'' وہ احمقانہ انداز میں ہنس پڑی۔ شاہجہاں لاتعلقی سے واشروم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ڈریسنگ میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

بیس منٹ بعد جب وہ گیلے بالوں میں تولیا رگڑتا ہوا باہر آیا تو وہ نہیں تھی۔ وہ بے زاری سے آئینے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور تولیہ ایک طرف ڈال دیا۔ جب وہ جھکا اور ہیئر برش اٹھانے لگا، اِس کی نظر آئینے میں نظر آتے سیف پہ پڑی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا۔

سیف میں باکس نہیں تھا۔

''حمنہ۔'' سختی سے دانت دباتا وہ باہر کی طرف لپکا۔

☆.....☆.....☆

لان میں ایک ڈھیر کو آگ لگی ہوئی تھی۔ کتابیں، کپڑے، قلم سب جل رہا تھا۔ تیز سیاہ دھواں اوپر اٹھ رہا تھا اور شعلے لپک لپک کر بلند ہو رہے تھے۔ وہ بانہوں میں باکس پکڑے ایک ایک کر کے یا تگ شی کی ساری چیزیں آگ میں جھونک رہی تھی۔ گھر والے بھی وہاں موجود تھے۔ چچا۔ چچیاں۔ کزن۔ بچے۔ سب۔

جب اُس نے باکس میں ہاتھ ڈالا تو اگلی چیز وہی تصویر نکلی۔ اس نے باہر نکال کر طنزیہ نظروں سے کچھ دیر اُسے دیکھا پھر وہ نیچے بیٹھی اور تصویر کا کونا آگ کے شعلے پر رکھ دیا۔ اسی لمحے شاہجہاں تصویر پہ جھپٹ پڑا اور تیزی سے اچک لی۔ پھونک مار مار کے اُس نے آگ بجھائی مگر آدھی تصویر جل کر راکھ ہو چکی تھی۔

''یہ کیا کیا تم نے جاہل عورت؟'' وہ صدمے سے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا مطلب کیا کیا؟ مرے ہوؤں کی چیزوں کو گھر میں رکھنے سے اپشگون ہوتا ہے۔ بس

اُسے ٹھکانے لگا رہی تھی۔'' وہ باکس پھینکتے ہوئے ہاتھ جھاڑ کے بولی۔

اگلی ہی پل شاہجہاں نے بے دردی سے اُس کے دوسرے گال پہ تھپڑ مارا۔ اس بار بھی وہ لڑکھڑائی۔ گھر والوں کے منہ کھل گئے۔

''تمہارے کرنے کو رہ گیا تھا یہ سب؟'' کہنی سے پکڑ کر اُسے سیدھا کیا۔

''تم نے دوبارہ مجھے مارا۔'' وہ اب رو رہی تھی۔

''شاہجہاں یہ تم نے کیا کیا؟ بچے کے سامنے بیوی پر ہاتھ اٹھایا ہے؟'' روشنا نے بناوٹ سے زید کو قریب کیا۔ شاہجہاں نے پلٹ کر دیکھا۔ زید دونوں کو چکرائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اِس نے تیزی سے حمنہ کی کہنی چھوڑی۔

''آخر کب ختم ہوگا تم دونوں کا یہ جھگڑا؟'' سلیمان صاحب بے قابو ہوئے۔ ''اکھاڑے میں پہلوان بھی اتنا نہیں لڑتے جتنا تم دونوں لڑتے ہو۔ کچھ احساس ہے تم دونوں کو کہ گھر میں کیا حالات چل رہے ہیں؟''

''تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' حمنہ بدتمیزی سے چلائی۔ ''بیس منٹ پہلے اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے اور یہ پھر مارا ہے۔ اپنی محبوبہ کے مرنے کا سارا غبار یہ مجھ پہ نکال رہا ہے۔''

''شاہجہاں؟؟'' طاہرہ بیگم کو اچھو لگا۔

''اس کی زبان بند کرائیں ناں۔ کیوں یا نگ شی کو بار بار لا رہی ہے بیچ میں؟'' اس نے طیش سے پوچھا۔

''میں لا رہی ہوں اُس کو؟'' حمنہ نے گال سے ہاتھ ہٹایا۔ ''تم لاتے ہو اُس کو۔ جب وہ پہلی بار کوریا سے آئی تھی۔ تب تم لائے اُسے بیچ۔ پھر جب چلی گئی۔ پھر تم نے جانے نہیں دیا۔ جب دوبارہ آئی۔ پھر بھی وہ ہمارے بیچ رہی۔ اب جب وہ مر گئی ہے۔ پھر بھی وہ نہیں جا رہی۔

وہ ہمیشہ ہمارے بیچ رہے گی۔ وہ کبھی نہیں جائے گی۔ جہنم میں چلی جائے گی۔ میری زندگی سے نہیں جائے گی۔'' وہ حسد کی انتہا سے کہہ رہی تھی۔

''تمیز سے بات کرو اُس کے بارے میں۔'' شاہجہاں چلایا۔

''نہیں کروں گی۔ کیا کرلو گے۔ دوبارہ مارو گے۔ مارو۔''

وہ گال آگے کرتے ہوئے قریب آئی۔ شاہجہاں نے ہاتھ بلند کیا مگر اس سے قبل کہ وہ مارتا، طاہرہ بیگم نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بس کرو۔ گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں اور تم لوگوں کے تماشے ختم نہیں ہو رہے۔'' انھوں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ حمنہ صدمے سے اُس ہاتھ کو دیکھ رہی تھی جو تیسری بار اُس پہ اٹھنے والا اٹھا۔ ڈھیر سے اٹھتے دھوئیں میں اب پلاسٹک کی بدبو شامل ہوگئی تھی۔ چیزیں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھیں۔

''دو بار تم نے میری بیٹی پہ ہاتھ اٹھایا ہے۔ صرف ایک مری ہوئی لڑکی کے لیے؟'' عفت بیگم چبھتے ہوئے لہجے میں کہتی شاہجہاں کے روبرو آئی۔ عرفان صاحب کے نتھنے بھی پھول رہے تھے۔

''بس ختم کرو اس بات عفت کو۔ جانے دو۔ سب چلو یہاں سے۔ اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔'' طاہرہ بیگم نے ملکانی کی طرح سب کے آگے ہاتھ جھلائے مگر عفت نے تیزی سے اُنھیں کندھا مارا۔

''نہ تو آپ بی جان ہیں بھابھی بیگم اور نہ میں آپ کی فرمابردار بہو کہ آپ ہاتھ جھلائیں گی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' وہ اُنھیں دیکھ کے تیزابی لہجے میں بولی۔ طاہرہ کے اوسان جاتے رہے۔ انھوں نے ماں کی پشت پر بیٹے کو دیکھا۔

''اُس چھنال کی بیٹی کے لیے تم نے میری بیٹی کو مارا شاہجہاں؟''

''بدتمیزی پہ مارا ہے۔ یانگ شی کا نام نہ لیں چچی۔''

''میری بیٹی دس سال سے تمہارے نکاح میں ہے۔ دس سال سے۔ ایک بار بھی تم نے اُسے بیوی کا حق نہیں دیا۔ پھر بھی وہ صبر سے، شکر سے تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔ شکوہ کرتی بھی ہے تو مجھ سے یا اپنے باپ سے۔ کیا اس کی کوئی صفائی دو گے تم؟''

''میری بیوی بننے کا شوق تھا ناں اسے چچی۔ شوق ہی پورا کر رہا ہوں میں۔'' وہ بے نیازی سے ہنس پڑا۔ حلیمہ نے زید کو کلائی سے پکڑا اور اسے وہاں سے لے گئی۔ گھر والے دم سادھے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''مجھے تمہاری بیوی بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔'' حمنہ نے گیلی سانس کھینچی۔

''اچھا۔'' وہ فرصت سے اُس کی طرف مڑا۔ ''پھر اُس رات کیوں میرے کمرے میں آئی تھیں؟''

''میں تمہارے کمرے میں خود نہیں آئی تھی۔'' وہ چلائی۔

''بس کرو تم دونوں۔ چلو حمنہ تم۔'' عفت نے تیزی سے بیٹی کو کھینچا۔

''کہیں نہیں جاؤں گی میں۔'' اُس نے سختی سے بازو چھڑایا۔ ''آج سب کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ یہ کس نے کیا تھا۔''

طاہرہ بیگم کا دل ڈوب کر اُبھرا۔ عفت کی سانس تیز ہو گئی۔

''اس سب کی ذمہ دار یہ ہیں۔'' اُس نے طاہرہ بیگم کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''تائی امی۔ انھوں نے مجھے کہا تھا کہ شاہجہاں کو seduce کرو۔ اُس دن انھوں نے مجھے وہ ڈریس لا کر دیا، مجھے سمجھایا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کیسے شاہجہاں کو بہکانا ہے۔ رات کا وہ پہر بھی انھوں

نے منتخب کیا تھا۔"

سب نے تیزی سے طاہرہ بیگم کو دیکھا۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھیں۔

"جھوٹ بول رہی ہے یہ لڑکی۔ اپنے کانڈ کا الزام میرے سر ڈال رہی ہے۔"

"یہ الزام نہیں ہے تائی امی۔ آپ ہی نے میرا رشتہ شاہجہاں کے ساتھ طے کیا تھا۔ آپ ہی انھیں پریشرائز کر رہی تھیں ناں۔ آپ جانتی تھیں وہ یانگ شی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ہی نے یہ چال چلی۔"

طاہرہ بیگم نے رکھ کر اُسے تھپڑ مارا۔

"بکواس بند کرو۔ ذلیل لڑکی۔ ایک تو میرے بیٹے کو ورغلا کر اُسے شادی کی اور اب میرے سر الزام لگا رہی ہے۔"

"یہ الزام نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ شاہ۔" وہ تیزی سے مڑی۔ "شاہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ کی امی نے مجھے بھیجا تھا آپ کے پاس۔"

"اپنی بیٹی کو لگام ڈالو عفت ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" انھوں نے جون بدلا۔

"ماما کو نہ دھمکائیں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آپ نے کیا ہے کیوں کہ آپ نہیں چاہتی تھیں کہ یانگ شی کی شادی شاہجہاں سے ہو۔ آپ پھوپھو کو پسند نہیں کرتی تھیں کیوں دادی اُن کو پیار کرتی تھیں اور آپ اکثر اُنہی کی وجہ سے صلواتیں سنتی تھیں۔ آپ دادی کی جگہ لینا چاہتی تھیں۔ مگر دادی نے نہیں دی۔ آپ کو پھوپھو سے نفرت تھی۔ اس لیے آپ یانگ شی سے بھی نفرت کرتی تھیں۔" حمنہ بہادری سے کہے جا رہے تھے۔ طاہرہ بیگم کی پیشانی پر متواتر لکیریں اُبھر رہی تھیں۔

"آپ نے یہ سارا منصوبہ بنایا۔ آپ ہی نے مجھے کہا تھا کہ میں اپنا حمل ضائع نہ کروں۔ بچہ پیدا کروں تاکہ شاہجہاں اور مجبور ہو جائے۔"

''کیا کیا کہہ رہی ہے یہ لڑکی اور آپ سب سُن رہے ہیں۔'' انھوں نے خفگی سے گھر والوں کو دیکھا۔

''بس کرو۔ میری ماں پہ الزام نہ لگاؤ۔'' شاہجہاں نے غصے سے دھاڑا۔ طاہرہ بیگم کی پیشانی کا تناؤ کچھ کم ہوا۔

''آپ کو لگتا میں الزام لگا رہی ہوں؟'' حمنہ نے تیزی سے پوچھا۔

''ہاں۔ کچھ نہیں سوجھ رہا تو ساس پہ کچرا ڈال رہی ہو۔''

''اچھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر میرے سوالوں کے جواب دیں۔'' حمنہ نے بے دردی سے گال رگڑے اور خود کو کمپوز کیا۔ طاہرہ بیگم کے دل میں نیا خوف پیدا ہو گیا۔ کیسے؟ کونسے سوال؟

''اُس رات میں آپ کے ساتھ سوئی ہوں۔ گھر والوں کو کیسے پتا چلا؟ کون سب کو جگا کر لایا تھا؟''

''مجھے شاہجہاں کے کمرے سے تمہاری آوازیں آئی تھیں۔ اس سے سب اٹھ کر آئے تھے۔'' طاہرہ بیگم نے جھٹ سے کہا۔

''آوازیں؟ مگر ہمارا دروازہ پہلے بجا تھا اور چلانا میں نے بعد میں شروع کیا تھا۔ کیوں شاہ۔ یہی ہوا تھا ناں؟''

شاہجہاں کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اُس نے ماں کو دیکھا۔

''مجھے کیوں ایسے دیکھ رہے ہو؟ میں اس کی آواز سن کے آئی تھی۔'' وہ نظریں بچانے لگیں۔

''مگر امی اس نے تو کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔'' شاہجہاں نے نرمی سے کہا۔ طاہرہ بیگم کا سانس رُک گیا۔ سب نے پلٹ پلٹ کے اُنھیں دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے ایسے مت دیکھو سب۔'' وہ گڑبڑانے لگیں۔

''آپ تین بجے جاگ کر کیا کر رہی تھیں طاہرہ بیگم؟'' سلیمان صاحب نے ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

''جی؟''

''تین بجے ہم نے اُنھیں پکڑا تھا۔ سب سے پہلے آپ پہنچی تھیں۔ ہمارا کمرہ شاہجہاں سے بہت دور ہے۔ شاہ عالم کا کمرہ سامنے ہے اور عمران کا بھی۔ اُن دونوں کے اٹھنے سے پہلے آپ کیسے وہاں پہنچیں؟''

طاہرہ بیگم کے تلووں پر لگی سر پہ بجھی۔

''میں..... میں..... وہ.....'' بے اختیار اُنھیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

''کہیں دیں کہ آپ تہجد کے لیے اُٹھی تھیں۔'' حمنہ نے طنز سے کہا۔

''چپ کرو تم۔ میں شاہجہاں کو دیکھنے گئی تھی کہ وہ آیا ہے یا نہیں۔ میری عادت ہے۔ پتا تو ہے تم سب کو۔'' انھوں نے چہرے کو چھو کر حالت قابو کرنے کی کوشش کی۔

''مگر اُس دن تو میں کہیں نہیں گیا تھا امی۔ جب سونے کے لیے جا رہا تھا تو آپ ہی نے کہا تھا ناں کہ دودھ پی کر جانا اور میں نے منع کر دیا تھا پھر آپ کس کو دیکھنے آئی تھیں؟''

طاہرہ بیگم کے دل میں ٹیس اٹھی۔ اُف اُف۔

''اُس رات تو میں بھی کمرے میں تھا۔ بلکہ میرے ساتھ عاطف اور سمیر بھی تھے۔ جب شور شروع ہوا تو ہم تینوں سونے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے تو ہمیں کوئی آواز نہیں آئی تھی۔'' شاہ عالم نے سادگی سے کہا۔

طاہرہ بیگم کا سانس تیز ہوا۔ بار بار وہ خشک گلا تر کر رہی تھیں۔

''تائی امی۔ اگر میں نے یہ سب خود کرنا ہوتا تو میں کبھی نہ چلاتی۔ سب کچھ کر کے، چپ

چاپ وہاں سے نکل آتی لیکن یہ آپ کی منصوبہ بندی تھی کہ سب گھر والوں کو جگائیں گے۔ ہمیں پکڑیں گے اور پھر زبردستی نکاح ہوگا۔"

حمنہ نے آخری کیل ٹھونک دی۔ ڈھیر سے نکلنے والی آگ اب بجھ رہی تھی۔

طاہرہ بیگم نے دل پکڑ لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لان میں طلسماتی خاموشی چھا گئی۔ کئی لمحوں تک صرف شعلوں کی بھڑ بھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا امی؟" سسکتے میں شاہجہاں کی ٹوٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ انھوں نے گیلی آنکھیں کھولیں۔ وہ بہت بکھر کر انھیں دیکھ رہا تھا۔

"میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی شاہ۔ میرے بچے۔"

"کیا میں خوش ہوں امی؟" کرب سے پوچھا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔

"بتائیں مجھے۔ کیا میں خوش ہوں۔ کیا ہم خوش ہیں؟"

"مجھے معاف کر دو۔ میں نے۔ میں نے سب تمہاری خوشی کے لیے کیا تھا۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے آگے آئیں۔ شاہجہاں پتھر کا مجسمہ بن کر کھڑا تھا۔ ہاتھ سے تصویر چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔

"آپ نے مجھے صرف یانگ شی سے دور کیا ہے امی۔ آپ نے اپنے بیٹے کو بدنام کیا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ تڑپ اٹھیں۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھ معاف کرو شاہ۔ مجھے معاف کر دو۔" انھوں نے سسکتے ہوئے اپنا سر اُس کے سینے پر رکھ دیا۔

شاہجہاں چکرائی آنکھوں سے انھیں روتا ہوا سنتا رہا پھر اُس نے نرمی سے انھیں کندھے سے تھاما اور پیچھے کر دیا پھر وہ رُکا نہیں۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

تازہ تازہ مٹی پر ڈھیروں پھول کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ خاک کی اس ڈھیری پر اگربتیاں جل رہی تھیں۔ اطراف میں تازہ کھودی ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی تھی معلوم ہوتا تھا کسی کا خوشبو سے بھرا دل دفن ہو کے گیا ہو۔

وہ اس کے پیروں میں کھڑا تھا۔ ہاتھ میں گلدستہ تھا۔ چار پھولوں کا گلدستہ۔

سفید شرٹ اور نیلی پینٹ پہنے۔ بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ..... سوجی ہوئی آنکھیں لیے۔

وہ آج رویا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے رونا آ ہی گیا تھا۔ وہ یانگ ہو اور یانگ منی کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔

یانگ ہو..... جن کی ساری دنیا لٹ گئی تھی۔

وہ رہا ہو چکا تھا اور دیکھ رہا تھا ان دو ہستیوں کو جن کو وہ جیل جانے سے پہلے اکیلا چھوڑ کر گیا تھا اور جیل سے رہا ہونے کے بعد، وہ اسے اکیلا چھوڑ گئی تھیں..... اس کی بیوی ثمن..... اس کی بیٹی غزارا۔

''مجھے ایک رنگ کے پھولوں والا بکے نہیں پسند..... مجھے ہر طرح کے پھول بکے میں اچھے لگتے ہیں۔''

وہ کہا کرتی تھی۔ آج اُس کی قبر کے اردگرد چار پھولوں والے بکے تھے۔ کچھ مرجھائے، کچھ تازہ، کچھ خوشبو دیتے، کچھ ماتم کرتے۔

''میں نے سُنا ہے پاکستانی شادیوں میں سُرخ رنگ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر نہیں خریدا کچھ بھی سرخ رنگ کا۔ پتا ہے کیوں؟ کیوں میں یہ آپ کے لیے پہننا چاہتی ہوں۔''

آواز قریب سے آ رہی تھی۔ شاید مٹی کے نیچے سے۔

''کامدار لہنگا، زری والا جس میں گہری گہری کلیاں ہوں گی۔ گھونگھٹ لوں گی، سینے تک، کسی کو آپ سے پہلے شکل نہیں دکھاؤں گی۔ یا نگ منی کو بھی نہیں..... سرخ لپ سٹک لگاؤں گی، کاجل لگاؤں گی..... اپنے ہاتھ پہ آپ کا نام لکھواؤں گی جسے آپ ڈھونڈیں گے۔''

ہاتھوں کی لکیروں میں جس کا نام ہی نہیں تھا، وہ کیسے ڈھونڈ سکتا تھا؟

''میں آپ کے لیے بھرپور اہتمام کروں گی۔ جشن سے آپ کا استقبال کروں گی۔''

اس نے اہتمام ہی تو کیا تھا۔ اپنے لیے۔ اپنی ذات کی مٹی کھود کر۔ اس میں شاہ کو دفنا دیا تھا۔ اُس نے محبت ہی تو کی تھی۔ بے لوث محبت، ان دیکھی، ان چھوئی محبت۔

☆.....☆.....☆

''تم یو ایس شفٹ ہو رہے ہو؟'' طاہرہ بیگم اُسے بیگ میں سامان ڈالتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ وہ چپ تھا۔ وہ کئی دنوں سے چپ تھا پھر کل ہی سب کو معلوم پڑا کہ وہ یو ایس جا رہا ہے۔ زید کو لے کر۔ وہ اب وہیں رہنا چاہتا تھا۔ پاکستان میں سوائے یا نگ شی کی قبر اور تلخ یادوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

''تم اپنی ماں کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' انھوں نے اسے بازو سے پکڑا۔ وہ جھک کر بیگ کی زپ بند کر رہا تھا۔ جب وہ بیگ ایک طرف رکھ کے سیدھا ہوا تو اس نے بازو چھڑا لیا۔

''کیا تم اپنی ماں کو معاف نہیں کرو گے؟'' انھوں نے کرب سے پوچھا۔ وہ بدستور خاموش رہا۔ سامنے صوفے پر زید اور حمنہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ زید گیم کھیل رہا تھا۔ حمنہ خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

شاہجہاں نے جھک کے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک فائل نکالی اور قدم قدم چل کر حمنہ کے پاس آیا۔

''یہ لو۔''

اُس نے چونکتے ہوئے فائل پکڑی۔ ''یہ کیا ہے؟''

''طلاق کے پیپرز ہیں۔'' سادگی سے کہتا وہ زید کی طرف مڑا۔ حمنہ نے بے ساختہ ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی۔

''چیمپ۔ بیگ گاڑی میں رکھ دیے؟''

''یس ڈیڈ۔'' وہ فون سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔ حمنہ فائل کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر دھچکا تھا۔ طاہرہ بیگم کی آنکھیں چکرائی ہوئی تھیں۔ شاہجہاں پلٹ کے بیگ کی طرف آیا تو طاہرہ بیگم نے بازو سے پکڑ لیا۔

''تم حمنہ کو طلاق دے رہے ہو؟''

''زبردستی کی شادیوں میں طلاق ہی ہوتی ہے امی۔'' اس نے سفاکی سے کہا اور بازو چھڑا لیا۔

حمنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ کاغذ جسے وہ چار سال سے پاگلوں کی طرح حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اب جب کہ وہ اس کے ہاتھ میں تھے، کس قدر بھاری تھے۔ اسے محسوس ہوا وہ نہیں اٹھا سکے گی۔

''زید چھٹیوں میں تم سے ملنے آتا رہے گا۔ تم بھی آسکتی ہو۔'' دونوں بیگ ہینڈل سے تھام کر باہر لے جاتے ہوئے اُس نے کہا۔ ملازم دروازے پر کھڑا تھا۔ ''یہ لو۔ بیگ گاڑی میں رکھ دو۔''

ملازم بیگ پکڑ کر چلا گیا۔

''کم آن چیمپ۔ وی آر گیٹنگ لیٹ۔'' اس نے بیڈ سے کوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''او کے ڈیڈ۔'' زید نے فون بند کیا اور لپک کر اُتر گیا۔

''زید رُکو۔'' حمنہ نے پیپر پھینکے اور تیزی سے اُس کے پیچھے لپکی۔ کمرے کے وسط میں

رُک کر اُس نے زید کو سینے میں بھینچ لیا۔ شاہجہاں بازو پہ کوٹ ڈالے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''Mama love you,you know that na? مجھے کال کرنی ہے۔ ہر روز بات کرو گے۔ ٹھیک ہے؟'' وہ پیچھے ہو کر، اس کے ہاتھ تھامے وعدہ لے رہی تھی۔ زید نے باپ کو دیکھا پھر شانے اُچکا دیے۔

''او کے۔''

حمنہ نے باری باری اُس کے گال چومے اور اسے ایک بار پھر بھینچ لیا۔ کچھ دیر اسے لگائے رکھا پھر چھوڑ دیا۔ وہ دوڑ کر باہر نکل گیا۔

''تم بھی اپنی ماں کو گلے لگا لو۔'' طاہرہ بیگم نے تڑپ کے کہا۔ شاہجہاں نے رُک کے دیکھا پھر قدرے آگے آیا اور اُنھیں گلے لگا لیا۔ وہ رو پڑیں۔ بے شک انھوں نے اسے تباہ کیا تھا مگر وہ ماں سے بدتمیزی کا مرتکب کبھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ حمنہ فاصلے پر کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی اور آج اُسے شاہجہان پہ ویسا ہی پیار آ رہا تھا جیسے کبھی آیا کرتا تھا۔

''خدا حافظ۔'' اُس نے ماں کو ہٹانے کے بعد کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا لیے۔

گاڑی جب ائیر پورٹ کی طرف چل پڑی تو اُس نے سوچا، کہ کون لٹا؟

میں.....غزارا.....ثمن یا پھر یانگ ہو.....کون زیادہ تباہ ہوا؟

بلاشبہ وہی تباہ ہوئی تھی لیکن دل میں کہیں اندر، وہ بھی تباہ ہوا تھا۔ اب جب کہ وہ نہیں تھی، وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ اب ساری عمر صرف سانس لینے والا تھا۔ صرف سانس!

ختم شد.....